امرتسر کی یادیں

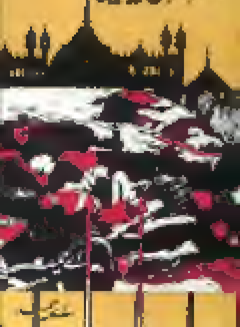

امرتسر کی یادیں

اے حمید

مکتبہ عالیہ لاہور

"امبرسریوں"

کے نام

حقوقِ اشاعت محفوظ

۱۹۹۱ء

امرتسر کی یادیں

اے حمید

ناشر : محمد جمیل النبسی
طابع : ایف۔ڈی پرنٹرز، لاہور
سرِورق : طاہر رشید

قیمت
-/۲۰۰

یکے از مطبوعات :

مکتبہ عالیہ — آفس : ایبک روڈ (انارکلی) — شوروم : اردو بازار — لاہور

فہرست

۱۔ چند یادیں - چند باتیں ۱۳
۲۔ اُمرتسر میں فساد کا پہلا شعلہ ۲۷
۳۔ آگ اور خون کے گلاب ۴۷
۴۔ اُمرتسر میں ۱۴؍اگست ۵۶
۵۔ اُمرتسر کا جلیانوالہ باغ ۶۷
۶۔ اُمرتسر کا کمپنی باغ ۸۸
۷۔ اُمرتسر کی ایک گلی ۱۰۸
۸۔ اُمرتسر کی مسجدیں ۱۱۶
۹۔ اُمرتسر کا رمضان المبارک ۱۲۹
۱۰۔ اُمرتسر کی عید ۱۴۱
۱۱۔ اُمرتسر کی ایک درگاہ ۱۵۵
۱۲۔ اُمرتسر اور سیب کا درخت ۱۶۹
۱۳۔ اُمرتسر کی ایک ہولناک رات ۱۸۶
۱۴۔ اُمرتسر کے دانشور ۲۰۲
۱۵۔ اُمرتسر کا ماسٹر تارا ۲۱۰

۱۶۔ اَمرتسر کی میاں پوتڑو	۲۱۹
۱۷۔ اَمرتسر کا ایک درویش	۲۲۹
۱۸۔ اَمرتسر کا اسدجو	۲۳۸
۱۹۔ اَمرتسر کا ایک گیٹ کیپر	۲۴۶
۲۰۔ اَمرتسر کا ایک جواری	۲۵۷
۲۱۔ اَمرتسر کا پروفیسر ٹُنڈی	۲۶۵
۲۲۔ اَمرتسر کے جن اور بھوت	۲۸۰
۲۳۔ تُو کبھی ہاتی بیک نہیں ہوتا	۲۸۹
۲۴۔ الوداع مسجد کے مینارو	۲۹۳
۲۵۔ اَمرتسر کی آخری جھلک	۲۹۷

بخدمت شریف جناب اے حمید صاحب

فون: [illegible]

انجمنِ ترقیِ اُردُو ○ لاہور

دفتر اول: [illegible]

۱۰۔ اردو بازار [illegible]
لاہور

حوالہ نمبر ______ ۱۶/۵/۷۹ تاریخ ______

پیارے مخلص عزیز دوست اے حمید!

امرتسر کی مسجدوں پر پیارا مضمون لکھنے والے حمید کو میرا سلام پہنچے۔

کتنی پیاری سی تصویر کھینچی ہے آپ نے امرتسر کی (قبل از پاکستان کی) معاشرت کی۔ یہ سکھوں کا اور انگریزوں کا دور تھا کس قدر آباد تھیں قرطبہ کی بیٹیاں، کتنے اچھے امام صاحب اور ان کے بیٹے جو آپ کے دوست تھے۔ قرطبہ کے حوالے نے تاریخ کے دریچے کھول دیے جن سے اس ملک کے مستقبل پر دھندلی روشنی سے ذرے ذرے کچھ چمکتے ہوئے کچھ بجھتے ہوئے

نظر آئے ۔ اشاریت نے چہرے جیتی روشن کر دیئے۔
پرانا حمید پھر جاگ اٹھا ہے مگر معلوم نہیں اب
قلم بھی جاگتا رہے گا یا نہیں ۔ کاش ایسی
شاہکار تحریریں دو تین اور لکھ ڈالے ۔
شاید میرا جذبۂ دل میرا پیغام آپ
تک پہنچا دے ۔

فقط

سید ع...

اے حمید کے نام ۔ بنگلہ دیش کے ایک پاکستانی کا خط

کھلنا
بنگلہ دیش
۲۰ اپریل ۹۰

ماہِ بہار مبارک

عالی احترام بزرگ   السلام علیکم

امید کہ مزاج بخیر ہوگا!

آپ امرتسر کے مہاجر ہیں ۔ میرے دادا جان بھی امرتسر کے تھے ۔ شریف پورہ میں رہتے تھے ۔ بس اتنا جانتا ہوں ۔ آپ کے مضامین امرتسر سے متعلق جو آتے ہیں پڑھتا ہوں ۔ وہ بھی کبھی کبھار ۔ آپ سے گزارش ہے کہ امرتسر پر کوئی کتاب ہو تو اس کی قیمت اور ڈاک خرچ تحریر کریں ۔ میں پاکستانی کرنسی میں مطلوبہ رقم ارسال کروں گا ۔

حالیہ "چند پاک ادب" نمبر میں آپ کا افسانہ "پرانے باغ کا راستہ" نظر نواز ہوا ۔ خوبصورت افسانہ ہے ۔ مبارکباد قبول فرمائیں ۔

میں آپ کو امرتسر یا جوش سے پاکستان کے نام پر قسم دیتا ہوں کہ آپ میرے خط کا جواب دیں گے ۔ ہمیں پاکستان سے جو محبت رہنے والوں سے جو محبت ہے ۔ وہ ناقابل بیان ہے ۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچائے ۔ پاکستان کے (مغربی پاکستان) علاقے یا نہ بچا ۔ مگر وہ آباد رہے ۔ خوش رہے ۔ [illegible] سبز ہلالی پرچم ہمیشہ لہراتا رہے ۔ پاکستان کی وحدت اور سالمیت برقرار رہے ۔

جواب کے لئے انتظار کروں گا ۔

نور الہدیٰ

MOHAMMED NOORUL HODA
QTR NO. S-59
HOUSING ESTATE
P.O. KHALISHPUR
DISTT KHULNA 9000

امرتسر

کی یادیں

اے حمید

چند یادیں۔ چند باتیں

دروازہ مہان سنگھ سے باہر نکلیں تو سیدھی سڑک آرٹ سکول کے پہلو سے گزرتی، دائیں جانب بوڑی شاہ کے تکیے کو اور بائیں طرف ہاتھی گراؤنڈ کو پیچھے چھوڑتی سامنے تحصیل پورے کی طرف نکل جاتی ہے تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتے ہی دو طرفہ لوکاٹ کے گہرے سبز چھاؤں والے باغوں کے بیچوں بیچ ایک تنگ سا کچا راستہ جالندھر بٹالہ ریلوے لائن کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کچے راستے پر کھٹے کے پودوں نے چھت بنا رکھی تھی۔ مارچ، اپریل کے دنوں میں جب کھٹے کے جھاڑوں میں سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ مہک جاتا۔ میں باغ کی سیر کو جاتے یہاں سے لمبے لمبے سانس لیتا، آہستہ آہستہ گزرا کرتا تھا اور سفید پھولوں کو ــــ لیکن یہ میں کہاں نکل آیا! کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو مجھے ایک پل میں کہاں سے کہاں لے کر نکل گئی۔ میں واپس دروازہ مہان سنگھ میں آتا ہوں۔

دروازہ مہان سنگھ ہمارے محلے کا دروازہ تھا۔ اُن دنوں مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ بھید ہندو مسلم فسادات کے بعد کھلا۔ اس دروازے سے باہر نکل کر آپ دائیں طرف سڑک گھوم جاتی ہے۔ ایک طرف شیشم کے سایہ دار درختوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے اور دوسری طرف گلاب، ڈیلیا اور چنبیلی کے پھولوں سے مہکتا باغ سڑک کے ساتھ ساتھ دروازہ گھی منڈی تک چلا گیا ہے۔ اس باغ میں یوکلپٹس کے ذرا چھریرے درخت ہوا کرتے تھے جن کی لمبوتری پتوں والی ٹہنیاں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوا میں جھوما کرتی تھیں۔

۱۴ اگست کی خون آلود۔ دھواں دھواں، دہشت زدہ دوپہر کو جب ہم افراتفری کے عالم میں دروازہ مہان سنگھ سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کی طرف بھاگے تو گوردا سپور ریلوے لائن کے پار مقبول پورے کی مسلم بستی سے اٹھتے دھوئیں کے بادلوں میں آگ کی سرخ زبانیں لپک رہی

تھیں اور اس باغ کے نوعمر یوکلپٹس کے درختوں کی لمبی نازک ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ساکت وجامد تھیں جیسے وہ پتھر ہو گئی ہوں۔

قیام پاکستان کے پانچ سال بعد جب میں امرتسر گیا تو ان درختوں نے مجھے دور سے آتا دیکھ کر اپنی شاخیں ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ مجھے اپنی بے زبانی میں خاموش آوازیں۔ اپنی سوندھی خوشبو کی آواز میں میرا نام لے لے کر پکارا ——— اور جب میں ان کے پاس گیا تو وہ چپ ہو گئے۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ درخت کی ایک ٹہنی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ ہم دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے یہ محبت کی تال تھی۔ ہمہ گیر، ہمہ از دوست، ہمہ تن گوش، کبھی نہ بھلائی جانیوالی، کبھی نہ چڑھنے والی کبھی نہ یاد آنے والی محبت کی تال ——— کبھی نہ چڑھنے والی، کبھی نہ اترنے والی شراب کا نشہ کبھی نہ طلوع ہونے والے، کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کی روشنی! میں اور درخت کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے۔ اس نے کہا۔

”تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے؟“

میں نے کہا۔

”سبھی چلے گئے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں! امرتسر تو مسلمانوں کے لیے جہنم بنا دیا گیا تھا اور مسلمان جہنم میں نہیں رہا کرتا۔ لاہور کے چیرنگ کراس اور سمن آباد میں کچھ یوکلپٹس کے درخت ہیں۔ میں اُن سے تمہارا حال پوچھ لیا کرتا ہوں۔ ویسے بھی صبح دم جب سمن آباد کی مسجدیں اذان کی صداؤں سے گونجتی ہیں اور نیم روشن صحن میں ٹمٹماتے تاروں بھرے آسمان تلے اگر گہرے سانس لیتا ہوں تو مجھے تمہاری خوشبو آیا کرتی ہے۔ تمہارے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دیا کرتی ہیں۔“

یوکلپٹس کی ٹہنیاں خوشی سے لہرانے لگیں اور ------

معاف کیجئے گا میں پھر اپنے موضوع سے ہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ سلسلہ تو موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہاں ——— تو میں کہہ رہا تھا کہ جہاں یہ باغ ختم ہوتا ہے وہاں اکالی سکھوں یعنی نہنگوں کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے

بُنج شُپولا سنگھ کہتے ہیں۔ سکندر حیات کی وزارت میں سکھوں نے اپنے گردوارے کے پاس اس کی تعمیر شروع کی تو امرتسر کے مسلمانوں نے حکومتِ پنجاب سے شدید احتجاج کیا۔ جلسے ہوئے سر سکندر کے پاس مسلمانوں کے وفد گئے لیکن کچھ نہ بنا اور قلعے کی تعمیر شروع رہی۔ قلعہ بن گیا۔ اس قلعے کے سوراخوں سے گھی منڈی اور مہاں سنگھ دروازے کے مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ہمارے محلے کا جوان چیرا تال والا انہی سکھوں کی گولی لگنے سے شہید ہوا۔

اس قلعے کے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ سڑک نیچے کو اترتی ہے۔ کونے پر ایک مسجد ہے کنواں اور اکھاڑہ ہے۔ ذرا آگے جا کر بسلی آ جاتی ہے اور پھر قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ جس درگاہ کے بارے میں میں لکھنے والا ہوں وہ اسی قبرستان میں واقع تھی۔ ہم سب نے ایسی بہت سی درگاہیں دیکھی ہوں گی جو صدیوں سے آباد ہیں اور جن کی رونقوں اور جگمگاہٹوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے لیکن امرتسر کے قبرستان والی یہ پہلی درگاہ تھی جو میری آنکھوں کے سامنے عالم وجود میں آئی۔ برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنی، اس کی فضائیں بیدم وارثی کے عارفانہ کلام سے گونجیں، وہاں دودھ کی نہریں بہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ اُجڑ گئی۔ لوگ اس کے برقی قمقمے اور ٹونٹیاں اُتار کر لے گئے اور دودھ کی نہروں میں مکڑیوں نے جالے تن لیے۔ یہ درگاہ امرتسر کی ہماری کشمیری برادری کے ایک قریبی عزیز خواجہ صاحب نے اپنے نانا کی قبر پر بنائی تھی۔ میں ان دنوں ایم اے او ہائی سکول میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب کے پاس اچانک کہیں سے دولت آگئی انہوں نے فوراً قبرستان میں اپنے نانا کی قبر پر (جیسا کہ والدہ مرحومہ اور خالہ جان ہمیں بتایا کرتی تھیں) ایک عظیم الشان درگاہ کی بنیاد رکھ دی۔ درگاہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ دور دراز سے کاریگر معماروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ میرے خالہ زاد بھائی رشید لالے نے وہاں بجلی کی ساری فٹنگ خود کی۔ میں آج بھی چشم تصور میں انہیں پیچ کس دانتوں میں دبائے سیڑھی پر جھک کر تاروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا دیکھ رہا ہوں۔ درگاہ کے گنبد کے اندر جو روشنیاں لگیں وہ سبز انگوروں کے گچھوں کی شکل میں لٹک رہی تھیں۔ آگرہ، دلی اور لکھنؤ سے نہایت قیمتی اور حسین جھاڑ فانوس منگوا کر اندر لٹکائے گئے گنبد کے اندر تین قبروں کے تعویذ تھے۔ ایک خواجہ صاحب کے نانا کی قبر کا تعویذ تھا۔ دوسرا غالباً ان کی نانی صاحبہ کی قبر کا تعویذ تھا اور تیسرا تعویذ ان کی اپنی قبر کا تھا جو تعویذ کے نیچے تہہ خانے

میں کھلی پڑی تھی۔ انھوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ مرنے کے بعد انھیں وہیں تہہ خانے میں دفن کیا جائے۔ ایک دفعہ میں تہہ خانے میں اُتر گیا۔ چھوٹا سا لحد نما تہہ خانہ تھا۔ چھت اور دیواروں پر سیمنٹ کیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ چکنی برکتوں والے دودھیا غبارہ نما بلب لگے تھے۔ وہاں مرنے کے بعد خواجہ صاحب کی قبر تعمیر ہونی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں امرتسر کا یہ قبرستان بڑا خوبصورت تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لاہور میں مسلمانوں کے ننگے قبرستانوں پر گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ پڑتی ہے اور سردیوں میں کہرا گرتا ہے جبکہ لاہور میں عیسائیوں کے قبرستانوں میں سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں اور قبروں کے کتبے پھولوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ امرتسر کا ہمارے محلے کے باہر والا قبرستان لاہور کے گورا قبرستان سے بھی زیادہ شاداب اور پُرسکون تھا۔ دراصل یہ قبرستان آم، لوکاٹ اور امرود کے باغوں کے بیچ میں آکر بن گیا تھا۔ یہاں کوئی قبر ایسی نہ تھی جس پر کسی نہ کسی درخت کا سایہ نہ ہو اور پہلو میں گلاب یا گیندے کے پھول نہ کھلے ہوں۔ ہم رات کو بھی قبرستان میں بے دھڑک چلے جاتے۔ ہمیں کبھی کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ ہوتی، بلکہ یوں لگتا کہ واقعی ان قبروں کے اندر بڑے ہی نیک لوگ محوِ خواب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بچے ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی چھوٹی سے چھوٹی قبر پر بھی پاؤں نہ رکھا تھا۔ یہاں پھلدار باغوں میں نہر کے مٹیالے ٹھنڈے پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے بہتے تھے برسات میں ان نالوں میں درختوں سے ٹپکے ہوئے آم اور امرود بہا کرتے جنھیں ہم وہیں کسی پُلیا پر بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے۔ برسات میں گھنگھور گھٹائیں برستیں اور ہم یہاں امرود کے درختوں پر چڑھے ادھر اُدھر پاؤں پھیلائے امرود توڑ توڑ کر نیکر کی جیبیں بھرا کرتے۔

عید کی صبح کو منہ اندھیرے لوگ قبرستان جاکر فاتحہ اور قرآن خوانی کرتے۔ میں بھی اپنے چھوٹے آرٹسٹ بھائی کے ساتھ ضرور جاتا۔ ہم لوگ گھی منڈی والے دروازے سے نکل کر کرکنے والی مسجد کے پاس پہنچتے تو ہمیں پکے گلاب کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی۔ سڑک کنارے گلاب کے پھول بیچنے والے بیٹھے ہوتے۔ بڑی بڑی چنگیریں سُرخ گلابوں اور ان کی پتیوں سے بھری ہوتیں۔ دو پیسے کے پھول لے کر رومال میں باندھ لیتے اور گرم کشمیری شالوں میں دبکے ٹھٹھرتی سردی میں قبرستان میں داخل ہو جاتے ان دنوں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ ہمارے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور بات کرتے وقت منہ سے بھاپ نکلا کرتی۔ اوپر نیلے آسمان پر طلوعِ آفتاب سے پہلے کی روشنی میں ٹمٹماتے تارے زرد ہو رہے

ہوتے تھے۔ چھوٹی سی سڑک کے دونوں جانب خانہ بدوش قسم کے فقیر جھولیاں پھیلائے بیٹھے اپنی اپنی بولیوں میں خیرات مانگ رہے ہوتے۔ ان کے پیچھے امرودوں اور اناروں کے باغوں میں گھُپ اندھیرا چھایا ہوتا۔ اب اِدھر اُدھر سے دھیمی اثر انگیز آواز میں قرآن شریف کی تلاوت کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر مٹی کے دیئے اور موم بتیاں جلا رہے ہوتے۔ پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ کہیں کہیں اُن کے اُداس چہرے چراغوں کی پھڑپھڑاتی روشنی میں اُبھرتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ مئی جون کی تپتی سنسان دوپہروں میں یہاں سے گزرتے ہوئے گلاب کے پھولوں اور کیکر کے پیلے پھولوں کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ ذرا پرے ایک نہر بہتی تھی۔ اُدھر سے جو ہوا آتی اس میں بھنگ کی جھاڑیوں کی مرطوب بُو ہوتی۔

اس قبرستان کا جو حصہ جالندھر کی طرف جاتی جی ٹی روڈ کو لگتا تھا اُدھر یہ درگاہ تھی۔ اس درگاہ تھی۔ اس درگاہ پر پہلا عرس ہوا تو امرتسر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر قدِ آدم اشتہار چسپاں ہو گئے۔ ان اشتہاروں پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا: "امرتسر میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔" اس کے بعد درگاہ کے بارے میں تفصیل درج تھی اور اس بات کا اعلان تھا کہ عرس شریف تین روز تک جاری رہے گا۔ پہلے روز کی محفلِ سماع کی صدارت حضرت بیدم وارثی فرمائیں گے۔ دکانداروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ میلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں آکر اپنی اپنی دکانیں سنبھال لیں۔ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتانا پڑے۔ قوالوں تا باقوال اینڈ پارٹی کے علاوہ محمد علی فریدی قوال کا نام بھی درج تھا۔ میرے خالو جان مرحوم یہ اشتہار جھولے میں ڈال کر ہمارے گھر لائے اور سب کو پورے کا پورا پڑھ کر سنایا۔ پھر بولے۔

"میں اس درگاہ کے عرس کے خلاف ہوں یہ سب جھوٹ کا کھیل ہے۔"

خالو جان ساٹھ پینسٹھ برس کے دیوقامت، بھاری بھرکم اونچے لمبے بزرگ تھے۔ لمبی ڈاڑھی کھلتا گندمی رنگ، لمبا کھدر کا کُرتہ۔ کھدر کی دھوتی، لال چمڑے کی جوتی، ہاتھ میں موٹا عصا۔ بازار بکرواناں کی روڑاں والی مسجد کے پیش امام تھے۔ تحریکِ خلافت میں میری والدہ سمیت اپنے سب گھر والوں کو لے کر کابل چلے گئے جہاں سے انتہائی کس مپرسی کے عالم میں واپس امرتسر آئے۔ کابل میں مہاجر مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا کرتے۔ انہیں ایک بات کی بڑی خوشی تھی کہ انہیں کابل میں شہنشاہ بابر کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ بابر کے سنگِ مزار پر لکھی ہوئی فارسی رباعی

بڑے جوش و خروش سے پڑھ کر سنایا کرتے۔ کشمیری بزرگوں کی طرح ڈٹ کر کھاتے۔ میلوں پیدل چلتے۔ جمعے کے جمعے ہر عزیز اور رشتے دار کے گھر خیر خیریت معلوم کرنے جاتے۔ ڈیوڑھی میں ذرا کھنکار کر گھر کے کسی فرد کا نام لے کر پکارتے۔ جن دنوں میں فلیمنگ روڈ پر رہا کرتا تھا خالو جان کی پاٹ دار آواز ہر جمعے کی صبح کو مکان کی ڈیوڑھی میں گونجتی۔

"بابو عبدالحمید ——!"

خالو جان کی سب سے بڑی خصوصیت میرے نزدیک یہ تھی کہ ان میں ظرافت کی حس بڑی تیز تھی۔ بڑے لطیفے سناتے۔ بات کو خوب مرچ مسالہ لگا کر پیش کرتے۔ ذرا سی بات پر خوب کھل کھلا کر بچوں کی طرح ہنستے۔ ایک روز میں خالہ کے ہاں گیا ہوا تھا۔ ہم نو عمر لڑکوں کو ایک جگہ اکٹھے دیکھ کر ہمارے پاس آ گئے اور عصا دیوار سے لگا کر تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"لو بھئی آج تمہیں عبدالرحمان جن کا قصہ سناتا ہوں۔" وہ مجھے خود بھی کبھی کبھی جن لگتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، بھاری جسم، رعب دار آواز اور قدیم یونانی فلاسفروں ایسا بھرپور چہرہ —— لیکن اس روز انہوں نے ہمیں جس جن کے بارے میں سنایا وہ ان کی مسجد کے حجرے میں رہتا تھا۔ کہنے لگے

"لو بھئی دوستو! کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز میں نے ان بچوں کو جو میرے پاس قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں کہا کہ میرا بدن دابو۔ میں پہلو بدل کر لیٹ گیا اور سارے بچے میرے بدن پر ہلکی ہلکی مکیاں مارنے لگے۔ مجھے کچھ ایسا مزہ آیا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سارے بچے جا چکے تھے صرف عبدالرحمان نامی لڑکا میری پنڈلیوں پر مکیاں مار رہا تھا۔ حجرے میں کافی پرے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے عبدالرحمان سے کہا کہ بیٹا دیا گل کر دو اور تم بھی جا کر آرام کرو۔ عبدالرحمان نے وہیں بیٹھے بیٹھے پھونک مار کر دیا بجھا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں وہیں اٹھ کر فوراً عبدالرحمان کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔ سچ بتا تو کون ہے؟ عبدالرحمان گھبرا گیا۔ جب میں نے کلائی نہ چھوڑی تو بولا۔ میں عبدالرحمان جن ہوں۔ لو بھئی دوستو! اب وہ جن میرا یار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری انار لا کر کھلاتا ہے۔ بس چٹکی بجاتے ہی سرخ قندھاری انار اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"

درگاہ کے بارے میں بھی خالو جان نے میرے والد صاحب کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا۔

"مجھے عبدالرحمان جن نے سب کچھ بتا دیا ہے عبدالعزیز! خواجہ نے وہاں درگاہ کی عمارت تعمیر کر کے اچھا کام نہیں کیا۔ عمارت کے نیچے کئی نیک آدمیوں کی قبریں آ گئی ہیں۔ ہمیں شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

لیکن درگاہ کے پہلے عرس میں خالو جان پیش پیش تھے۔ درگاہ کے پچھواڑے اپنی نگرانی میں زردے بریانی کی دیگیں دم کروا رہے تھے۔ بھتی نائی کو کام کرتے ہوئے بار بار ٹوکتے۔

"زردے میں سنگترے کے ترنج ڈال دیجئے!"

"بھتی! چولہے کی آگ تیز لگتی ہے مجھے...."

"بریانی تیار ہو گئی ہو تو ایک بُرکی چکھانا مجھے...."

پہلے عرس پر درگاہ کے اندر باہر بڑی رونق تھی۔ شہر سے زیادہ تر لوگ دودھ کی نہروں کا سن کر آئے تھے۔ دودھ کی نہر درگاہ میں ایسے چلائی گئی تھی کہ سیمنٹ کے پختہ ایک لمبوترے ٹینک کو کچے دودھ کی لسی سے بھر دیا گیا۔ تانبے کا ایک پائپ گنبد کے گرداگرد چاروں طرف لگا تھا جس میں ٹونٹیاں تھیں۔ لوگ ٹونٹی کھول کر گلاس، پیالے اور ڈول بھر بھر کر دودھ کی لسی پیتے اور حیران ہوتے کہ واقعی خواجہ صاحب نے دودھ کی نہریں چلا دیں۔ درگاہ کے سامنے سرسوں کے کٹے ہوئے کھیتوں میں تمبو قناتیں لگا کر لوگوں نے دکانیں کھول رکھی تھیں۔ قتلے تلے جا رہے تھے۔ جھولے لگے تھے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل گرج رہی تھی۔ درگاہ رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی تھی۔ شہر کے علاوہ دیہات سے بھی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان دعا مانگ رہے تھے۔ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ جالیوں میں اٹیاں باندھ کر منتیں مانگ رہے تھے۔ میں نے ایک جالی کی ٹھنڈی آنکھ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تینوں قبروں پر پھولوں کے ڈھیر لگے تھے۔ اس قبر پر بھی جس کی لحد میں ابھی خواجہ صاحب دفن نہیں ہوئے تھے۔ لوگ ان کی خالی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ہماری امرتسر کی ساری کشمیری برادری، سارے رشتے دار عرس پر جمع تھے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کسی نے بھی درگاہ کے تقدس کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مقبرے میں کون دفن ہے۔ چنانچہ اپنے رشتے داروں میں میں نے کسی کو مقبرے کی جالیوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتے نہیں دیکھا۔ ہاں بھنڈارا کھانے میں وہ سب سے آگے تھے۔ پلاؤ سے لبالب بھرے ہوئے

قالینوں پر وہ چُن چُن کر توت کی بوٹیاں رکھوا رہے تھے۔ پھولدار قناتوں کے پاس دریوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے وہ جن بھوتوں کی طرح خود بھی کھا رہے تھے اور اپنے بال بچوں کو بھی مار مار کر کھلا رہے تھے۔ رات کو گیس کے ہنڈوں کی تیز روشنی میں قوالی شروع ہوئی تو ہمارے ایک رشتے دار کو حال آگیا۔ وہ لوگوں کو ٹکریں مارنے لگا۔ کسی کے قابو میں ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے چھ آدمیوں نے پکڑ کر اُسے رسیوں سے باندھا اور گھر چھوڑ کر آئے۔ اگلی صبح اُس کی رسیاں کھولی گئیں تو وہ پھر حال کھیلنے لگا۔

قوالی کی انہی محفلوں میں، میں نے پہلی بار مشہور شاعر حضرت بیدَم وارثی کو دیکھا۔ پُرسکون دبلا چہرہ، ملائم چمک والی آنکھیں، زرد رنگ کی چادر اوڑھے اگلی قطار میں خاموش بیٹھے تھے۔ قوال اُن ہی کا عارفانہ کلام گا رہے تھے۔ محمد علی فریدی قوال اُن دنوں جوبن پر تھے۔ درگاہ کے کونے کونے میں اُن کی پُرسوز آواز گونج رہی تھی۔ میں اپنے خاندان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ تمبوؤں کے پیچھے اُس حصے میں بیٹھا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ دری کے نیچے تازہ بنا ہوا اینٹوں کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ قوالی میں میرا بالکل جی نہ لگا۔ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مقبرے کے گنبد کے پاس آگیا۔ یہاں دالان کے کونوں کھدروں میں لوگ کمبل اوڑھے سو رہے تھے۔ گنبد کے اندر جھاڑ فانوس روشن تھے۔ بے شمار اگربتیاں سُلگ رہی تھیں جن کی بھاری خوشبو سے ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ درگاہ کے اپنے چڑیا گھر سے موروں کے کُوکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت مقبرے کی جالی سے مُنہ لگائے، آنکھیں بند کیے کچھ بڑبڑا رہی تھی اُس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دالان کے مغربی حصے میں سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، متولی، خزانچی اور سیکرٹری سجادہ نشین کے کمرے تھے جن کے باہر اُردو میں اُن کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں گھومتے گھامتے اُدھر کو نکل گئے۔ ہم نے جالیوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ خواجہ صاحب گاؤ تکیے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ بلب کی روشنی میں، بڑی بڑی مونچھوں والا اُن کا سُرخ و سپید بارعب چہرہ چمک رہا تھا۔ کچھ لوگ بڑے ادب سے اُن کے سامنے بیٹھے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے کی جالیوں سے اندر جھانکا تو ایک پھولی ہوئی توند والا موٹا تازہ آدمی گرم کشمیری شال کی بکل مارے قالین پر اکیلا آلتی پالتی مارے بیٹھا زردہ ٹھونس رہا تھا۔ ہم یہاں سے نکل کر درگاہ کے پچھواڑے چڑیا گھر کی طرف آ گئے۔ دس بارہ مربع زمین کے گرد باڑھ لگا کر اندر مختلف جانوروں

میں مور، تیتر، طوطے، کبوتر اور تین چار ہرن چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہاں بھی اوپر وسط میں ایک بڑا سا بلب روشن تھا۔ روشنی میں جانور کچھ بے چین سے دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں جنگلے کے پاس آتا دیکھ کر ہرن آہستہ آہستہ چلتے ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی بڑی بڑی چمکتی آنکھیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ہم بڑی دیر تک اُن سے کھیلتے رہے۔ قوالی کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اچانک پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے امرود کے جھکے ہوئے درختوں کے گھیرے سایوں میں قبریں ہی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ڈر گئے اور وہاں سے بھاگ کر دالان کی رونق اور روشنیوں میں آ گئے۔

رات ۲ بجے کے بعد محفلِ سماع ختم ہوئی۔ خالو جان اپنا عصا لے کر ہمارے خاندان کی عورتوں اور بچوں کی ٹولی پیچھے لگائے گھر کی طرف چل پڑے۔ سارا راستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ مجھے بڑا ڈر آ رہا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لگا چل رہا تھا اور دل کو اس خیال سے طاقت دے رہا تھا کہ خالو جان ساتھ ہیں اور جن بھوت چڑیلیں اُن کی مطیع ہیں۔ درختوں پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا کسی وقت کوئی اُلّو بولنے لگتا اور فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہو جاتی۔ عورتیں اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کر کے اپنے خوف کو دُور کر رہی تھیں۔ لمبے تڑنگے خالو جان موٹا عصا زمین پر بار بار مارتے۔ بار بار کھنکارتے کوئی بیس قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ کسی وقت بلند آواز سے وہ کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ خدا خدا کر کے قبرستان کا رستہ ختم ہوا اور ہم دروازہ گمی منڈی سے نکل کر بازار کبرداس میں آ گئے

اگلے روز خالو جان نے ایک من گھڑت کہانی مشہور کر دی۔ کہنے لگے۔

• رات اگر میں تم لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ تم لوگوں کو قبرستان سے لے کر گزر رہا تھا کہ کھائی کے پاس پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چڑیل پُلیا پر بیٹھی ہے۔ اُس کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ پیر اُلٹے ہیں۔ دانت باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر جھٹ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا السلام علیکم پیر جی! یہاں پہنچ کر خالو جان باقاعدہ اُٹھ کر چڑیل کی نقل اُتارتے۔ ہاتھ اُٹھا کر، سر جھکا کر چہرے پر لجاجت بھری مسکراہٹ لا کر چڑیل کے سلام کرنے کا انداز بتاتے۔

« میں نے عصا اٹھا کر چڑیل سے کہا، او نامراد! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ تجھے خبر نہیں کہ پیچھے میرے بچے آ رہے ہیں، چل دفع ہو جا میری آنکھوں سے۔ اٹھ بھاگ!۔۔۔۔ اور چڑیل ہی ہی ہی ہی، سلام پیر جی سلام پیر جی! کہتی الٹے پاؤں بھاگ کر امرود کے درختوں میں غائب ہو گئی »

رشتے دار عورتوں نے سنا تو انہیں قبرستان والی رات یاد کر کے پسینے آ گئے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد میں دوپہر کے وقت بھی قبرستان جاتے گھبرانے لگا۔

عرس کے علاوہ بھی ہم دن میں اکثر کھیلنے اور پتنگ اڑانے درگاہ پر جایا کرتے تھے۔ باغوں میں گھس کر کچے پکے امرود توڑتے۔ کھیتوں میں جا کر مولیاں اکھاڑتے اور انہیں درگاہ کے حوض پر لا کر دھوتے اور نمک مرچ لگا کر کھاتے۔ میرے دادا جان سردیوں کی دوپہریں عام طور پر درگاہ پر ہی گزارتے۔ وہ مقبرے کے پاس فرش پر دری بچھا کر بیٹھ جاتے۔ روٹی کے بھورے کر کے چڑیوں کو ڈالتے۔ پانی سے لبالب بھرا ہوا کٹورہ پاس رکھ لیتے۔ چڑیاں وہاں آکر بڑی آزادی سے دانہ دنکا چگتیں اور کٹورے پر بیٹھ کر چونچ ڈبا ڈبا کر مزے سے پانی پیتیں۔ وہ دادا جان سے ذرا بھی نہ گھبراتیں۔ دادا جان بھی اُن سے بڑا پیار کرتے تھے۔ انہیں پانی پیتا دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کسی وقت اُن سے باتیں کرنے لگتے۔ ہم دونوں بھائی گڈی میں ڈور ڈلتے۔ جب ہماری گڈی یا پتنگ سرسوں کے کھیتوں کے اوپر نیلے آسمان کی ٹھنڈی ہواؤں میں لہرانے لگتی تو دادا جان ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اُسے دیکھتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

شاباش! ڈھیل مت دینا۔ ہوا تیز ہے ڈور کس کر رکھنا۔ میرا خیال ہے بائیں طرف کنی کھاتی ہے۔۔

درگاہ پر دو یا تین عرس ہی ہوئے تھے کہ اس کا زوال شروع ہو گیا۔ ایک روز میں سکول سے بستہ لے کر گھر میں داخل ہوا تو خالہ میری والدہ کے ساتھ راز داری میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے بستہ ایک طرف پھینکا۔ چنگیر میں سے روٹی نکالی۔ ہانڈی میں سے ایک آلو، ایک بوٹی نکال کر اس پر رکھی اور وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ خالہ جان اور والدہ محترمہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ درگاہ شریف والے خواجہ صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امرتسر سے اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی، مگر چونکہ والدہ فکر مند تھیں، اس لیے میں بھی فکر مند ہو گیا اور مجھے محسوس

ہوا کہ خواجہ صاحب کے ساتھ ضرور کوئی افسوس ناک حادثہ ہوا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے بہت جلد مل گیا کیونکہ درگاہ اُجڑنا شروع ہو گئی۔ چوکیداروں کو تنخواہ نہ ملی تو وہ درگاہ چھوڑ کر چلے گئے۔ خواجہ صاحب کے بڑے لڑکے خود پریشان تھے وہ درگاہ کی حفاظت پوری توجہ سے نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ حوض کی ٹونٹیاں اور دودھ کی نہروں والے تانبے کے پائپ اکھاڑ کر لے گئے۔ رشید لالہ اگر مقبرے میں سے جھاڑ فانوس اُتار کر خواجہ صاحب کے گھر نہ پہنچاتے تو لوگ وہ بھی اُتار کر لے جاتے۔ سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، قوالچی اور متولی کے جالی دار دروازے بھی راتوں رات چوری ہو گئے۔ چڑیا گھر کے کبوتر، طوطے اڑ گئے۔ موروں کو قبرستان کے جنگلی بلے کھا گئے، کیونکہ اب رات کو اُن کی چوکیداری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا ایک روز دونوں ہرن کھول کر گھر لے گیا، ورنہ اُن کا بچنا بھی محال تھا۔ میں کبھی کبھی اُن کے گھر جاتا تو وہاں دالان میں سناٹا چھایا ہوتا۔ دو منزلہ بڑا اونچا لمبا جالیدار دروازوں اور نیم روشن ٹھنڈے کمروں پرانے وکٹورین صوفوں اور مسہریوں، قدِ آدم آئینوں اور پرانی طرز کی روغنی تصویروں والا گھر تھا۔ کبھی وہاں کشمیری عورتوں اور لڑکیوں کی مسرور آوازیں گونجا کرتی تھیں اور اب وہاں خاموشی طاری تھی۔

ایک روز دوپہر کو میں ڈور پتنگ لے کر درگاہ پر گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سامنے کھیتوں میں پیلی پیلی سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ درگاہ کے صحن میں ویران مقبرے کے پاس دری کا ٹکڑا بچھائے دادا جان اسی طرح بیٹھے چڑیوں کو روٹی کے بھورے ڈال رہے تھے۔ چڑیاں شور مچاتی اُن کے کندھوں، سر اور زانوں پر آکر بیٹھ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ سے بھورے چھین کر لے جا رہی تھیں اور دادا جان ہنس ہنس کر اُن سے توتلی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کی طرف سجادہ نشین اور نائب سجادہ نشین کے اُجڑے ہوئے ٹھنڈے یخ کمروں کے باہر دھوپ میں خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا چنگیر میں تنور کی روٹی رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں مولی تھی۔ وہ خشک مولی سے تنور کی روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ اس بات کو جانے کتنے برس بیت گئے ہیں لیکن یہ عبرت انگیز منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ وہ سجادہ نشین تھا جو عرس کے موقعوں پر اپنے ہاتھ سے پلاؤ اور بریانی کے طشت بھر بھر کر رشتے داروں کے گھر پہنچایا کرتا تھا۔ اس کا چہرہ بھرا بھرا گول مٹول ہوتا تھا۔ اب وہ چہرہ اُتر گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا۔ میں ڈور اور پتنگ ہاتھ میں لیے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز بڑی مشکل سے روٹی

کے خشک نوالے نگل رہا تھا۔ ایک چڑیا چوں چوں کرتی میرے سر پر سے اڑتی ہوئی دادا جان کے کندھے پر جا کر بیٹھ گئی۔ دادا جان کی یہ عادت تھی کہ جب چڑیا اُن کے کندھے یا سر پر آکر بیٹھتی تو وہ ساکت ہو جاتے اور زیادہ ہلا جُلا نہیں کرتے تھے۔ مَیں نے دادا جان کو دیکھا تو وہ بُت بنے بیٹھے تھے اور بوڑھی نگاہوں سے چڑیا کو دیکھ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔

آج پچیس برس بعد مجھے اُس چڑیا کی یاد آئی ہے۔ کیا وہ گندمی چونچ اور بھولے بھالے چہرے والی معصوم چڑیا زندہ ہوگی؟ وہ تو مجھے نہیں بھولی ہوگی۔ پرندے کبھی محبت کرنے والوں کو نہیں بھولتے وہ انہیں زندگی میں بھی یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کا انتظار کرتے ہیں۔ کسی حیرت انگیز باغ میں ——— اُس باغ کے حسین ترین درختوں میں ——— شفاف پانیوں والی نہروں کے کنارے اَن دیکھے پھولوں کی وادیوں میں اور ———

"تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ———!"

درگاہ کے عرس، اس کی رونقیں، اُس کی روشنیاں بُجھ گئیں۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں کو اُس کے صحن میں گھریاں دوڑتی پھرتی اور اُس کے سجادہ نشینوں کے تاریک دیوان خانوں میں لٹکتے جالوں والی چھتوں کے نیچے ملنگ چرس، بھنگ پی کر سوئے رہتے۔ وقت اس درگاہ کے ایوانوں میں زوال کے جالے بُنتا گزرتا چلا گیا۔

پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ امرتسر کو بھڑکتے شعلوں کے سپرد کر کے اپنے نئے شہر ـ نئے وطن میں آ گئے۔ چھ یا شاید پانچ برس بعد یوم اقبال کے موقع پر جالندھر میں پاکستانی ہائی کمشن کی جانب سے ایک زبردست مشاعرہ ہوا جس میں لاہور کے معروف شعرا کو شرکت دعوت دی گئی۔ یہ لوگ میرے دوست تھے۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ جالندھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ چلو اسی بہانے امرتسر کے کمپنی باغ، ریالٹو سینما، ہینگو پارک اور دروازہ مہاں سنگھ کے باہر والے باغ کے یوکلپٹس کے درخت سے ملاقات ہو جائے گی۔ جاتی دفعہ ہم لاہور سے سیدھا جالندھر چلے گئے۔ واپسی پر جالندھر سے امرتسر آتے ہوئے بس تحصیل پورے کے پاس پہنچی تو میں وہیں اُتر گیا۔ جانے کس شاعر نے کہا۔

"اسے حمید! تمہیں راستہ معلوم ہے ناں؟"

میں سڑک پر کھڑا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ قیوم نظر کی آواز آئی۔

"یہ اُس کا اپنا شہر ہے۔ وہ راستہ کیسے بھول سکتا ہے؟" مَیں جانے کتنی دیر سگریٹ پیتا، ویران اور اجنبی امرتسر کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مہاں سنگھ دروازے والے یوکلپٹس کے درخت سے ملا۔ اس تاریخی ملاقات کا حال میں اِس مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں تیسرے پہر میں برج پھولا سنگھ کے قریب سے ہو کر قبرستان کی سڑک پر اتر گیا۔ قبروں پر ہل پھیر دیا گیا تھا۔ جہاں کل قبروں پر اگربتیاں سلگتی تھیں۔ چراغ جلتے تھے، آج وہاں مکئی کے کھیت تھے اور بعض جگہوں پر نئے مکانوں کی بنیادیں کھڑی تھیں۔ لوکاٹ اور امرود کے باغ اُجڑ گئے تھے، کیونکہ امرتسر میں باغبانی مسلمانوں کے پاس تھی۔ مَیں نے کسی ہندو اور کسی سکھ کو باغبانی کرتے نہ دیکھا تھا۔ اب میں درگاہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس کھائی کے پاس سے گزرا جہاں خالو جان مرحوم کے بیان کے مطابق انہیں اُلٹے ہاتھ پاؤں والی چڑیل ملی تھی۔ اِس کھائی کا آدھا حصہ بھر دیا گیا تھا اُن ندی نالوں کا نام نشان تک باقی نہ تھا جو ناشپاتی اور امرود کے باغوں کی آبیاری کیا کرتے تھے۔ اِسی قبرستان میں ایک عورت کی قبر تھی جس پر سنگِ مرمر بارہ دری بنی ہوئی تھی یہ خوبصورت قبر مرحومہ کے خاوند نے بڑی محبت سے بنوائی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محبت کرنے والے خاوند نے سنگِ مزار پر اپنی بیوی کی یاد میں بڑے ہی درد انگیز شعر کندہ کرائے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُجڑے ہوئے قبرستان میں یہ سنگِ مرمر کی بارہ دری والی قبر جُوں کی تُوں موجود تھی۔ اب میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ اب میں درگاہ کے سامنے تھا۔ لیکن وہاں درگاہ نہیں تھی۔ نہ دالان۔ نہ چبوترہ نہ کمرے، نہ سجادہ نشینوں کے دیوان خانے اور نہ مقبرہ ـ میری آنکھوں کے سامنے گنبد کی آدھی دیوار تھی جس پر تھاپیاں نیچے سے اوپر تک لگی ہوئی تھیں۔ جہاں نائب سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک جٹا دھاری سادھو بیٹھا، انگ بھبھوت رمائے چرس کے سُوٹے لگا رہا تھا اور جہاں کبھی دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں وہاں آک اور دھتورے کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ دیکھا گیا۔

ہاں ——— پلٹتے ہوئے میں نے ایک نظر اُس طرف دیکھا جہاں دادا جان دری

پر آلتی پالتی مارے بیٹھے چڑیوں کو چوری ڈالا کرتے تھے۔ چڑیوں کو پانی پلایا کرتے تھے، اور جب کوئی چڑیا اُن کے کندھے پر بیٹھ جاتی تو اُس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ وہاں کوئی چڑیا نہیں تھی۔ کوئی باباجان نہیں تھے۔ لیکن ایک بڑی ہی پیاری آنکھوں والی گلہری، شیشم کے تنوں پر بیٹھی، سورج کی تابناک روشنی میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اَمرتسر میں فساد کا پہلا شعلہ

ابھی امرتسر کو آگ نہیں لگی تھی۔

ابھی امرتسر زندہ تھا۔ اُس کے گلی کوچے زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے بھرپور تھے۔ اُس کی رگوں میں حسن اور زندہ دلی کا خون گردش کر رہا تھا۔ اُس کے باغوں میں کھلے ہوئے گلابوں پر آدھی رات کو شبنم گرا کرتی اور باغوں میں ہو کر گزرنے والی نہروں میں جھکی ہوئی ٹہنیوں کے ٹوٹ کر گرے ہوئے امرود تیرا کرتے۔ ابھی امرتسر کو آگ نہیں لگی تھی۔ ابھی امرتسر کی مسجدوں کے دودھیا گنبد سنہری دھوپ میں چمکا کرتے اور کمپنی باغ والی نہر کے کنارے پردہ مکتب کے عقب میں ناشپاتی کے درختوں پر مارچ اپریل میں سفید اور گلابی شگوفوں سے شاخیں مہک اُٹھتیں۔ تحصیل پورے والی مائی کی بیری موٹے اور میٹھے میٹھے بیروں سے لَد جاتی اور ہم روڑے مار مار کر بیر گراتے اور جب مائی گالیاں دیتی باہر نکلتی تو بھاگ جاتے۔ ابھی ہال بازار والی مسجد خیر الدین میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور اُس کے صحن والے تالاب میں سنہری اور سرخ مچھلیاں وضو کرتے نمازیوں سے چہلیں کیا کرتیں اور بوہڑ والی مسجد کے باہر جمعہ کی نماز پر ایک طرف بجلی والے چوک اور دوسری جانب بھاڑیاں والی گلی تک صفیں بچھ جاتیں۔ مسجد جان محمد کے محراب ابھی سلام بابا کے پُرجوش خطبات سے گونج رہے تھے اور سکتری باغ کی فضاؤں میں عید میلاد النبی کے پُرشکوہ جلوسوں کے سبز و سرخ ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔ رمضان کے مہینے میں پچھلے پہر امرتسر کے گلی کوچوں میں جگانے والے ڈھول تاشے بجاتے آیا کرتے اور نعت خوانوں کی ٹولیاں گیس اور لالٹینیں اٹھائے نعتیں پڑھتی گھوما کرتیں۔ عید کی صبح رنگ برنگ غباروں، بچوں کے معصوم قہقہوں او-

گرما گرم سیویوں کی خوشبو اور ننھی ننھی بچیوں کے لال پیلے گوٹے لگے آنچلوں کے ساتھ طلوع ہوتی۔ گلی گلی بچے غبارے اڑاتے، باجے بجاتے نکل آتے اور آلو کچالو گھنگنیاں اور املی چورن بیچنے والوں کی چھابڑیوں کے آگے بیٹھ جاتے۔ چوکوں میں حلوائیوں کی دکانوں پر شامیانے تن جاتے اور قسم قسم کی مٹھائیوں کے بھرے ہوئے تھال تخت پوشوں سے لے کر چھت تک سج جاتے۔

ابھی امرتسر کو آگ نہیں لگی تھی۔ ابھی امرتسر زندہ تھا اور ہر جمعرات کو فتح شاہ بخاریؒ کے مزار پر تاری کا لنگر بٹتا تھا اور شکر شاہ کا پُر جلال مقبرہ گیندے اور گلاب کے پھولوں سے مہک رہا تھا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں مسلمان لڑکیاں ہندو سکھ لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر سبق یاد کر رہی تھیں اور فرنٹیئر میل کا دیوہیکل سیاہ انجن دھوئیں کے بادل چھوڑتا دھک دھک کرتا امرتسر سٹیشن سے نکل کر سیڑھیوں والے پل کے نیچے سے گزر رہا تھا اور یوذی سائیں کے تکیے میں مجذوم زمرد کی انگوٹھیوں سیاہ لمبے بالوں اور سرخ آنکھوں والا فقیر گھڑے کی تال پر اپنی درد بھری آواز میں گا رہا تھا ۔

قہر بدل جو آئے میں
دھوئیں میرے دل والے۔ اسماناں تے چھائے نیں

اور اکھاڑے میں پہلوان اور گبرو، میاں سنگھ اور تحصیل پورے کے نوجوان زور کر رہے تھے اور دروازہ گھی منڈی والے قبرستان میں لوگ قبروں پر پھول ڈال کر فاتحہ پڑھ رہے تھے اور انجمن پارک کے جلسے میں کلاہ، اچکن اور سفید براق ڈاڑھی والے مولوی ہمدانی اپنا نورانی چہرہ لیے، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے کرسی صدارت پر بیٹھے تھے اور الیگزینڈرا پارک اور مینگو پارک میں ڈی اے وی کالج اور ایم او کالج کی ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ مروت شاہ باؤلنگ کر رہے تھے اور ہمارے دینیات کے مولوی صاحب دم پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے، ہال بازار والی میوہ منڈی میں مسلمان آڑھتی خریداروں کے شور میں بھی کھاتے کھولے کاروبار میں مصروف تھے۔ بازار سان سنگھ میں کاکا عمرو کی دکان پر اونچا لمبا اسد جو جھوم جھوم

کر قلچے نانفتائی اور گیڑوے رگڑ رہا تھا۔ کاکا محمدو پانی والے ہینڈ پمپ کے پاس کھڑا اوپر منہ کیے اپنے لڑکے بشیر کو آواز دے رہا تھا کہ اپنی اپو سے کہے کہ سماوار نیچے بھجوا دے۔

ابھی امرتسر میں کشمیریوں کے سماوار نمکین چائے اور گرم قہوے سے مہک رہے تھے اور قلندر روڑوں کی دکانیں، باقرخانیوں، اراروٹ، شیرمال، کھمنہ قلچوں نمکین قلچوں اور ورق لگی روغنی روٹیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ ابھی اس شہر بے مثال کا دل امرتسری کشمیریوں کے کلچر اور تہذیب کی گرمی سے دھڑک رہا تھا۔ ابھی آگ جو گھروں کے چولہوں میں جلتی تھی اور اس آگ نے گھروں، محلوں، بازاروں، مسجدوں اور پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ گرمیوں کی شام کو کمپنی باغ والی ٹھنڈی کھوئی پر مسلمانوں کا ہجوم ہوتا۔ پردہ باغ میں مسلمان بیبیاں، لڑکیاں اور عورتیں جھولے جھولتیں اور نوجوان بھری ہوئی، نہروں کے ٹھنڈے پانی میں چھلانگیں لگاتے۔ مجیٹھہ روڈ والے دو رویہ گھنے درخت کالی کالی میٹھی جامنوں سے لد جاتے اور نہر پار والے باغوں کی فضائیں آم، ناشپاتی، لوکاٹ اور امرود کی دھیمی دھیمی خوشبوؤں سے لبریز ہو جاتیں بازار رام باغ والی مارکیٹ حکم سنگھ کی تنگ گلی میں، آمنے سامنے کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل میں امرتسری ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں کی محفلیں بھی اپنے عروج پر تھیں۔ تام چینی کی پرانی زرد چینکوں میں پکی ہوئی چائے کے دور چل رہے تھے۔ کامریڈ ہوٹل کی انگیٹھیوں کے پاس بوریئے کی گدی پر بیٹھا سرخ و سپید خلیفہ بڑی چینک میں چائے کو بار بار جوش دے رہا ہے سامنے ترک ہوٹل کی گدی پر امرتسر کی سیاسی تاریخ کی نامور شخصیت صوفی غلام محمد ترک براجماں ہے۔ صوفی صاحب گردن گھما کر غازی عبدالرحمان سے کسی سیاسی مسئلے پر بحث بھی کر رہے ہیں اور چینک کے کھولتے پانی میں چائے کی پتی بھی ڈال رہے ہیں۔ ساتھ والے ہوٹل میں الہ دیا تھال میں چینک اور پیالیاں رکھ کر ڈور کو آواز دے رہا ہے۔

"چل بے بنجریے۔"

یہ تینوں چائے خانے چوک گول ہٹی سے دروازہ رام باغ کو جاتے بازار کی

بغلی گلی میں تھے۔ چھتیں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ بوسیدہ بنچوں کے درمیان میں دو تین لمبی میزیں رکھی تھیں جن پر چائے، پان اور سگرٹوں کے جلے ہوئے نشان تھے۔ یہاں صبح سے رات کے دو دو بجے تک چائے کے دَور چلتے اور افلاطون سے لے کر برٹینڈرسل اور ولی دکنی سے لے کر اقبال تک گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ آیئے آپ کو صوفی ترک ہوٹل کی ایک محفل کی جھلک دکھائیں۔ یہاں سیف الدین سیف نے اپنی محفل سجا رکھی ہے۔ ایک طرف موٹی موٹی نشیلی آنکھوں والا دُبلا پتلا نازک احساس شاعر علاالدین کلیم گرم کشمیری شال اوڑھے سگریٹ سُلگا رہا ہے۔ دوسری جانب فلک شگاف قہقہے لگانے والا اور ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ پوٹ ہو جانے والا خوش گو شاعر اقبال کوثر بیٹھا سیف کے کسی شعر پر سر دھن رہا ہے۔ سامنے احمد راہی اور اے حمید بیٹھے کسی بات پر ہنس رہے ہیں۔ سنہری داڑھی اور لمبے لمبے سنہری بالوں والا ظہیر کاشمیری بھی یہیں بیٹھا تھا زیرِ لب مسکراتے ہوئے چائے کی چُسکیاں لے رہا ہے اُس کے سامنے ممتاز نعت گو شاعر چاچا عیسیٰ بھی طرہ لگائے کُرسی پر اکڑوں بیٹھا پان چبا رہا ہے۔ لیجئے خوش وضع اور خوش گفتار شاعر شہزاد احمد شہزاد اور صلاح الدین ندیم بھی آ گئے۔ آتے ہی دوستوں سے دو چار چونچیں ہوئیں۔ اور ہنستے مسکراتے بیٹھ گئے۔ اب عارف عبدالمتین بھی صوفی کریم کے ساتھ نیلی شال اوڑھے پہنچ گئے ہیں۔ کونے میں پنجابی شاعر معراج دین اختر، استاد محبت اور ناظر وغیرہ بیٹھے ہیں۔ بھاری بھر کم سیاسی لیڈر گلشن بیٹھا کسی بات پر ہنس ہنس کر رشید عینکوں والے سے ہمکلام ہے۔ گھنگھریالے چمکیلے تسواری بالوں والا رشید ادب و سیاست پر بے تکان بولتا ہے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ سنہری فریم والی عینک کے شیشوں میں گول گول زندگی سے بھرپور آنکھیں بے قراری سے چمکتی رہتی ہیں۔ لطیفہ سُنا کر، محفل کو لوٹ پوٹ کر کے بڑا اپکا منہ، بنائے عینک اتار کر اسے رومال سے صاف کرنے لگتا ہے اور کنکھیوں سے دائیں بائیں دیکھ کر پھر زیرِ لب خود بھی مسکرانے لگتا ہے۔ کامریڈ ہوٹل میں سرخ و سفید، ادھیڑ عمر ذہین اور دقیق استاد غلش کاشمیری اپنے چہیتے شاگرد ضبط قریشی کے ساتھ بیٹھے

منطق، فلسفہ، عروض اور بیان پر بحث بھی کر رہے ہیں اور پنجابی شاعر استاد محبت پر پھبتیاں بھی کس رہے ہیں۔

اِتھے ... تو بھیاں وے یار سبحان اللہ
اِدھر دن مِٹھے اودھر گنڈ پے گئی
تِن سیر روپے دے چاول آئے
پنج سیر ٹِچی اُوتے گھنڈ پے گئی
تنھو بھی جوڑ کے پٹھاں ورتاون گے
جدھر گھنڈ تھی اودھر ڈنڈ پے گئی

سیف الدین سیف اپنی تازہ کہی ہوئی طویل نظم "ساربان" میں سے کچھ بند سُنانے کے بعد اپنی سلگتی پُر سکون نیم وا گرم آنکھوں سے باہر گلی میں تک رہا ہے اور ایک ہاتھ میں سگریٹ سلگائے دوسرے ہاتھ کی اُنگلیاں آہستہ آہستہ اپنی باریک مونچھوں کے کونوں پر پھیر رہا ہے۔ اب صدیق کلیم بھی بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ سست قدم اٹھاتے آ گئے ہیں۔ چاچا عیسیٰ نے آواز لگائی۔

"صوفی صاحب چائے اور آئے گی۔"

اور صوفی ترک نے دہکتے کوئلوں پر تام چینی کی ایک اور چینک رکھ دی ہے کامریڈ ہوٹل کے پھٹے پر ادھیڑ عمر کا بھاری بھر کم حوالدار فضل آ کر بیٹھ گیا ہے اور خلیفے سے تیز چینی والی چائے بنوا رہا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ ایک چھٹانک افیم آدھ سیر حلوے کے ساتھ روزانہ کھاتا ہے۔ الروشنے کے ہوٹل میں چاق و چوبند، تیز و طرار امرتسر کا رجز گو شاعر نفیس خلیل آ گیا ہے اور تمباکو والا پان منہ میں دبائے دینے جہالتی، حاجی حمزہ مدے اور جیرے گوئیے کو اپنا تازہ کلام سُنا رہا ہے۔

جہاں جا کے جھنڈے کو گاڑا وطن ہے۔ جہاں شیر ناگہاں دھاڑا وطن ہے
وطن ہے مجاہد کے پاؤں کے نیچے۔

موٹی آنکھوں، تیکھی ناک اور زنانہ چال ڈھال والا جیرا گویا نفیس خلیل کا شیر

کلام سن رہا ہے اور واہ واہ کر رہا ہے۔ حاجی حامد اپنی کانی آنکھ سے پانی پونچھتے ہوئے نفیس خلیلی پر پھبتی کسنے کو پر تول رہا ہے۔ دینا جہالتی بھری بھری مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے غور سے شعر سن رہا ہے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے کالے پمپ شو والا پاؤں ہلاتے ہوئے گردن ٹیڑھی کئے اس فکر میں ہے کہ خلیلی کے کس شعر پر اعتراض کرے۔

اب بچپن ساٹھ کے سن کا چوڑا چکلا، راجپوتی شان کی سفید گپھے دار مونچھوں اور چمکیلی آنکھوں والا ایک بزرگ سلیٹی شیروانی پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے کامریڈ ہوٹل میں داخل ہوا ہے۔ اُسے دیکھ کر مغل بادشاہوں کے شاہی چوبداروں کا خیال آتا ہے اِن کا نام شیخ حبیب ہے۔ غالباً پٹیالے کے ہیں۔ موسیقی پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ پوپلے منہ والے کالے بھجنگ مشہور ربابی استاد فیروز کے پاس جاکر بیٹھ گئے ہیں۔ اُستاد فیروز کو امرتسر کے بے مثال فارسی شاعر اُستاد کی فارسی غزلیں زبانی یاد ہیں جنہیں وہ اپنی خشک و پُرسوز آواز میں لہک لہک کر گایا کرتا ہے۔ خود بھی روتا ہے۔ اوروں کو بھی رُلاتا ہے۔ وہ درد بھری آواز والے، وہ آنکھوں سے محبت کے انمول موتی گرانے والے لوگ کہاں چلے گئے! امرتسر کو آگ لگ گئی۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ محفلیں اُجڑ گئیں۔ پھول مرجھا کر سوکھ گئے۔ ڈالیوں سے ٹوٹے پتوں کو ہوا اُڑا کر لے گئی۔

اب کے بچھڑے کہاں ملیں گے! ۔ دُور پڑے ہیں جا۔

لیکن ابھی تو خلیفے اور صوفی ترک کے ہوٹل میں یاروں کی محفلیں سجی ہیں۔ نفیس خلیلی انقلابی شعر سنانے کے بعد لطیفے سُنا سُنا کر فلک شگاف قہقہے لگا رہا ہے ترک ہوٹل میں علاالدین کلیم کے بعد اقبال کوثر ترنم سے شعر پڑھ رہا ہے۔ چوک دال وکاں سے پائوں کا تھال رکھ کر آگیا ہے۔ چائے خانے کی فضا پاسنگ شو، قینچی، ٹاؤن ٹاک، پلیئرز نیوی کٹ اور کیپسٹن بیگم کے دھوئیں سے بھر گئی ہے۔ اب ماسٹر ابراہیم اور ماسٹر حبیب بھی آگئے ہیں۔ دونوں بڑے گہرے دوست ہیں۔ ضلع

اور پھبتی نوک پر زبان رہتی ہے۔ بازار والے حجام کے ایک خوش شکل نوعمر کاریگر سے دونوں پیار کرتے ہیں اور ہر روز اُسی سے جاکر ڈاڑھی منڈواتے ہیں۔ ایک روز سیف نے مذاق کیا تو ماسٹر حبیب نے کہا۔

"سیف صاحب! معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم اُس کی شیو بنائیں الٹا اُس سے ہمیں شیو بنوانی پڑتی ہے۔"

لیجئے۔ بابو غلام محمد بٹ اور شریف متین کی جوڑی بھی آگئی۔ بابو غلام محمد بٹ کا ہال بازار کی ایک گلی میں قالینوں کا کارخانہ ہے اور شریف متین قالینوں کی ڈیزائننگ کرتا ہے اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا غالباً سیکرٹری بھی ہے۔ درمیانے قد اور لمبوترے چہرے والا گول مٹول بابو غلام محمد بٹ بڑا جذباتی اور ہنس مکھ ہے۔ عروض منطق اور فلسفے پر لمبی لمبی بحثیں کرتا اور کونگو گوشت کھانا اُسے بہت مرغوب ہے سیف اور ضبط سے اُس کی بحث کئی کئی روز جاری رہتی اور مجھے یاد ہے ہیگل کی جدلیات کا ذکر بار بار آیا کرتا۔ اقبال کوثر کے لطیفوں پر وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ فارسی، اردو یا انگریزی کی کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ بغل میں ہوتی ہے بحث کرتے ہوئے آنکھوں میں بلا کی چمک آجاتی ہے بحث علمی مسائل سے نکل کر ذاتیات کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے ہونٹوں سے جھاگ اُڑنے لگتا ہے۔ طبیعت میں شوخی اور شیخی دونوں اعتدال کی حد میں ہیں۔ قالینوں کے نقشے بنانے میں بھی وہ ایک ماہر نقاش ہے۔ ایک بار اُس کے کارخانے میں سمرقند کا ایک قالین آیا جس پر مکسیم گورکی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ بابو غلام محمد بٹ نے آنکھیں سکیڑ کر اُس کا ایک ایک مربع تکون اور بوٹی دیکھی۔ پھر کتاب میز پر رکھی اور سگریٹ کا لمبا سوٹا لگا کر چٹکی سے گل جھاڑتے بولا۔

"میں اگر قالین پر جناح کی تصویر بنوا کر سمرقندیوں کو نہ دکھاؤں تو بابو غلام محمد بٹ نہ کہنا۔"

اور اُسی روز اُس نے پرانے میز پر موٹے کاغذ کا تاؤ پھیلا کر کالی سیاہی سے قالین کا متن تیار کرنا شروع کر دیا۔

کامریڈ ہوٹل اور ترک ہوٹل کی یہ زندگی سے بھرپور محفلیں رات کے بارہ ایک بجے تک جمی رہتی ہیں۔ یہاں بنگال کے دہشت پسندوں، تلنگانہ کے اشتراکیوں، امرتسر کے نیلی پوشوں، احراریوں، مسلم لیگیوں اور پٹیالہ گھرانوں کے گائیکوں، رام باغ کی طوائفوں، کٹڑہ کنہیا کی رقاصاؤں اور شمابو کے فالودے تک —— ہر موضوع پر باتیں ہوتی ہیں۔ آغا حشر والی واری کا مکان قریب ہی ہے۔ اس کا ذکر ہوتا ہے تو ماسٹر فیروز رنگین چھلکا لیتا ہے اور بھیشم پرتگیا کھیل کا کوئی منظر اس طرح سناتا ہے کہ محفل پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔

ترک ہوٹل کے دروازے پر لکڑی کے آدمی کی طرح چلتا اونچا لمبا، دبلا خوش شکل، بے باک رشید لمبو نمودار ہوا ہے۔ خوب شور مچا کر بولتا ہے اور آگے پیچھے جھول جھول کر قہقہے لگاتا ہے۔ اس کا بڑا بھائی خورشید کم گو اور اکھڑ مزاج ہے۔ دونوں پاؤں میز کے کنارے پر ٹکا کر کرسی پر بیٹھتا ہے۔ پنڈلیوں پر سے دھوتی کھسکا لیا کرتا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد رگڑ رگڑ کر مونڈھی ہوئی پنڈلیوں کو رومال سے جھاڑتا رہتا۔ بہت کم بولتا ہے۔ جب بولتا ہے کفن پھاڑ کر بولتا ہے اور جملے کا لٹھ گھما کر مارتا ہے۔ اس کی بیٹھک میں انیسویں صدی کے مصوروں کے بڑے شہکار آویزاں تھے جو فسادات کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ اور امرتسر میں فسادات کی آگ کا پہلا شعلہ گول ہٹی سے بلند ہوا تھا۔

گول ہٹی ہال بازار سے کٹڑہ کنہیا کی طرف مڑتے ہوئے کونے والی تین دکانوں پر مشتمل تھی۔ یہ تینوں دکانیں موٹے تازے، گول مٹول تین سکھ بھائیوں کی تھیں۔ دو دکانیں منیہاری کی تھیں اور ایک دکان پر عمارتی روغن، سپرٹ اور تارپین کا تیل فروخت ہوا کرتا تھا۔ یہ تینوں سکھ امیر تھے اور ان کی دکانیں مال سے بھری رہا کرتیں۔ منیاری کی دکانوں کے آگے چمڑے کے بیلٹ، ازار بند پراندے اور تلواریں کرپانیں لٹکی رہا کرتیں۔ فروری ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دن تھے۔ پاکستان کی حمایت میں اور ہندو سکھ پاکستان کے خلاف جلوس نکال رہے تھے۔ فروری کے آخر میں یا غالباً مارچ کی پہلی دور ہی کو ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی ہال کے باہر تلوار لہرا کر اعلان کیا کہ سکھ

پاکستان نہیں بلکہ مسلمانوں کا بھارت میں قبرستان بنائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ امرتسر کی فضا میں بھی بے حد کشیدگی پیدا ہو گئی۔ غالباً مارچ کی تیسری یا چوتھی تاریخ تھی۔ ٹاؤن ہال والے باغ میں مولسری اور کھٹے کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد میں دکان سے حسبِ عادت دودھ پی کر دھوتی قمیض اور سلیپر پہنے ترک ہوٹل جانے کے لیے ہال بازار میں آ گیا۔ میں نے ان ہی دنوں گالزوردی کا ناولٹ "سیب کا درخت" پڑھا تھا اور سیب کے شگوفوں، موسیقی، لیموں کی کلیوں کی مہک اور بلیک فارسٹ کی سرسبز ڈھلانوں پر اگنے والے سویٹ بیئر کی خوشبوؤں کے ساتھ ساتھ اڑا کرتا اور تصور ہی تصور میں اس نیلے سرد چشمے پر پہنچ جاتا جس کے اوپر سیب کے گھنے درخت کا سایہ تھا اور جس کے برفاب میں ڈوب کر خیال پرست رومانی لڑکی میگن نے اپنے بے وفا محبوب اشرٹ کی یاد میں جان دے دی تھی۔ میں سیب کے گلابی شگوفوں کو چومتا، غم زدہ میگن کو یاد کرتا پاسنگ شو سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے ہال بازار میں سے گزر رہا تھا۔ امرتسر کی فضا میں کشیدگی ضرور تھی۔ مگر ہم امرتسر والے اس کے عادی تھے۔ کیونکہ قریباً ہر محرم پر ہندو مسلم فساد ضرور ہو جاتا تھا اور پلہ ہمیشہ مسلمانوں کا بھاری رہا کرتا۔ چنانچہ امرتسر کے مسلمان بڑے مطمئن اور بغیر کسی خوف کے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ میں جب سکندر خان کی اونچی مسجد سے گزر کر گول ہٹی والے چوک میں آیا تو پیچھے سے ایک تانگہ آ کر چوک میں رک گیا۔ اس تانگے میں نیلی پیلی پگڑیوں والے اکالی سکھ بیٹھے تھے۔ پیچھے ایک نوبت رکھی تھی۔ ایک اکالی نے دھما دھم نوبت پیٹنی شروع کر دی۔ میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کافی لوگ جمع ہو گئے۔ گول ہٹی والے سکھ بھائی بھی اپنی اپنی گدیوں پر کھڑے ہو گئے۔ نوبت بجنی بند ہو گئی۔ اب تانگے کی اگلی جانب سے ایک ہٹا کٹا اکالی سکھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے کھلے اور اشتعال انگیز لفظوں میں کہا کہ ماسٹر جی نے لاہور میں اعلان کر دیا ہے کہ سکھ پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ مسلمانوں کا پاکستان نہیں قبرستان بنے گا۔ گورو دے پیارو! اٹھ کھڑے ہو جاؤ اور اس گورو کی نگری کو مسلمانوں سے پاک

کردو۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اُس اکالی سِکھ نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی زہریلی اور اشتعال انگیز تقریر کی تھی۔ وہ بمشکل کوئی ڈیڑھ ایک منٹ بولا ہوگا کہ رام باغ والے بازار کی جانب جو مسلمان نوبت کی آواز سُن کر جمع ہو گئے تھے انہوں نے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ اس کے جواب میں اکالی سکھوں نے ست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ میں گول ہٹی کے آگے تانگے کے پاس کھڑا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے گول ہٹی کے گول مٹول سِکھ نے دکان کے آگے لٹکتی ہوئی تلواریں دونوں ہاتھوں سے جھٹکا دے کر کھینچیں اور تانگے میں کھڑے اکالی سکھوں کی طرف اُچھال دیں۔ جو تلواریں اور کرپانیں سونت کر مسلمانوں پر پل پڑے۔ میں وہاں سے بھاگ کر خراسیوں والی گلی میں آگیا۔

یہ امرتسر شہر کے مسلمانوں پر سکھوں کا پہلا مسلح حملہ تھا۔ مسلمانوں کے پاس سوائے زورِ بازو کے اور کچھ نہ تھا۔ کسی نے دکان پہ سے بٹہ اٹھایا۔ کسی نے سائبان کا بانس کھینچا اور کرپانوں تلواروں سے مسلح سکھوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ کچھ مسلمان زخمی ہوئے۔ بہرحال پولیس آگئی معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ بات سب کو اچھی طرح معلوم تھی کہ گول ہٹی والوں نے اکالی سکھوں کو مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے لیے تلواریں دی تھیں چنانچہ اُسی رات رامباغ چوک فرید اور گلی خراسیاں کے نوجوان مسلمانوں نے گول ہٹی والی تینوں دکانوں کو آگ لگا دی۔ یہ امرتسر میں فساد کی پہلی آگ تھی۔ فساد کا پہلا شعلہ تھا جو نصف شب کے بعد تک اچانک بھڑک اٹھا۔   نے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر آگ کے سرخ و زرد شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ تھوڑی دیر بعد وارنش اور سپرٹ سے بھرے ہوئے ڈرموں کے دھماکے کے ساتھ پھٹنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سارے محلے میں پینٹ اور وارنش کی بدبو پھیل گئی اگلے روز پولیس نے کچھ مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ شہر میں مسلمانوں اور ہندو سکھوں کے درمیان زبردست کشیدگی پھیل گئی۔ مسجدوں میں پاکستان کی حمایت میں اور گردواروں مندروں میں پاکستان کے خلاف تقریریں ہونے لگیں۔ گلیوں کے منہ دھڑا دھڑ لوہے کے دروازوں سے بند کیے جانے لگے۔ ہندو سکھ ایک عرصے سے

اپنے محلوں میں اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ اب مسلمانوں کو بھی ہوش آیا اور مسلم محلوں میں کلہاڑے اور برچھیاں تیار ہونے لگیں۔ ہمارے محلے کے مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے گلی کے ایک سرمایہ دار کپڑے کے تاجر کو لپٹا اور اسلحہ خریدنے بھیجا۔ وہ سارے پیسے ہضم کر گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ اُسی روز لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اُس کی خبر امرتسر پہنچی تو اشتعال اور بڑھ گیا۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ کٹڑہ میاں سنگھ چوک فرید اور گلی رنگریزاں کے بہت سے مسلمان جمعہ کی نماز پڑھنے چوک پراگ داس والی مسجد میں گئے۔ یہ مسجد سکھوں کے محلے میں گھری ہوئی تھی۔ اِس اقدام سے مسلمان غیر مسلموں کو اپنی شجاعت اور اسلام سے محبت دِکھانا چاہتے تھے۔ مگر جذبات کے جوش میں نہتے ہی دشمنوں کے بیچ چلے گئے۔ چنانچہ وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ سکھوں نے کرپانوں اور تلواروں سے اُن پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے وضو کے لوٹے چلانے شروع کر دیئے جہاں سے لوٹا بم کی اصطلاح عام ہوئی۔ لیکن وضو کے لوٹے تلواروں کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے تھے۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ بہت شدید زخمی ہوئے۔ سکھوں نے چوک پراگ داس کے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگا دی۔ مسلمان عورتیں ننگے پاؤں ننگے سر عزت بچا کر کٹڑہ میاں سنگھ اور شریف پورے پہنچیں۔ میں اُس وقت ہال بازار کے بغلی بازار میں تاج محل ہوٹل کے اوپر احمد راہی کے ماہنامہ "محور" کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ نیچے شور مچا۔

"مسلمانو! چوک پراگ داس میں سکھوں نے تمہارے بھائیوں کو شہید کر دیا۔"

ہر طرف ایک جوش اور ہیجان پھیل گیا۔ ہال بازار میں سکھوں اور ہندو اپنی دکانیں بند کر کے بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے اُن دکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ ہمارے محلے میں کیسر سنگھ اور لکھی ٹال والے کے لڑکے کی منیاری کی دکانیں لوٹ لی گئیں۔ کیسر سنگھ سے جب کوئی گاہک نمبر آٹھ مارکہ ڈور کی گوٹ لینے آتا تو وہ سیڑھی لگا کر بندر کی طرح اوپر چڑھتا اور ایک ڈبے میں سے گوٹ نکال کر دیا کرتا تھا۔ لوٹ مار کے دن میں نے اسی طرح سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی۔ بندر کی طرح پھرتی سے اوپر چڑھا اور نمبر آٹھ کی ڈور کی پوری درجن گوٹیں لے کر نیچے آگیا۔ لکھی والی دکان سے میں نے جیلٹ بلیڈ کے کتنے ہی پیکٹ

لوٹے اور گھر میں سنبھال کر رکھ دیے۔ یہ سب کچھ وہیں پڑے کا پڑا رہ گیا۔ نہال سنگھ عطار کی دکان لٹی تو میں نے محلے کے ادھیڑ عمر دارو غہ کو دیکھا کہ دکان کے پھٹے پر ایک طرف بیٹھا سیب کا مربہ کھا رہا تھا۔ دروازہ میاں سنگھ والے سکھ کا شراب کا ٹھیکہ بھی لوٹ لیا گیا۔ ہماری گلی کا جوان بدمعاش مٹھو مالشی شراب کی بوتلوں کی بوری بھر کر اپنے گھر لے آیا اور پورے چھ مہینے یعنی امرتسر چھوڑنے تک وہ شراب کے نشے میں دھت رہا۔ محلے کے ایک سکھ کے مکان میں سے اُسے ایک برچھی اور دونالی بندوق مل گئی تھی۔ چھوٹی ہوئی برچھی پہنے کندھے پر دونالی لٹکائے۔ شراب کے نشے میں جھومتا جاتا وہ راتوں کو گلی کے آہنی دروازے کے گرد پہرہ دیا کرتا۔ جب موج آتی دھائیں دھائیں ہوا میں ایک دو فائر کر دیتا۔

شہر کے دوسرے علاقوں میں مسلمان، ہندو سکھ محلوں میں گھرے ہونے کے باوجود بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کر رہے تھے خنجر زنی اور چھرا گھونپنے کی جگہ جگہ وارداتیں ہو رہی تھیں۔ جس روز مسلمانوں نے کٹڑہ کنہیا لال کی ساری ہندو دکانوں کو آگ لگا دی اس سے اگلے روز شہر میں پہلی بار دو دن کا کرفیو لگا دیا تھا۔ ایک ہوائی جہاز نے شہر پر اشتہار پھینکے۔ ایک اشتہار اتفاق سے میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کی ایک طرف گورمکھی اور دوسری طرف اردو میں کرفیو کا حکم درج ہے۔ میں اسے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

اعلان

"امرتسر شہر میں ۷ مارچ ۱۹۴۷ء دو بجے دن کے دو دن کے لئے ۴۸ گھنٹے کا کرفیو نافذ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹے کا کرفیو جس میں ۱۰ بجے سے ۲ بجے دن ۴ گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔ لاہور جالندھر میں ریلوے لائن کے جنوبی جانب میونسپل حدود میں نافذ رہے گا۔ جس شخص کے قبضہ میں کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو بطور ہتھیار کے استعمال ہو سکے ماسوائے کرپان کے جو میان میں ڈالی ہوئی ہو۔ پائی گئی یا جو کوئی شخص لوٹتا یا آگ لگاتا ہوا دیکھا گیا اس کو نظر پڑتے ہی گولی ماردی جائے گی۔ ان احکام کو نافذ کرنے کے لئے فوجی دستے دو بجے دن کے بعد شہر میں گشت کریں گے۔"

اعلان

امرتسر شہر میں ۷ مارچ ۱۹۴۷ء دو بجے دن سے دو دن کیلئے ۴۸ گھنٹہ کا کرفیو نافذ کیا گیا ہے اُس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹہ کا کرفیو جس میں ۱۰ بجے سے ۲ بجے دن ۴ گھنٹہ کا وقفہ ہوگا لاہور جالندھر میں ریلوے لائن کے جنوبی جانب میونسپل حدود میں نافذ رہیگا جس شخص کے قبضہ میں کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو بطور ہتھیار کے استعمال ہو سکے ماسوائے کرپان کے جو میان میں ڈالی ہوئی ہو پائی گئی یا جو کوئی شخص لوٹتا یا آگ لگاتا ہوا دیکھا گیا اُس کو نظر پڑتے ہی گولی ماردی جائیگی۔ اِن احکام کو نافذ کرنے کے لئے فوجی دستے دو بجے دِن کے بعد شہر میں گشت کریں گے۔

امرتسر میں انگریز حکومت کی طرف سے لگائے گئے کرفیو کا اعلان

ਇਲਾਨ

ਅੰਮ੍ਰਿਤਸਰ ਸ਼ਹਰ ਵਿਚ ੭ ਮਾਰਚ ੧੯੪੭ ਨੂੰ ਦੋ ਬਜੇ ਦਿਨ ਤੋਂ ਲੈ ਕੇ ੨੪ ਘੰਟੇ ਦਾ ਕਰਫਿਊ ਆਰਡਰ ਲਾ ਦਿਤਾ ਗਿਆ ਏ ਜਿਸ ਤੋਂ ਪਿਛੋਂ ਅਗਲੇ ਪੰਜਾਂ ਦਿਨਾਂ ਲਈ ੨੦ ਘੰਟੇ ਦਾ ਕਰਫਿਊ ਜਿਹਦੇ ਵਿਚ ੧੦ ਬਜੇ ਤੋਂ ਦੋ ਬਜੇ ਦਿਨ ਤਕ ੪ ਘੰਟੇ ਦਾ ਵਕਫਾ ਹੋਵਗਾ, ਲਾਹੌਰ ਜਾਲੰਧਰ ਮੇਨ ਰੇਲਵੇ ਲਾਈਨ ਦੱਖਨ ਵਲੇ ਪਾਸੇ ਮਿਊਨਿਸਪਲ ਕਮੇਟੀ ਦੀ ਹਦ ਵਿਚ ਹੋਵੇਗਾ, ਜੇ ਕਿਸੇ ਆਦਮੀ ਦੇ ਕੋਲ ਕਿਸੇ ਕਿਸਮ ਦਾ ਹਥਿਆਰ ਯਾਂ ਹੋਰ ਕੋਈ ਅਜੇਹੀ ਚੀਜ਼ ਜਿਹੜੀ ਹਥਿਆਰ ਵਾਂਗੂ ਵਰਤੀ ਜਾ ਸਕੇ ਸਵਾਏ ਕਰਪਾਨਾਂ ਦੇ ਜਿਹੜੀ ਨਿਆਮ ਵਿਚ ਹੋਵੇ ਯਾਂ ਕਿਸੇ ਆਦਮੀ ਨੂੰ ਲੁਟਮਾਰ ਕਰਦਾ ਯਾਂ ਅਗ ਲੌਂਦਾ ਵੇਖਿਆ ਗਿਆ ਉਹਨੂੰ ਉਸੇ ਵੇਲੇ ਵੇਂਹਦਿਆ ਸਾਰ ਹੀ ਗੋਲੀ ਮਾਰ ਦਿੱਤੀ ਜਾਵੇਗੀ, ਇਹਨਾਂ ਹੁਕਮਾਂ ਨੂੰ ਚਲੌਨ ਲਈ ਦੋ ਬਜੇ ਦਿਨ ਦੇ ਪਿਛੋਂ ਫੌਜ ਸ਼ਹਰ ਵਿਚ ਚਕਰ ਲਾਵੇਗੀ।

امرتسر میں انگریز حکومت کی طرف سے لگائے گئے کرفیو کا گورمکھی اشتہار

کرفیو کے دوران گورا فوج شہر میں گشت لگاتی۔ اگلے روز سڑکوں پر ایسی لاشیں بھی ملتیں جن کے ہاتھ میں کرفیو پاس ہوتے۔ کرفیو کھلتے ہی چھرا گھونپنے کی وارداتیں دوبارا شروع ہو جاتیں۔ رات کو ہندو سکھ علاقوں سے ست سری اکال، ہر ہر مہادیو اور مسلمان محلوں سے نعرہ تکبیر کی آوازیں بلند ہوتیں۔ ایک روز کرفیو کھلتے کے ساتھ ہی میں اور میرا چھوٹا بھائی مقصود ہال بازار میں سے کمپنی باغ کی طرف جا رہے تھے کہ ڈاکٹر عبداللہ کی دکان کے پاس ہمارے سامنے ایک نوجوان نے بوڑھے سکھ کو چھرا گھونپ دیا۔ یہ بوڑھا سکھ خالی ٹوکری لیے تانبے کے فریم والی عینک لگائے خوفزدہ اور سہما سہما سا ہمارے آگے آگے میوہ منڈی سودا خریدنے جا رہا تھا کہ اچانک ہمارے عقب سے ایک لڑکا نمودار ہوا اور بوڑھے سکھ کے ساتھ لگ کر ساتھ والی گلی میں غائب ہو گیا۔ بوڑھے سکھ کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

"اوئے مار سٹیا ای"

اور اس کے ساتھ سڑک پر گر پڑا اور اس کی پشت سے خون بہنے لگا۔ بازار ایک دم خالی ہو گیا۔ ہم بھی ساتھ والی گلی میں بھاگ گئے۔ اسی طرح سکھوں کے محلے میں جا نکلنے والے اکا دکا مسلمانوں کو ہندو سکھ ہلاک کر دیتے تھے اور ان کی لاشیں گندے گٹروں میں پھینک دیتے تھے۔ اب جالندھر، پٹیالہ نابھ اور دوسری سکھ ریاستوں سے بھی مسلمانوں کے قتل عام کی بھیانک خبریں آنے لگی تھیں۔ یہ حقیقت ہے اور اس کی گواہی بھارت کے پرانے ہندو سکھ بھی دیں گے کہ مسلمان بڑی رواداری سے کام لے رہے تھے۔ غیر مسلم عورتوں اور بچوں پر انکا ہاتھ بالکل نہیں اٹھا۔ بلکہ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے محلوں میں سے ہندو سکھ بچوں اور عورتوں کو بحفاظت نکال کر سکھوں کے محلوں میں پہنچایا جبکہ ہندو اور سکھوں کے پاس ایسا کوئی اخلاقی ضابطہ نہ تھا۔ وہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کر رہے تھے۔ اگر کہیں کسی جگہ مسلمان عورتوں کی عزت اور جانیں بچانے کا واقعہ ہوا ہے تو اس کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

دروازہ میاں سنگھ کے باہر مشرقی جانب کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر اکالی اور نہنگ سکھوں کا ایک گوردوارہ تھا جہاں انہوں نے ایک قلعہ بنا رکھا تھا اس قلعے کی ممٹیوں سے سکھ اس قلعے کا نام برج پھولا سنگھ تھا۔ کٹڑہ میاں سنگھ، چائی ونڈ اور گمٹی منڈی کے مسلمان محلوں پر فائرنگ کرتے رہتے تھے۔ گرمیوں کے دھواں آلود فساد زدہ گرم دن تھے۔ ہمارے محلے میں لال حویلی والے مکان کی چھت پر خواجہ فیض اپنے ایک دوست کے ساتھ بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا۔ وہ اونچا لمبا بھرپور کشمیری جوان تھا۔ اُس نے صرف دھوتی پہن رکھی تھی۔ پہرہ دیتے دیتے خدا جانے کس لئے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ برج پھولا سنگھ کی جانب سے تھری ناٹ تھری کی گولی آئی اور سیدھی فیض کی چھاتی میں آ کر لگی۔ وہ خون میں لت پت گرا اور وہیں شہید ہو گیا۔ اُسکی لاش نیچے لا کر جب اُس کے باپ کو دکھائی تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ بوڑھا باپ اس صدمے سے حواس کھو بیٹھا بار بار یہی کہتا۔

”میں نے کہا تھا فیض قمیض پہن کر اوپر جا۔ قمیض پہن کر جا......“

ایسے کئی ماؤں کے شیر پاکستان پر قربان ہو گئے اور آج اُن کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں۔ لیکن اُن کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ اُن کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا۔ شریف پورے سے لے کر مسلم ہائی سکول تک جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ دن رات پہرہ دیا کرتے۔ دروازہ میاں سنگھ کی جانب سے دو برقعہ پوش عورتیں تحصیل پورے کی طرف جا رہی تھیں۔ جب وہ آدھے راستے میں پہنچیں تو برج پھولا سنگھ کی جانب سے کچھ اکالی سکھوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اور انہیں اٹھا کر لے گئے۔ بپھرے ہوئے شیروں کی طرح شریف پورے کے نوجوان ہاکیاں وغیرہ لے کر نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے لپکے اور آدھے راستے میں ہی اکالی سکھوں کو لیا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ ایک ارائیں دلیر نوجوان رفیق پونگی کو گولی لگی۔ مسلمان عورتوں کو چھڑا لیا گیا۔ رفیق پونگی کو اُس کے گھر تحصیل پورے لے جایا گیا۔ خون بہت بہہ رہا تھا۔ وہ جوش میں نعرے لگا رہا تھا۔ رات کے پہلے حصے میں اس شہید نے بھی دم توڑ دیا۔ بقول محمد اکرم بٹ آف ریڈیو پاکستان نیلی آنکھوں والا یہ ارائیں نوجوان

امرتسر کا پہلا شہید تھا۔

دروازہ رام باغ کے باہر اکے اور تانگے رمداس، اجنالہ، فتح گڑھ چوڑیاں، جینڈھ اور چھیارٹی جایا کرتے تھے۔ چھیارٹی اپنے میٹھے خربوزوں اور پورن بھگت کی سوتیلی ماں مائی لوناں کی جنم بھومی کی وجہ سے مشہور تھا اور جینڈھ پنجاب کے سرکردہ اور امیر ترین سکھوں کا گڑھ تھا۔ جینڈھ کے تمام مسلمان خاندانوں کو سکھوں نے بے دردی سے شہید کر دیا۔ مشہور افسانہ نگار اور پروفیسر غلام علی چوہدری کے گھر کے انیس بیس افراد شہید کر دیئے گئے۔

فساد زدہ امرتسر کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی کہ برج پھولا سنگھ کے اکالی سکھوں نے ہمارے محلے پر حملہ کر دیا۔ چونگی بدمعاش نے گلی میں آ کر نعرہ مارا۔

”اوئے کافر آ گئے جے۔ نکل آؤ یار مسلمانو“

اِس کے ساتھ ہی محلے میں ہیجان پھیل گیا جس کے ہاتھ میں جو آیا لے کر دروازہ میاں سنگھ کی طرف اٹھ دوڑا۔ جان بدمعاش نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر میٹھا مالٹا کی چسکی لگائی ہڈالی سنبھالی اور چنگھاڑتا ہوا اکالیوں سے لڑنے کے لیئے لپکا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی جوش میں آ کر ہاکی پکڑی اور دوسرے محلے داروں کے ساتھ اٹھ دوڑا۔ میں گلی میں بھاگتا بھی جا رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے لڑائی ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ مکانوں کی کھڑکیوں میں عورتیں چھتیں اٹھائے سہمی کھڑی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر مجھے بہت جوش آیا اور میں اور تیز دوڑنے لگا۔ میدانِ کارزار میں جا کر معلوم ہوا کہ اکالیوں کے حملے کو دروازے کے مسلمانوں نے نہ صرف بہادری سے روک لیا بلکہ انہیں پسپا کر کے برج پھولا سنگھ کی طرف بھگا دیا۔ ایک اکالی سکھ کی موٹی تازی کٹی ہوئی پنڈلی دروازے کے باہر جی ٹی روڈ پر پڑی ابھی تک پھڑک رہی تھی۔ ہمارے محلے کے دو چار نوجوان زخمی ہوئے۔ شدید زخمی ہونے والوں میں غلام قادر آف قادر شوز بھی تھے۔

امرتسر میں فساد کے شعلے وقت کے ساتھ ساتھ تیز سے تیز تر ہو رہے تھے فضا میں ہر وقت مٹی کا تیل جلی ہوئی لکڑی اور گندے بیروزے کی بو پھیلی رہتی تھی۔ شہر کی مجلسی، ثقافتی اور کلچرل زندگی ختم ہو گئی تھی۔ باغ اُجڑ گئے تھے۔ کمپنی باغ، سکتری باغ اور

گول باغ میں خاک اڑتی تھی۔ پھلوں کے باغ ویران ہو گئے تھے۔ ہواؤں میں ایک دہشت اور خوف کی فضا رچی تھی۔ اب یہ بات بھی کھل چکی تھی کہ امرتسر پاکستان میں نہیں آئے گا۔ ریڈکلف کی اندھی لکیر نے گورداسپور ہوشیار پور اور جموں پٹھانکوٹ کے مسلمانوں پر بھی ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل والی ساری کی ساری مارکیٹ نذر آتش کر دی گئی تھی۔ ان ہوٹلوں بیٹھنے والے ادیب، شاعر، نقاد، موسیقار، دانشور اور سیاستدان اپنے محلوں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جالندھر اور پنجاب کے دوسرے شہروں سے آفت زدہ مسلم مہاجرین کے قافلے پاکستان کی طرف چل پڑے تھے۔ امرتسر کے مسلمانوں نے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا لیکن اب وہ بھی پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے تھے مسلمان پولیس سے ہتھیار لے لئے گئے تھے۔ شہر میں گورکھا جاٹ اور سکھ فوج آ گئی تھی۔ شریف پورے کو مسلم مہاجر کیمپ قرار دے دیا گیا اور اس کے باہر بلوچ رجمنٹ کے سپاہی بیٹھ گئے کوچہ رنگریزاں میں باغ رامانند کے ہندو سکھوں نے فوج کے ساتھ مل کر اچانک حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ باقی لوگ بڑی مشکل سے جان بچا کر ہمارے محلے گلی ڈبگراں میں آ گئے۔ سوائے ہمارے محلے اور شریف پورے کے سارا امرتسر ہندو سکھ فوج کی بربریت کی زد میں تھا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ لوٹ کر اور آگ لگا لگا کر تھک گئے تھے۔ اب وہ ہمارے محلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خبر آئی کہ مسلم لیگ کے ٹرک لاہور سے مسلمانوں کو لینے کے لئے آ رہے ہیں۔ ایک روز دو فوجی ٹرک گلی کے باہر آ کر رک گئے ان میں گلی کے ایک سرمایہ دار نے گھر کا سارا سامان لادا اور غریب مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان کو روانہ ہو گیا۔ جاتے بد معاش کی ساری بوتلیں ختم ہو چکی تھیں اور وہ سر جھکائے ایک دکان کے پھٹے پر اداس بیٹھا تھا۔

اور پھر ایک روز گورکھا فوجیوں نے گلی کے دروازے پر دستی بم پھینک دیا۔ ایک ہیبتناک دھماکہ ہوا اور گلی میں بھگدڑ مچ گئی اور سب لوگ اپنا سامان وہیں چھوڑ لال حویلی اور گوجروں کی گلی میں سے ہو کر شریف پورے کی طرف بھاگنے لگے جی روڈ پر سے گزرتے

ہوئے ایک سکھ ملٹری ٹرک نے ان پر فائرنگ کی جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ غلام محمد پشمینے والے کا جوان بیٹا موسیٰ اپنے ننھے بچے کو گود میں اٹھائے بدرو پار کر رہا تھا کہ گولی لگنے سے دونوں باپ بیٹا شہید ہو گئے۔ پٹھان خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ ریلوے سٹیشن سے ہو کر پیدل ہی لاہور کی طرف چل پڑا تھا۔ اُس قافلے کے تمام افراد کو چھہرٹہ کے پاس سکھوں نے شہید کر دیا۔ ریل گاڑی کی کھڑکی تھوڑی سی اوپر اُٹھا کر میں نے اپنی آنکھوں سے ان افراد کی لاشیں خودرو جھاڑیوں اور درختوں کے پاس بکھری ہوئی دیکھیں۔

امرتسر کے مسلمان اپنے آباؤ اجداد کے مکانوں، گلی محلوں، باغوں اور مسجدوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اُن کے چہرے ویران تھے۔ بالوں میں خاک پڑی تھی اور پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ امرتسر کے آسمان پر دھواں ہی دھواں تھا۔ جلے ہوئے مکانوں، گلی محلوں اور مسجدوں کا دھواں —— قرطبہ کی عبادت گاہیں ایک بار پھر ویران ہو رہی تھیں۔ غرناطہ کے باغات ایک بار پھر اُجڑ رہے تھے۔ ہسپانیہ کے گلی کوچے ایک بار پھر خونِ مسلم سے لالہ زار بن گئے تھے۔ اندلس کی وادیاں تیرہ و تار ہو گئیں۔ انگور کی بیلوں سے چھنتی ہوئی گلیاں مسلمانوں کے خون کی پیاسی بن گئیں۔ امرتسر! —— تیرے پسینے میں ہماری خوشبو تھی۔ تیری سانسوں میں ہماری مہک تھی۔ تیری صبحوں میں ہماری ماؤں کی تلاوت کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ تیری مسجدوں کے ٹھنڈے فرشوں پر ہم نے سجدے کئے۔ تیرے بلند و بالا میناروں پر ہم نے صبح و شام خدا کی عظمت و جلال کی صدا بلند کی۔ ہم نے تجھے اپنا خون دے کر پالا۔ مگر تو نے سنگدل دشمن بن کر اپنے شہر کے گلی کوچوں میں ہمارا خون بہایا۔ ہم تجھ سے اپنے خون کا بدلہ لیں گے۔ ہم اُن بہنوں کو نہیں بھولیں گے جن کا سہاگ تیری گلیوں کی خاک میں دفن ہو گیا۔ ہم اپنی اُن ماؤں کو فراموش نہیں کریں گے جن کے جگر گوشوں کا خون تیرے بازاروں کو لالہ زار کر گیا۔

ہسپانیہ تُو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تُو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

امرتسر! ہم تباہ حال مہاجر بن کر تیرے شہر کے جلتے ہوئے دروازوں سے نکلے تھے۔ اب پُر شکوہ فاتح بن کر تیرے شہر میں داخل ہوں گے۔ اپنے طلوع ہوتے سورج میں ہماری فتح کی روشنی دیکھ! اپنی بے اذاں خاموشی میں ہمارے فاتح گھوڑوں کی یلغار سن!

آگ اور خون کے گلاب

مارچ ۱۹۴۷ء کی تیسری تاریخ تھی۔ میں لاہور سے آنے والی ٹرین پر امرتسر ریلوے اسٹیشن کے ایک نمبر پلیٹ فارم پر اترا تو وہاں کی فضا کچھ ویران ویران محسوس ہوئی۔ حسبِ عادت میں نے امرتسر کا ٹکٹ نہیں خریدا تھا اور اب لائینوں لائن شریف پورے والے پھاٹک کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ٹرین کے انجن کے پاس دو چار آدمی کھڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ مجھے ان کے قریب سے ہو کر پلیٹ فارم کی ڈھلان اُتر کر آگے ریلوے یارڈ میں جانا تھا اور پھر سیڑھیوں والے پل کے نیچے سے گزر کر شریف پورے والے پھاٹک تک پہنچنا تھا۔ ان میں ایک سکھ بھی تھا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔

میں نے کوئی خیال نہ کیا کیونکہ امرتسر میں ہر محرم شب برات پر ہندو مسلم تصادم ہوتا ہی رہتا تھا۔ محرم کے تعزیئے ہندو سکھ اکثریت کے گورو بازار، روشنی ڈیوڑھی، کرموڈیوڑھی اور بازار مائی سیواں سے گزرتے تھے اور ہندو اوپر سے اینٹیں پھینکتے تھے۔ پھر دیکھتے دیکھتے چاقو چھرے نکل آتے۔ لیکن امرتسر ریلوے یارڈ میں سے گزرتے ہوئے میں نے دائیں جانب دیکھا تو دور ایک جگہ دھواں اٹھتا نظر آیا۔ کہیں آگ لگی تھی۔

پھاٹک پر پہنچا تو کچھ لوگ چارپائی اٹھائے بڑے ہسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ یہ ہمارے محلے کے لوگ تھے۔ چارپائی پر ہمارے ہی محلے کا ایک گاڑی بان نوجوان خون میں لت پت پڑا تھا۔ پتہ چلا کہ برج پھولا سنگھ کے نہنگوں اور اکالیوں نے ہمارے کٹڑے پر حملہ کر دیا تھا۔ جب لڑائی ہوئی۔ ہم کٹڑہ مہان سنگھ میں رہتے تھے اور دروازہ مہان سنگھ سے گزر کر اپنے محلے میں جاتے۔ دروازہ مہان سنگھ کے سامنے دائیں جانب کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر سکھوں نے ایک جتھا، نا

قلعہ بنا رکھا تھا جس کا نام برج پھولا سنگھ تھا۔ اس پر امرتسر کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا مگر کہتے ہیں کہ سر سکندر نے سکھوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ وہاں قلعے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس قلعے سے نکل کر سکھوں نے ہمارے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اس سے ایک روز پہلے یا اسی روز لاہور میں پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر سکھوں کے لیڈر تارا سنگھ نے تلوار لہرا کر اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا قبرستان بنا دیں گے مگر پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ اس سے مشتعل ہو کر نہنگوں کی ایک ٹولی تلواریں لے کر ہمارے محلے پر ٹوٹ پڑی۔

مسلمانوں کے پاس کبھی کچھ نہیں ہوتا بس خدا کے بھروسے پر ہی لڑا کرتے ہیں۔ اس روز بھی سکھوں کی تلواروں کا مقابلہ ہمارے محلے کے نوجوانوں نے چارپائیوں کے پایوں سے کیا۔ ہمارے نوجوان زخمی ہوئے۔ پھر اوپر سے نہنگ واپس اپنے قلعے کی طرف بھاگ گئے۔

کٹڑے کے دروازے پر ویرانی تھی۔ پولیس آگئی تھی۔ محلے میں پہنچا تو بڑا جوش و خروش تھا تیسرے پہر میں ہال بازار میں گیا تو ایک تانگہ گول ہٹی کے آگے آکر رکا۔ اس میں زرد کپڑوں والے سکھ نہنگ بیٹھے تھے۔ پیچھے نوبت رکھی تھی۔ نوبت بجا کر لوگوں کو اکٹھا کیا گیا۔ پھر اگلی نشست پر اٹھ کر ایک سکھ نے مسلمانوں کے خلاف ایک تقریر کی اور ماسٹر تارا سنگھ کا حوالہ دے کر کہا۔

"ہم مسلمانوں کا قبرستان بنا دیں گے۔ پاکستان کبھی نہیں بننے دیں گے" یہ گول ہٹی سکھوں کی جنرل مرچنٹ کی دکان تھی اور وہاں تلواریں بھی فروخت ہوتی تھیں میں گول ہٹی کے ایک طرف کھڑا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے گول ہٹی کے سکھ نے تلواریں تانگے میں بیٹھے نہنگوں کی طرف اچھال دیں کہ مسلمانوں کا قتل شروع کریں۔

چوک میں بھگدڑ مچ گئی۔ نہنگوں نے تلواریں لہرا کر تانگے سے چھلانگیں لگائیں اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان نہتے تھے۔ اینٹ، پتھر اور سوڈے کی بوتلوں سے مقابلہ کیا۔ پولیس آگئی۔ بازار بند ہو گیا۔ آدھی رات کو مسلمانوں نے گول ہٹی کو آگ لگا دی۔ امرتسر کی یہ سب سے پہلی بھیانک آگ تھی جس نے گول ہٹی کی تینوں دکانوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

اب شہر میں فسادات کی آگ جگہ جگہ بھڑک اٹھی دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں۔ گلیوں پر لوہے کے دروازے چڑھا دیئے گئے۔ ہندو سکھ محلوں میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا

اور ان کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح مسلم محلوں میں ہندو سکھوں کے مکان لوٹ کر نذر آتش کر دیئے گئے۔ اور پھر ۷۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو امرتسر شہر پر ایک چھوٹے سے جہاز نے پرواز کی اور اشتہار گرائے۔ ان پر لکھا تھا کہ شہر میں ۷، مارچ دو بجے دن سے دو دن تک کے لئے ۴۸ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا ہے اس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹے کا کرفیو ہو گا جس میں دس بجے دن سے دو بجے دن چار گھنٹے کا وقفہ ہو گا۔ خدا جانے کس طرح یہ اشتہار میرے ساتھ ہجرت کے بعد لاہور آ گیا جو اب بھی میرے پاس ایک یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔

پھر چوک پراگ داس کا سانحہ ہوا۔ اس چوک میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ وہاں مسلمانوں کے چند ایک گھر تھے۔ سکھوں نے ان سب کو شہید کر کے ان کے مکانوں کو آگ لگا دی۔ اگلے روز جمعہ تھا مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ وہ جمعہ کی نماز چوک پراگ داس والی مسجد میں پڑھیں گے۔ ہر مسلمان اپنے ساتھ ایک ایک لوٹا لیتا گیا۔ نماز کے دوران سکھوں نے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے لوٹے مار مار کر سکھوں کو بھگا دیا۔ یہاں سے لوٹا ایم مشہور ہو گیا۔ مسجد میں کئی مسلمان شہید ہوئے۔ میں نے حماقت یہ کی کہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے ملکہ کے بت سے آگے جلیانوالہ باغ سے ہو کر بازار بھنگیاں کی جانب نکل گیا جو خالص سکھ آبادی تھی۔ اصل میں ہم امرتسری بڑے دلیر تھے۔ اور اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا تھا کہ سکھ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے یہی وجہ ہے کہ جب تک سارے شہر پر گورکھا اور ہندو سکھ فوج نے قبضہ نہیں کر لیا امرتسری مسلمان ڈٹ کر جگہ جگہ ہندو سکھوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

بازار بھنگیاں سے ذرا آگے گیا تو سامنے گورو رام داس کی سرائے تھی اور اس کے پیچھے سیاہ گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک جگہ ہندو سکھ جمع تھے اور اس عزم کا اظہار کر رہے تھے کہ شہر میں کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے بھی انھوں نے ہندو سمجھا کیونکہ ان دنوں میں کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنا کرتا تھا۔ گورو رام داس کی سرائے سے سکھوں کی ایک ٹولی تلواریں لہراتی، نعرے لگاتی آئی۔ اب مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ پھر بھی میں لوگوں میں کھڑا رہا۔ کیونکہ بھاگنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ مشتعل سکھوں کی ٹولی مسلمانوں کے خلاف نعرے لگاتی باغ رامانند کی طرف نکل گئی۔

میں بظاہر بڑے آرام سے ٹہلتا ٹہلتا وہاں سے نکل کر کسیری باغ میں آیا اور پھر بھاگ کر کوچہ

لگ رہے تھے۔ کوئی رکشا وہاں نظر نہ آیا۔ امرتسر ریلوے سٹیشن پر آتے ہی معلوم ہوا کہ شہر میں اگلے روز صبح دس بجے تک کا کرفیو لگا ہوا ہے۔ پلیٹ فارم پر مجھے اپنا دوست قیوم شیخ مل گیا اس نے کہا کرفیو ابھی ابھی لگا ہے۔ میرا خیال ہے ہم کوشش کر کے محلے میں پہنچ سکتے ہیں۔

قیوم شیخ کا محلہ سیڑھیوں والے پل کے پار تھا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پھر بھی کرفیو لگ چکا تھا لیکن ہم لوگ امرتسر کو اب بھی اپنا گھر ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہم سٹیشن کے یارڈ سے گزر کر دیوار پھاند سیڑھیوں والے پل کی دوسری جانب سڑک پر آ گئے۔ شہر سنسان تھا اُوپر سے ایک آدمی نے کھڑکی کھول کر آواز دی: "اوئے منڈیو! کیوں مرن نوں تھاں لبھدے او"

قیوم شیخ کا محلہ بالکل سامنے تھا۔ ہم بھاگ کر اس کے محلے میں آ گئے۔ ساری رات میں نے قیوم شیخ کے گھر پر بسر کی۔ حالات واقعی بہت خراب ہو چکے تھے قیوم کے گھر کے پیچھے ہندوؤں کا محلہ تھا۔ وہاں سے دو مسلمانوں کی لاشیں آئیں۔ ایک عورت شدید زخمی حالت میں تھی۔ چھت پر مسلمان نوجوان بیٹھے اکا دکا فائر کر دیتے تھے۔ شہر میں صرف ہندو سکھ فوجی پھر رہے تھے۔ صبح کرفیو اٹھا تو میں بھاگ کر اپنے گھر پہنچا۔ گھر والے مجھے دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی ہوئے کہ میں نے اتنا لمبا سفر کیسے طے کر لیا۔ میں نے انہیں الٹی میٹم دے دیا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر تم نے میرے ساتھ لاہور چلنا ہے تیار ہو جاؤ۔ بزرگ میرا مذاق اڑانے لگے۔

"پاگل ہو گئے ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا"

لیکن میں والدہ، آپا جی اور دو چھوٹی بہنوں کو ساتھ لے کر گلی میں آ گیا۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ محلے والوں نے ہمیں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ میاں علی محمد شکاری بوشرٹ پہنے کندھے پر سوبھا سنگھ کے مکان سے ٹوٹی ہوئی بندوق رکھے آ گیا۔

"ملو جی! خلیفے کا گھر بھی لاہور جا رہا ہے"

گلی والے اسی جگہ رہنے کی قسم کھائے ہوئے تھے لیکن میں دہلی سے امرتسر تک کے حالات دیکھ آیا تھا۔ میں نے دروازہ مہان سنگھ میں آ کر ایک مسلمان تانگے والے کو دس روپے پر راضی کیا اور ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے شریف پورے کی طرف دیکھا، سرکلر روڈ والے یوکلپٹس اور شیشم کے درخت خاموش کھڑے تھے اور دور آسمان پر دھواں اٹھ رہا تھا۔ نویں

دھرم سالہ میں گھس گیا جو ہمارے ہی محلے میں تھا۔

اب امرتسر میں ہر طرف آگ اور خون اور لاشیں تھیں۔ انہیں کیا بیان کروں۔ مشرقی پنجاب کے ہر شہر میں یہی خونی کھیل کھیلا گیا۔ لوگ ابھی تک اس آگ کی تپش اور خون کی بو کو بھولے نہیں ہوں گے۔ بازاروں کے بازار جل کر راکھ ہو گئے۔ کرفیو کے ساتھ جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھتی۔ کرفیو کھلتا تو خنجر زنی کی وارداتیں شروع ہو جاتیں۔ میں فروری ۱۹۴۷ء کے آخر میں کولمبو سے امرتسر آیا تھا۔ وہاں میں بھائی جان۔ کیپٹن ممتاز ملک کے ساتھ کام کرتا تھا اور مجھے پھر واپس جانا تھا۔ لیکن فسادات نے مجھے امرتسر میں ہی روک دیا۔ آخر جولائی کے پہلے ہفتے میں کسی نہ کسی طرح فرنٹیئر میل پر سوار ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ وہاں سے مدراس ایکسپریس پکڑی اور مدراس آ گیا۔ یہاں کی فضا بڑی پُرسکون تھی۔ مدراس سے ریل میں بیٹھا تو دھنش کوڈی پہنچ کر سٹیمر میں آدھ گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد سیلون کی بندرگاہ تالی منار اترا۔ یہاں سے کولمبو میل میں سوار ہو کر ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد کولمبو پہنچ گیا۔

جولائی کے آخر میں امرتسر سے بڑی بھیانک خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ پاکستان بن چکا تھا اور امرتسر پاکستان میں نہیں آیا تھا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں کولمبو سے واپس امرتسر کے لئے روانہ ہو گیا۔ دہلی تک تو حالات قدرے ٹھیک ٹھاک تھے۔ دہلی سے آگے آیا تو انبالے کے سٹیشن پر مسلمان برقع پوش عورتوں کو بے سروسامانی کے عالم میں پلیٹ فارم پر ہجوم در ہجوم جمع دیکھا جو اپنے بچوں کو سینے سے لگائے لاہور والی گاڑی کا انتظار کر رہی تھیں۔ سکھ فوجی اور پولیس والے انہیں ہماری گاڑی سے دور رکھے ہوئے تھے۔ لدھیانے کے سٹیشن پر بھی مسلمان مہاجرین کے ہجوم دیکھے جو پریشان حال تھے اور شہر چھوڑ کر وہاں آن بیٹھے تھے۔ یہی وہ مسلمان تھے جو سپیشل ٹرینوں میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے اور جنہیں راستے میں ہی ہندو سکھوں نے کاٹ کر پھینک دیا۔ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر سکھ کرپانیں اور تلواریں لئے پھر رہے تھے۔ یہاں کوئی مسلمان دکھائی نہ دیا۔ یہاں سے گاڑی چلی تو دائیں بائیں کھیت ویران تھے۔ دور کہیں کہیں دیہات میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ کرتار پورہ کے قریب ریلوے لائن کے ساتھ ایک چھوٹا سا گاؤں گزرا۔ اس کے مکانوں میں آگ لگی تھی۔ کھالی کے پاس دو لاشیں اوندھی پڑی تھیں۔ گاڑی مانانوالہ سے گزر کر امرتسر شہر کی حدود میں آ گئی۔ یہاں بھی وہی مرگ آلود فضا تھی۔ شریف پورہ کے سامنے والے امرودوں کے باغ اُجڑے اُجڑے

خانقاہ کے باہر بدرو کے کنارے ایک لاش پڑی تھی، سٹیشن پر مسلمان مہاجرین کے ٹھٹھ لگے تھے، یہ لوگ زیادہ تر لوہگڑہ ہاتھی دروازہ اور دائم گنج سے آئے تھے۔ چھت پر بلوچ رجمنٹ کے جوان مورچے لگائے بیٹھے تھے کیونکہ شیتلا مندر کی جانب سے ہندو فائرنگ کرتے تھے۔ ہوڑہ ایکسپریس آگئی، بڑی مشکل سے ایک ڈبے میں گھس کر کھڑے ہو گئے۔ ٹرین چلی، فائرنگ شروع ہو گئی، ٹرین رک گئی، بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے فائرنگ کا ڈٹ کر جواب دیا، ہندوؤں نے فائرنگ بند کر دی، ٹرین پھر روانہ ہوئی، چھہرٹہ کے پاس میں نے جھاڑیوں میں جگہ جگہ پٹھانوں کی لاشیں دیکھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ مسلمان پٹھان اپنے گدھے لے کر پیدل ہی لاہور کی طرف روانہ ہو گئے تھے، لوگوں نے انہیں منع بھی کیا مگر وہ نہ رکے اور چھہرٹہ کے پاس سکھوں نے حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ گاڑی بڑی ہلکی رفتار سے جا رہی تھی، خالصہ ریلوے سٹیشن پر سکھ کھڑے تلواریں لہرا لہرا کر مسلمانوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ اٹاری تک سکھوں کی گالیوں نے ہمارا پیچھا کیا، واہگہ آیا تو ایک جگہ بانس کے ساتھ پاکستان کا پرچم ہوا میں لہرا رہا تھا لوگوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ گاڑی لاہور کے پلیٹ فارم نمبر ۲ پر آ کر کھڑی ہو گئی، مسلم لیگ کے رضاکار پہنچے ہوئے تھے، روٹیاں اور اچار لے کر آ گئے۔ وہ ایک ایک سے خیریت پوچھ رہے تھے، لاہور کے لوگ بازو کھول کر مہاجرین کو گلے لگا رہے تھے۔ ہمیں ریلوے اسٹیشن کے پوسٹ اینڈ پارسل آفس کی طرف سے باہر نکالا گیا، معلوم ہوا کہ سٹیشن کے سامنے گوردوارہ شہید گنج سے سکھ مسلمانوں پر فائرنگ کر رہے ہیں، سٹیشن کے باہر چھوٹے سے باغ میں تمبو لگا تھا یہاں مہاجرین کو عارضی طور پر ٹھہرایا جاتا اور پھر والٹن کے مہاجر کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا، ہم اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں آ گئے جو لاہور میں ہی آباد تھی۔ باقی چھوٹے بھائی، والد صاحب اور دادا جان اور دو بڑی بہنیں امرتسر میں ہی تھیں، یہ لوگ محض ضد یا ضرورت سے زیادہ اعتماد کی وجہ سے وہاں سے نہیں ہلے تھے، لیکن اب حالات بالکل پلٹا کھا چکے تھے۔ مشرقی پنجاب سے کٹی ہوئی ریلیں آنا شروع ہو گئی تھیں، میں روز ریلوے سٹیشن پر آ کر باقی گھر والوں کا پتہ کرتا، مشرقی پنجاب سے آنے والی ہر گاڑی دیکھتا، جو بھی ریل آتی اس میں سے مسلمانوں کی لاشیں نکلتیں۔ ڈبوں میں خون ہی خون ہوتا۔ فیروز پور سے ایک ٹرین آئی تو میں ایک خالی ڈبے میں چڑھ گیا، سیٹ کے نیچے کوئی شے پڑی تھی، میں نے اسے اٹھایا تو وہ کسی عورت کا کٹا ہوا ہاتھ

شہادت کی انگلی اور انگوٹھا غائب تھا ایک انگلی میں چاندی کی انگوٹھی تھی، ٹرالیاں مسلمانوں کی لاشوں سے بھر بھر کر سٹیشن سے باہر لے جائی جاتیں۔

میرے بعد ہمارے محلے پر کیا گزری وہ بھی سن لیجئے۔ تیرہ اگست کی رات کو ہمارے محلے پر ہندوؤں نے بے پناہ گولیاں چلائیں، ارد گرد کی ساری گلیوں کے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں آ گئے تھے، ہمارے بازار میں میرے ہم جماعت حامد بٹ کا مکان تھا جو ہمارے مشہور باکسر اور کارٹونسٹ محمود بٹ کے بڑے بھائی تھے۔ حامد بٹ اونچا لمبا سرخ و سپید خوبصورت کشمیری نوجوان تھا، کرفیو لگا تھا۔ بس چق اٹھا کر بازار میں جھانکا ہی تھا گورکھے نے گولی چلا دی، گھر میں کیا کہرام مچا ہو گا، اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد کر سکتا تھا۔ حامد بٹ شہید ہو گیا۔ ہمارے محلے کا ایک اور کڑیل جوان چھت پر گیا۔ وہ ننگے بدن تھا۔ صرف دھوتی پہن رکھی تھی، برج پھولا سنگھ سے تھری ناٹ تھری کی گولی آئی اور اس کے سینے سے پار ہو گئی، وہ بھی شہید ہو گیا۔ جالندھر سے مسلمانوں کی مہاجر ٹرین امرتسر کے سٹیشن پر آ کر رکی۔ ایک نوجوان پیاس بجھانے سامنے پلیٹ فارم کے نل پر جانے لگا۔ اس کی ماں اور بہنوں نے ہاتھ جوڑے، واسطے ڈالے کہ خدا کے لئے نہ جاؤ، مگر دلیر نوجوان نہ رکا۔

"ایسا بھی کیا ہے، وہ سامنے تو پانی کا نل ہے پانی پی کر ابھی آ جاتا ہوں۔"

اس نے نلکے پر جا کر پانی کا ایک گھونٹ ہی پیا تھا کہ کسی ہندو یا سکھ کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی کھوپڑی کو توڑ کر نکل گئی، وہ اسی جگہ شہید ہو گیا۔ ماں اور بہنوں کے بین سے ریلوے سٹیشن کے در و دیوار ہل گئے، وہ بین کرتی رہیں، ان کے بھائی کی ان کے بیٹے کی لاش سامنے پلیٹ فارم کے نلکے پر پڑی رہی اور گاڑی لاہور کی طرف چل دی۔

تیرہ اگست کی رات کی قیامت خیز فائرنگ نے ہمارے محلے والوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے سوائے ہماری گلی کے سامنے امرتسر شہر پر ہندو سکھ فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چودہ کی صبح گلی کے دروازے کو توڑ رہے تھے، لوگ گلی کی مشرقی جانب سے گوجروں کے واڑے سے ہو کر سرکلر روڈ پر آ گئے، یہاں ان پر برج پھولا سنگھ کی طرف سے گولیاں چلنے لگیں، غلام محمد رفوگر کا لڑکا موسیٰ اپنے دو سال کے بیٹے کو سینے سے لگائے [illegible] کر رہا تھا کہ گولی کھا کر بدرو میں بچے کے ساتھ گرا اور پھر دونوں میں سے کوئی باہر نہ آ سکا، ہماری گلی کے لوگ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ ہاتھی گراؤنڈ میں سے [illegible]

کی طرف بھاگے جا رہے تھے، سکھ ان پر گولیاں برسا رہے تھے، وہ گر رہے تھے، شہید ہو رہے تھے جو بچ گئے وہ شریف پورے پہنچ کر بے دم ہو کر گر پڑے شریف پورہ مہاجر کیمپ قرار دے دیا گیا تھا اور وہاں بلوچ رجمنٹ کا پہرہ تھا۔ بلوچ جوان ان لوگوں کو فائرنگ کا کور دے رہے تھے مگر بہت دور تھے، کسی نہ کسی طرح ہمارے گھر والے بھی بچ کر شریف پورے پہنچ گئے۔

پورے شہر پر سوائے شریف پورے کے ہندو سکھوں کا قبضہ تھا۔ شہر میں اگر کہیں کوئی اکا دکا مسلمان رہ گیا تھا تو وہ کیمپ میں آکر اپنے فرار کی حیرت انگیز کہانی سناتا، ایک نوجوان ہاتھی دروازے سے بدرو میں داخل ہوا اور چھپتا چھپاتا، بدرو کے اندر سے گزرتا شریف پورے پہنچ گیا، وہ کیچڑ میں لت پت تھا، اور سر اور منہ پر جالے لگے تھے، دروازہ مہان سنگھ سے شاید آخری تانگہ کچھ مسلمان عورتوں کو لے کر شریف پورے کی طرف آرہا تھا کہ برج بھولا سنگھ سے سکھوں نے حملہ کر دیا اور دو عورتیں اٹھا کر لے گئے۔ شریف پورے سے اسی وقت مسلمان جوان غضبناک ہو کر یا علیؓ کے نعرے لگاتے نکلے اور دیوار پھاند کر دشمن کے قلعے میں داخل ہو گئے، کہتے ہیں تنگ سنگھ ان کی جرأت دیکھ کر ہی ششدر رہ گئے۔ یہ جیالے جوان دونوں خواتین کو واپس لے آئے لیکن خود سخت زخمی حالت میں تھے۔ یہ آتش نمرود میں نہتے ہی کود پڑے تھے۔ مگر ان کے جذبے کی سچائی انہیں سرخرو کر کے واپس کیمپ میں لے آئی۔ شریف پورے سے مہاجرین کو لے کر ٹرینیں پاکستان کی طرف روانہ ہونے لگیں ایک ریل میں بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح ہمارے باقی گھر والے بھی لاہور پہنچ گئے۔

یہاں آکر ایک نئی زندگی، ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا، یہ ایک الگ کہانی ہے، پاکستان کا تاریخی پس منظر کیا ہے! یہ کن سیاسی عوامل کا نتیجہ ہے! امرتسر ہم سے کیوں چھن گیا! اس پر بہت کچھ لوگوں نے لکھا ہے جو مجھ سے زیادہ سیاسی اور دینی بصیرت رکھتے ہیں اور بہت کچھ لکھا جائے گا میں تو ایک افسانہ نگار ہوں، میں تو صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ امرتسر کی ٹھنڈی کھوئی پر بیٹھا ہوا ہندو کنوئیں کا ٹھنڈا پانی مسلمانوں کو اوک میں پلاتا تھا اور ہندو سکھوں کو شیشے کے گلاسوں میں پلاتا تھا، شانتی سروپ میرا گہرا دوست تھا لیکن میں اس کے گھر کے باورچی خانے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ درشنی ڈیوڑھی والا سکھ غیر مسلموں کو تانبے کے گلاسوں میں اور مسلمانوں کو بانس کی نلکی سے پانی پلاتا تھا جس طرح جانوروں کو دوا پلائی جاتی ہے۔ شانتی سروپ نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کبھی میں اس کے گھر میں چائے پی لوں تو

اس کی برہمن ماں میرے جھوٹے کپ کو توڑ دیا کرتی ہے کیونکہ میں مسلمان ہوں، پاکستان تو امرتسر کے محلے محلے میں بنا ہوا تھا، اس کے لئے کہاں کی سیاسی بصیرت اور کہاں کا تاریخی پس منظر، آپ آج کسی ہندو کے ساتھ اس کے گھر میں چوبیس گھنٹے بسر کریں، پچیسویں گھنٹے میں آپ اپنے آپ ایک پاکستان کی ضرورت محسوس کرنے لگیں گے۔ شانتی سروپ میرا بچپن کا دوست تھا، اس کی ماتا مجھ سے پیار کرتی تھی لیکن ہمیشہ مجھ سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو کر، منہ پر کپڑا رکھ کر بات کیا کرتی تھی، کیونکہ میں مسلمان تھا، پاکستان بننے میں تو شانتی سروپ کی ماں کا بڑا گہرا ہاتھ ہے، اور اس سکھ کا بھی جو درشنی ڈیوڑھی میں مسلمانوں کو بانس کی نلکی سے پانی پلایا کرتا تھا یہ لوگ آج بھی ویسے ہی ہیں، آج بھی پاکستان سے کوئی مسلمان ان کے پاس چلا جائے تو پرانے صندوق میں سے بانس کی نلکی نکال لیتے ہیں، آج بھی شانتی سروپ کی ماتا آپ سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو کر بات کرے گی۔ اس نے منہ پر کپڑا رکھا ہو گا جیسے آپ اچھوت ہوں۔

ان باتوں کو کہاں تک دہرایا جائے، پھر بھی اگست کے مہینے میں جب تیز دھوپ لگتی ہے اور تاریک بھیگی ہوئی راتیں سنسان ہو جاتی ہیں تو مجھے نعروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، آگ میں جلتی لاشوں کی بو آتی ہے۔ میں ان عورتوں کی چیخیں سنتا ہوں جنہیں جالندھر سے لاہور آتے قافلے میں سے اغوا کیا جا رہا ہے، میں اس عورت کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا ہوں جو فیروزپور سے لاہور آنیوالی ریل کے ڈبے میں پڑا تھا، اور جسے میں نے اٹھا کر پھینک دیا تھا، کبھی اس ہاتھ نے کسی کا ہاتھ تھام کر ہمیشہ ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہو گا کبھی اس ہاتھ نے اپنے معصوم بچے کا یا بھائی کا منہ دھلایا ہو گا، کبھی اس ہاتھ نے قرآن شریف جزدان میں لپیٹ کر چھتی پر رکھا ہو گا، کبھی یہ ہاتھ دعا کے لئے بھی اٹھا ہو گا، کبھی یہ ہاتھ باپ کی انگلی پکڑ کر گھر سے باہر نکلا ہو گا، کبھی اس ہاتھ پر مہندی بھی لگی ہو گی۔ لیکن اب خون آلود خالی ڈبے کی سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔ کوئی اس ہاتھ کو پکڑنے والا نہیں، کوئی ہاتھ اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لینے والا نہیں۔

الوداع! میرے خوبصورت اداس لوگو!
ایک بار پھر الوداع! ہزار بار الوداع!
کتنے حسین اور خوشبودار تھے تمہارے گلاب کے پھول!

امرتسر میں ۱۴ اگست

ایک نیم سرکاری ثقافتی ادارے میں چودہ اگست ۱۹۴۷ کی تقریب منائی جارہی تھی۔ چودہ اگست کی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ لاہور شہر کی سب سے جھنگی، سب سے ہموار اور سب سے خوبصورت سڑک کی آٹھ منزلہ عمارت کی چھٹی منزل کے ایئرکنڈیشنڈ ہال میں فوم کے گدوں والی آرام کرسیاں بچھی تھیں۔ ڈائس پر میز رکھی تھی جس پر شیشے کے چمکیلے جگ میں ٹھنڈا پانی تھا اور گلدان میں کارنیشن کے زرد پھول سجے تھے۔ بیل باٹم پاجاموں، آدم جی کی لونوں، سمارٹل کے پرنٹوں، کمو ہیرا کاجل اور جیولری کے چمکتے ہیروں اور ٹیرڈون کے سوٹوں، امریکی کوٹوں، اطالوی سینڈلوں اور فرنچ پرفیومز کا ہجوم تھا۔ ٹائیوں کی کسی ہوئی گرہیں اور ہارڈ کالروں میں پھنسی ہوئی گردنیں۔ جبڑوں تک آئی ہوئی بالوں کی قلمیں، انگلش پونڈز کے دمکتے ہوئے کف لنکس اور ہال میں رچی ہوئی فریش ایئر کی رومانٹک مہک ــــ دبی دبی سرگوشیاں، پروٹوکول کے تکلفات، وی آئی پیز کے ٹھنڈے بے حس چہرے اور پی آئی اے کے نم دار ٹھنڈے کاندول سے پیشانیاں پونچھتی بیگمات اور ان کی جائزہ لیتی بے باک نگاہیں ــــ اب گیسٹ آف آنر تشریف لا رہے تھے۔

میں جس کرسی پر بیٹھا تھا وہ میرے قریب سے گزرے ــــ ان کے امریکی ٹیرڈون کے سوٹ سے یوڈی کلون کی خوشبو آرہی تھی۔ وہ کرسیٔ صدارت پر تشریف فرما ہوئے۔ تالیاں۔ سیکرٹری صاحب نے تقریب کی مختصراً غرض و غایت بتائی۔ چودہ اگست کو دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ایک بیل باٹم نے بالوں کو جھٹک کر سات سو روپے کی ساڑھی سے پوچھا ”ممی، چودہ اگست کو میں کہاں تھی؟“

ساڑھی نے گلے کا نیکلس درست کرتے ہوئے کہا ”بے بی! تم تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔“

بیل باٹم نے چیونگم دوسرے جبڑے میں گھما کر پوچھا ”ممی! تم کہاں تھیں؟“

ساڑھی نے ہونٹوں کے ریڈ انڈین کلر پر آیا ہوا پسینہ ٹھنڈے ٹشو پیپر سے پونچھتے ہوئے کہا ”ڈیل بے بی! آئی تھنک، میں ان دنوں یو کے میں تھی۔“

”خواتین و حضرات! آج چودہ اگست ہے۔ اس روز ہم نے ہندو سامراج کو شکست دے کر اپنے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان حاصل کیا تھا آج کا دن ہماری ہسٹری کا بڑا اہم دن ہے۔ خواتین و حضرات!.....“ مقرر نے ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ پیے۔ ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خوشبودار سفید رومال سے پونچھا۔ سیاہ چشمہ درست کیا اور ذرا کھنکار کر دوبارہ تقریر شروع کردی ــــ ایک سلیولیس لڑکی نے اپنا گوگو چشمہ اتارتے ہوئے دوسری لڑکی سے پوچھا۔

دوسری لڑکی نے کمر کے گرد کسی ہوئی سنہری زنجیر کو اور کستے ہوئے پوچھا۔

(تمہارا مطلب کیا ہے؟)

پہلی لڑکی نے ہونٹ بھینچے۔ بھنوئیں اوپر اٹھائیں اور گردن کو جھٹک کر کہا۔

(میرا مطلب ہے، موسیقی اور رقص)

”خواتین و حضرات! چودہ اگست ہمیں ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ ہم نے پاکستان لاکھوں مسلمان بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ ہم آگ اور خون کا دریا عبور کرکے یہاں آئے تھے۔“

مقرر نے جھک کر سیکرٹری کے کان میں کچھ کہا۔ سیکرٹری صاحب نے دوسرے کے کان میں کھسر پھسر کی۔ دوسرے کے ہونٹ تیسرے کے کان کے پاس گئے اور اس نے فوراً جیب سے ڈائری نکال کر مقرر کی تقریر کے اقتباس لینے شروع کر دیئے۔ اب صاحبِ صدر کی باری تھی۔ سیکرٹری صاحب دس منٹ تک صاحب صدر کی سوشل حیثیت، ان کی علمی قابلیت، ان کے تمغۂ امتیاز، ان کے ورلڈ ٹور اور ان کی خوش خلقی کے بارے میں رطب اللسان رہے۔ صاحب صدر تالیوں کی گونج میں اُٹھے۔ ٹائی کی گرہ ٹھیک کی۔ مائیک کا منہ اپنی طرف کیا۔ ذرا کھنکارے۔ ذرا مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہو کر فرمایا ”خواتین و حضرات.....“ اس کے ساتھ ہی پریس فوٹوگرافروں

کے فلیش چمک اٹھے۔ ٹیلی ویژن کی تیز روشنیاں اور ٹی وی اور انفارمیشن کے کیمرے آن ہو گئے۔ بیل بانٹوں نے سانس روک کر پوز بنا لیے۔ سازندوں نے منڈھی ہوئی بھویں ترچھی کر لیں۔ فوٹوگرافر گھوم گھوم کر صاحب صدر اور خواتین و حضرات کی مختلف تصویریں لینے لگے اور ریڈیو کا نمائندہ ریکارڈر کی ٹیپ آن کر کے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اور پھر میں نے چودہ اگست کے بیم کو دیکھا۔ اس کے بالوں میں خاک پڑی تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں، زخمی پیر سوجے ہوئے تھے، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ چکی تھیں اور نصف کٹی گردن سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔ اس نے سٹیج پر کھڑے ہو کر خواتین و حضرات کو دہشت زدہ، پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اور پھر سٹیج سے نیچے گر کر شہید ہو گیا۔ اس کی ویران آنکھوں میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اور اس کی بچی اس کی لاش پر بیٹھی اپنے ابو کو رو رو کر آوازیں دے رہی تھی اور پھر ایک سکھ کی تلوار نے اس بچی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔ موت اور دہشت کا سناٹا ـــــ فلیش بلب جلتے رہے۔ ٹی وی کی روشنیاں چمکتی رہیں صاحب صدر ثانی کی ٹائی بار بار درست کر کے تقریر کرتے رہے۔ پریس والے نوٹس لیتے رہے۔ خواتین و حضرات ایئرکنڈیشنڈ ہال کی خوشبودار فضا میں بیٹھے دیواروں پر سجی ہوئی ایبسٹریکٹ تصویروں کو دیکھ کر بور ہوتے رہے۔ کسی نے چودہ اگست کی خون آلود لاش کو سٹیج سے گر کر شہید ہوتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس کی معصوم بچی کے پھول جیسے جسم کو سکھ کی تلوار سے دو ٹکڑے ہوتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس کی پُر اذیت آخری چیخ نہ سنی۔ کسی نے اس کی چیخ کے بعد کا سناٹا محسوس نہ کیا۔

۔ خواتین و حضرات! ۔۔۔ خواتین و حضرات! ۔۔۔۔

میں نے چودہ اگست کو آج بائیس سال کے بعد بھی دیکھا ہے اور کل بائیس برس پہلے بھی دیکھا تھا۔ کل ہم نے اسے بے کسی کے عالم میں بے کفن، لحد میں اتارا تھا اور آج ہم نے اس کی قبر پر دس دس منزلہ عشرت گاہیں تعمیر کی ہیں جن کی نیم تاریک رقص گاہوں میں یورپی موسیقی کی دھن پر مریل بدن تھرکتے ہیں اور ایئرکنڈیشنڈ باروں میں بادۂ ناب کے جام چھلکتے ہیں۔ چودہ اگست شہید ہو گیا۔ پاکستان کے نام پر، اسلام کے نام پر شہید ہو گیا اور ہم نے اس شہید کی مقدس قبر کو فروخت کر دیا۔ اپنی رقص گاہوں اور عشرت کدوں کے عوض فروخت کر دیا۔ ہم نے اس کی یاد

میں قطب مینار سے بھی اونچے یادگار مینار بنائے اور خود اس کی سیڑھیوں میں افیم کی پینک میں گر کر دم توڑ دیا۔ ہم نے چودہ اگست کی ہڈیوں کو اٹھا کر ایئرکنڈیشنڈ ثقافتی اداروں کے سپرد کر دیا۔ جہاں انہیں ڈیکوریشن پیس بنا کر دیواروں پر سجا دیا گیا۔۔۔

چودہ اگست نے کفر کی اندھیری رات میں برہمنی سمندر کے خونیں طوفان سے نکال کر برصغیر کے مسلمانوں کو ساحلِ پاکستان تک پہنچایا، لیکن ہم نے ساحلِ مراد پر پہنچنے کے بعد اس لائٹ ہاؤس کی روشنیاں گل کر دیں۔ ہم نے اپنے جہازوں میں آگ تو لگا دی، لیکن ہسپانیہ فتح نہ کر سکے۔ ہم چودہ اگست کی لاش سے گزر کر آ رہے ہیں اور اس کی بے گور و کفن لاش کے پاس اس کی بچی کی لاش کے ٹکڑے بھی بکھرے پڑے ہیں اور آسمان پر ابھی تک گدھیں منڈلا رہی ہیں۔۔۔

چودہ اگست کے مقدس شہید کے گل رنگ خون کی لکیر میرے قریب سے ہو کر گزرنے لگی ہے اور میں اس ثقافتی ادارے کے ہال میں بیٹھا اس خون کی لکیر کے ساتھ ساتھ ماضی کے دھندلے جنگلوں میں نکل آیا ہوں۔ اس جنگل میں کوئی درخت نہیں، درختوں پر کوئی شاخ نہیں، شاخوں پر کوئی پھول نہیں ـــــ یہ کیسا جنگل ہے! خواتین و حضرات! یہ کیسا جنگل ہے۔۔۔

اس جنگل میں ایک دریا بہتا تھا۔ اس دریا کے کنارے اگست کی بارشوں میں مسلمان مہاجرین کا ایک قافلہ آ کر رکتا ہے۔ یہ لوگ دیارِ ظلم سے دیارِ امن کی جانب ہجرت کر رہے ہیں۔ تھکے ہارے بے کس و بے بس، دہشت زدہ، حیرت زدہ، پاکستان چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ چالیس میل چالیس ہزار میل ہو گئے ہیں۔ دریا کا نام بیاس ہے۔ برسات میں دریا میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ مشرقی پنجاب کے حسین شہروں، قصبوں، دیہاتوں، شہروں کے گلی کوچوں، گلیوں کے پرانے مکانوں کی پُر اسرار نیم روشن ڈیوڑھیوں اور ڈیوڑھیوں کی صدیوں پرانی دہلیزوں سے نکالے ہوئے مسلمان بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہے۔

اچانک ایک طرف سے حملہ ہوتا ہے۔ گولیاں، برچھے، کرپانیں، اسلحہ، دیہاتی سکھ اکالی کم ہندو، مسلمانوں کے ازلی دشمن ہندو ـــــ ہر طرف شور غل چیخ پکار ہے۔ مہاجرین شہید ہو رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، زخمی ہو کر تڑپ رہے ہیں، جو مقابلہ کرتا ہے وہ بھی شہید ہو جاتا ہے جو مقابلہ نہیں کرتا وہ بھی شہید ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو پکار رہا ہے۔ ماں بیٹی کو آوازیں دے رہی ہے

خاوند بیوی کو بچاتے ہوئے قتل ہو رہا ہے۔ بیوی خاوند کی آبرو پر قربان ہو رہی ہے۔ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر کھیتوں کی طرف بھاگتی ہے۔ دو سکھ تلواریں لہراتے اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔ بچہ ماں کی گود سے چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ ماں بے ہوش ہو جاتی ہے اور سکھ بے ہوش ماں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اب وہ مر جائے گی۔ رضیہ، ثریا اور تاج بی بی کی حیثیت سے مر جائے گی۔ اب وہ کسی معراج دین، کرم داد اور جمال خان کو جنم نہیں دے گی۔ اب اس کا نام ہر گو بند کور ہوگا اور اس کے بچوں کا نام درشن سنگھ اور پریتم کور ------

"خواتین و حضرات ـــــ میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ قوم کی خدمت کو میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے اور میں اپنے فرائض کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ مثلاً میں آج رات کو ٹیلی ویژن پر اپنی آج کی صدارتی تقریب کا پروگرام بڑے شوق سے دیکھوں گا اور ـــــ اور رات کو ریڈیو نیوز ریل پر اپنی آواز بھی سنوں گا اور صبح اخباروں میں اپنی تصویریں بھی ضرور دیکھوں گا ـــــ خواتین و حضرات! چودہ اگست کا دن ہمیں یہی سبق سکھاتا ہے کہ ـــــ

کہ ۔۔۔۔"

صاحب صدر جھک کر سیکرٹری کے کان میں کچھ کہتا ہے سیکرٹری دوسرے آدمی کے کان میں کچھ کہتا ہے اور وہ فوراً ٹھنڈے پانی کا نیا بلوریں جگ لا کر میز پر رکھ دیتا ہے۔ چمکیلے جگ میں ریفریجریٹر کی بوتلوں سے نکالا ہوا شفاف پانی چمک رہا ہے ـــــ اور گلدان کے زرد کارنیشن پھولوں پر اس کا عکس بکھر رہا ہے اور میں دریائے بیاس کے گدلے، مٹیالے خونیں، سیلابی بہاؤ میں مارتے پانیوں کی طرف ایک کنواری مسلمان مہاجر لڑکی کو ننگے سر، ننگے پاؤں بھاگتے دیکھ رہا ہوں ایک ہندو تلوار لیے اس کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے۔ درندگی ہے۔ بربریت ہے ـــــ مسلمان لڑکی کے کپڑے تار تار ہیں۔ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے دریا کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ پاکستان کی طرف بھاگی جا رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ ایک بھنور ابھرتا ہے اور پھر دریا کی کف اڑاتی لہریں اس پاکباز مسلمان لڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی گہرائیوں میں گم کر لیتی ہیں۔ "پہنچ گئی اپنے پاکستان" ـــــ ہندو نفرت سے قہقہہ لگا کر چیختا ہے ۔۔۔۔

دریا کی لہر نے سیپ بن کر مسلمان مہاجر لڑکی کے ناموس کا موتی کو اپنے سینے میں چھپا لیا ہے۔

۱۴۔ اگست، ۱۹۴۷ کو میں پنجاب میل میں سوار دلّی سے امرتسر آ رہا ہوں، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں پر وحشت و ویرانی کی مہریں لگی ہیں۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے شہروں کے ریلوے پلوں اور پھاٹکوں سے گزرتی ہے تو ٹیڑھی میڑھی سڑکیں سنسان نظر آتی ہیں۔ مکانوں کی منڈیروں پر گدھیں بیٹھی ہیں۔ گاڑی پنجاب میں داخل ہوتی ہے تو اس ویرانی اور وحشت زدگی کی فضا میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسی کھیت میں ہل نہیں چل رہا۔ کچے مکانوں پر موت کے بھیانک سائے منڈلا رہے ہیں۔ لدھیانہ، پھگواڑہ اور جالندھر کے پلیٹ فارموں پر سفید برقع پوش مسلمان عورتوں اور بچوں اور پریشان حال مردوں کے ہجوم سہمے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہندو اور سکھ ننگی تلواریں لیے دندناتے پھر رہے ہیں ۔۔۔۔

گاڑی امرتسر شہر کے مضافات میں داخل ہو رہی ہے مانانوالہ سٹیشن گزر گیا ہے۔ اب دائیں جانب چالیس کھوہ گزر رہے ہیں۔ بڑی نہر نیم سرخ برساتی پانی سے لبالب بھری ہے۔ مگر وہاں مسلمان امرتسری نوجوان قورمے کے دیگچے چڑھائے، آموں کے ٹوکرے نہر میں لٹکائے، نہر میں چھلانگیں لگاتے کہیں نظر نہیں آ رہے۔ اب بٹالہ اور پٹھانکوٹ کو جاتی ریلوے لائن مین لائن سے آن ملی ہے۔ شریف پورے کے امرودوں، ناشپاتیوں، لوکاٹوں اور آلوچوں کے باغ اجڑے ہوئے ہیں۔ شریف پورے کے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے مسلمان "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگا رہے ہیں۔ مسلم ہائی سکول اور بھائیوں والے باغ کا ریلوے پھاٹک بھی ویران ہے۔ دور بھائیوں والی نہر کی سرخ اینٹوں والی پلیا ایک پل کے لیے دکھائی دے کر پیچھے گزر جاتی ہے۔ گرمیوں کی دوپہروں میں ہم سکول سے بھاگ کر اس نہر پر نہانے آیا کرتے تھے۔ ساری دوپہر پلیا پر سے مٹھیاں چوم چوم کر نہر میں چھلانگیں لگاتے گزر جاتی۔ پھر ہم امرودوں کے باغوں میں گھس جاتے اور کچے پکے امرود توڑ توڑ کر کھاتے ۔۔۔۔

نہر گزر گئی۔ یہ اس نہر کی آخری جھلک تھی۔ اس کے بعد پھر اس نہر میں نہانا نصیب نہ ہوا۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی تیز دھوپ والی دوپہر کو، بغل میں کتابوں کا چھوٹا سا بستہ لٹکا کر لاہور سے نکلوں اور سیدھا اس نہر کی پلیا پر جا کر مٹھیاں چوم کر چھلانگ لگا دوں اور پھر کبھی سر باہر نہ نکالوں ـــــ مگر یہ رجعت پسند خیال ہے۔ شکست خوردگی کے احساس کا پرتو ہے۔ ہمیں تو زندگی کی دوڑ میں آگے ہی آگے

بڑھتا ہے۔ پرانی نہر ہم سے چھٹ گئی ہے تو نئی نہریں پہاڑوں سے کاٹ کر لانی ہیں۔ خسرو پرویز کے لیے نہیں، اپنی شیریں کے لیے مستقبل کی درخشانی کے لیے.....

پنجاب میل کمپنی باغ والے پھاٹک سے گزرتی ہے۔ بائیں جانب عیدگاہ کا تالاب نظر آتا ہے۔ جامن کے درخت کالی کالی موٹی جامنوں سے لدے ہوئے ہیں، لیکن لڑکوں کی ٹولیاں غائب ہیں۔ پنجاب میل امرتسر کے سٹیشن میں داخل ہوتی ہے۔ تینوں پلیٹ فارموں پر مسلمان عورتوں اور بچوں کے ہجوم ہیں۔ یہ لوگ دائم گنج اور بیٹی گھر کی مسلمان آبادی ہے، جو کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اچانک سیتلا مندر کی جانب سے ان مسلمانوں پر فائرنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک عورت کی چیخ بلند ہوتی ہے۔ عورتوں کی آہ و بکا اور بچوں کی چیخ پکار سے وہاں کہرام مچ جاتا ہے۔ امرتسر شہر میں کرفیو لگنے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں۔ سٹیشن پر مجھے میرا ایک دوست مل جاتا ہے۔ ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ساری رات پلیٹ فارم پر گزارنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے اپنے محلوں میں جانے کا خطرہ مول لیں۔ ہم سٹیشن سے باہر نکلتے ہیں۔ جاٹ اور گورکھا سپاہی ویران سڑک پر گھوم رہے ہیں۔ ہم سیڑھیوں والے پل سے اترتے ہیں تو ایک مکان کی کھڑکی کھلتی ہے اور ایک گردن نمودار ہو کر کہتی ہے "اوئے منڈیو! چھیتی کرو اوئے۔ کرفیو لگن والا جے".....

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے، گول باغ کے پہلو سے ہو کر ایم اے او کالج کے عقب میں رکتے ہیں تو کرفیو کا ہوٗٹر چیخنے لگتا ہے۔ میرے دوست کا مکان اسی محلے میں تھا۔ میں بھاگ کر اپنے دوست کے مکان میں گھس جاتا ہوں۔ سارے امرتسر میں ہر طرف آگ لگی ہے۔ ہندو سکھوں کے محلوں سے مسلم محلوں پر مسلسل فائرنگ کی جا رہی ہے۔ امرتسر کے مسلمان سپاہیوں سے اسلحہ لے لیا گیا ہے۔ شہر میں بہت تھوڑی گورا فوج ہے باقی ساری فوج ہندو ڈوگرہ اور گورکھا سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ صرف ریلوے سٹیشن اور شریف پورے میں بلوچ رجمنٹ کے جوان امرتسر کے نہتے اور دشمنوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کی حفاظت کر رہے ہیں.....

میرے دوست کے مکان کے آگے ہندوؤں کی آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ اُدھر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی ہے، بم چل رہے ہیں۔ اس کشادہ مکان میں محلے کی ساری عورتیں اور بچے جمع ہیں۔ عورتوں کے رنگ زرد ہیں اور بچے دہشت سے گنگ ہو گئے ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں

کر لگے ملے گیا ہو گا۔ ایک نوجوان لڑکی کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے۔ ساتھ والی گلی میں گوجر کے مکان میں ایک بوڑھے مسلمان کی لاش پڑی ہے مگر وہاں کون جائے!

زندوں کا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے مُردوں کو کون سنبھالے!

رات کے نو بجے اچانک بجلی فیل ہو جاتی ہے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ گولیوں اور بموں کے دھماکے بڑھ جاتے ہیں۔ مکان میں عورتیں اور بچے اونچی آواز میں انہیں ڈانٹتے ہیں۔ "چپ رہو۔ جب تک ہم زندہ ہیں۔ تمہاری ہوا بھی کوئی کافر نہیں دیکھ سکتا"۔۔۔

اگلے روز صبح نو بجے کرفیو کھلتا ہے۔ میں اپنے محلے کی طرف بھاگتا ہوں۔ امرتسر کی فضا یکسر بدل گئی ہے۔ مسلم آبادی اپنے اپنے گلی کوچوں میں قید ہو کر رہ گئی ہے اور شہر پر ہندو سکھ فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہال بازار ویران ہے مسلمانوں کی دکانیں لُٹی پڑی ہیں۔ میں گھیوں گھیوں ہوتا بجلی والے چوک میں جا نکلتا ہوں۔ دُور سے ایک گورکھا فوجی مجھے دیکھ کر آگے بڑھتا ہے۔ میں لپک کر دوسری گلی میں گھس جاتا ہوں۔ اگرچہ کرفیو کھلا ہے لیکن جو بھی مسلمان اپنے محلے سے باہر نکلتا ہے۔ اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ میں چھپتا چھپاتا اپنی گلی میں جا نکلتا ہوں۔ پکی گلی، گلی نگر دین اور گلی غزنی کے سارے مسلمان اٹھ کر ہماری گلی میں آ گئے ہیں۔ گلی رنگریزاں کی مسجد میں مسلمان عورتوں کو بے دریغ شہید کر دیا گیا اور بچوں کو چھتوں پر سے بجلی کے تاروں پر اچھال دیا گیا۔ یہ لوگ بڑی مشکل سے جانیں بچا کر پہنچے ہیں۔

" بازار بکرداناں میں مسلمانوں کو قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور سکھوں نے ہندو فوجیوں کی زیر نگرانی ایک ایک کر کے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جو لڑکا سب سے آخیر میں کھڑا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو گردنیں کٹتے دیکھیں تو چپکے سے کھسک کر جناب ماسٹر اللہ بخش مرحوم کے مکان والے کنوئیں میں کسی نہ کسی طرح اتار رہا۔ اگلے روز بلوچ رجمنٹ کا ایک ٹرک مسلمانوں کو وہاں سے نکالنے آیا تو اس نے کنوئیں ہی چلانا شروع کر دیا۔ اس لیے نیم جاں حالت میں ٹرک میں ڈال کر شریف پورہ کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

گھر والے میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھا تو جان میں جان آئی۔ لیکن سوال

یہ تھا کہ گلی میں سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کیسے پہنچا جائے؟ چودہ اگست کی رات آ گئی۔ اس رات امرتسر میں جتنی گولی چلی، کہتے ہیں سارے فسادات میں اتنی گولی نہیں چلی تھی۔ ایک ایک سیکنڈ کے وقفے کے بعد تھری ناٹ تھری کا فائر ہو رہا تھا۔ دستی بموں کے دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مسلمانوں کی لاشیں ہندو سکھوں کے گلی کوچوں میں بے گور و کفن بکھری پڑی تھیں۔ فضا میں بارود، جلی ہوئی لاشوں مٹی اور تارپین کے تیل کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔ بوڑھے رمزی ستار کا جوان بیٹا سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ وہ چوک پراگداس کی مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے گیا اور وہیں مسجد کے صحن میں شہید ہو گیا۔ بڈھا باپ اپنے بیٹے کی لاش بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ گلی والے نلکے کے پاس چارپائی پر بیٹھا اپنے جوان بیٹے کے غم کو سینے سے لگائے روتا رہا۔ چودہ اگست کی رات کو گولیوں، بموں اور عورتوں بچوں کی چیخ پکار میں وہ بار بار روتے ہوئے یہی کہتا: جو مر گئے وہ اچھے رہے میرے مولا!

رات کے تین بجے فائرنگ کی آوازیں تیز ہو گئیں اور ہندو سکھوں کے نعرے زیادہ قریب سنائی دینے لگے۔ پو پھٹے گولیاں ہمارے مکانوں کی چھتوں اور ممٹیوں سے ٹکرانے لگیں۔ لوگ پریشان ہو گئے۔ دن چڑھتے ہی گورکھا اور سکھ فوجیوں نے ہماری گلی کے آہنی دروازے پر بم مارا۔ ایک زور دار دھماکا ہوا اور دروازہ ایک طرف کو جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں، مرد بچے اور بوڑھے سبھی گلی کے دوسرے تنگ دروازے ہی سے نکل کر شریف پورے کی طرف بھاگنے لگے۔ اب گلی کے سرے پر مکانوں آگ لگا دی گئی اور سکھوں کے نعرے بلند ہوئے۔ سکھ اور ہندو غنڈے فوج کی مدد سے گلی میں داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے قتل عام اور لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ میں نے گلی میں بھاگتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ دو سکھ تلواروں سے بوڑھے رمزی پر وار کر رہے تھے اور وہ دونوں کمزور ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان کے واروں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ میری والدہ، بہنیں، بھائی، سب کی والدائیں، بہنیں اور بھائی بے بسی کے عالم میں شریف پورے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ راستے میں جی ٹی روڈ پڑتی تھی۔ یہاں سے ان مسلمانوں پر ایک سکھ فوجی ٹرک سے فائرنگ ہوئی۔ موچی، شال مرچنٹ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے بھاگا جا رہا تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ اس پر پڑی۔ وہ اپنے معصوم بچے سمیت شہید ہو کر سڑک پر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔۔۔

شریف پورے کی جانب سے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی اگر بلوچی جوان سکھ فوجیوں کے ٹرک پر فائرنگ نہ کھولتے تو شاید ہی ہماری گلی کا کوئی مسلمان زندہ بچتا شریف پورے نے کیمپ کی شکل اختیار کر لی۔ چونکہ یہ مسلم آبادی تھی۔ اس لیے اسے کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا اور باہر جی ٹی روڈ کی طرف بلوچ رجمنٹ نے پوزیشن سنبھال لی۔ اس رجمنٹ کے جوانوں کو اب امرتسر شہر میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ شہر پر ہندو سکھوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ امرتسر شہر کے گلی کوچوں، حویلیوں اور مکانوں میں سوائے مسلمانوں کی لاشوں اور بکھرے ہوئے سامان کے اور کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کے مکان جل رہے تھے۔ امرتسر کے بہادر جیالوں کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپانے کے بعد یہ شہر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔۔۔۔

مسلمان امرتسر جل رہا تھا۔۔۔۔

مسجدوں، مکانوں کے دیوان خانوں، چھتوں، ممٹیوں، سیڑھیوں اور آنگنوں میں مسلمان عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی خاک و خون میں اٹی ہوئی لاشوں کے ساتھ جل رہا تھا۔ ان میں حامد بٹ بھی تھا۔ اونچا لمبا، گورا چٹا کشمیری نوجوان اور ہاکی کا بہترین کھلاڑی ۔۔ اپنے جانثار چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کا لاڈلا بھائی اور میرا دوست ۔۔ بہترین دوست ۔۔ ان میں مولوی طاہر شاہ بھی تھا۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ، نیک دل، اسلام کے نام پر ہی شہید ہو گیا ۔۔ ان میں اس ایف اے پاس لڑکی کی لاش بھی تھی، جس کو سکھ اور ہندو غنڈے اٹھا کر رام تلائی کے مندر میں لے گئے تھے اور جہاں اس نے مندر کی سب سے اونچی چھت پر سے چھلانگ لگا کر اپنی جان اور آبرو پاکستان کی عزت و آبرو پر قربان کر دی تھی۔۔۔۔

ان میں کئی حامد بٹ، کئی طاہر شاہ، کئی بوڑھے رمزی اور کئی عفت مآب بہنیں، بیٹیاں اور مائیں تھیں، ان کی خون آلود نعشیں تھیں۔ ان کے معصوم بچوں، بھائیوں، بہنوں اور بیٹوں کی نعشیں تھیں۔ اپنے دامن میں ہمارے یہ گوہر ہائے گراں مایہ لیے امرتسر جل رہا تھا۔ مسلمان امرتسر، مسلمان جالندھر اور مسلمان لدھیانہ، فیروزپور، ہوشیارپور اور روہتک و حصار، جموں و کشمیر جل رہا تھا اور ہجرت کرنے والے بے یار و مددگار مہاجروں کے قافلے لٹتے، کٹتے، گاڑیوں میں، ٹرکوں میں، ٹرینوں میں، پاپیادہ پاکستان کی طرف، دیارِ اسلام کی طرف، دیارِ امن و انصاف کی طرف بڑھتے

چلے آ رہے تھے ۔۔۔۔

شریف پورے سے ریفیوجی ٹرینیں پاکستان کی طرف چلنے لگیں۔ چھتوں تک بھری ہوئی ٹرینیں، لٹے پٹے زخمی، غم زدہ، پریشان حال، خستہ جاں مسلمان مہاجروں سے لدی ہوئی ٹرینیں جنہوں نے اپنی مائیں بہنیں، بچے، بیٹے، باپ جان اور مال ۔۔۔ سبھی کچھ پاکستان کے نام پر، اسلام کے نام پر قربان کر دیا تھا۔ جن کے گریبان تار تار تھے۔ جگر خون خون تھے۔ مگر دل پاکستان کی محبت سے بھرپور تھے۔

چھہرٹہ سٹیشن پر سکھ ڈرائیور نے گاڑی آہستہ کر دی۔ گردوارے کی طرف سے اکالی سکھوں نے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے مشین گنوں کا فائر کھول دیا۔ ظاہر ہے حملہ آور سکھوں کو بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گاڑی ایک بار پھر پاکستان کی طرف رینگنے لگی۔ خاصہ سٹیشن گزر گیا تو میں نے کھڑکی کا ذرا سا پٹ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ جھاڑیوں میں ادھر ادھر جا بجا ان مسلمان پٹھانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جو ایک روز پہلے شریف پورے سے اپنے گدھے لے کر پیدل ہی چل پڑے تھے اور لوگوں کے منع کرنے کے باوجود نہیں رکے تھے۔ ان بہادر اور غیور پٹھانوں نے پاکستان سے بیس میل دور شہادت پائی ۔۔۔۔

واہگہ سٹیشن پر دور ہی سے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم دھوپ میں لہراتا نظر آیا تو ٹرین میں زندگی لہر دوڑ گئی۔ فضا نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی ۔۔۔۔

"ہمارے ڈبے میں ایک زخمی بوڑھے کسان نے منہ اٹھا کر پوچھا، کیا پاکستان آ گیا؟ کسی نے کہا" ہاں بابا جی، پاکستان آ گیا۔ وہ دیکھو پاکستان کا جھنڈا۔"

بوڑھے کسان نے گردن ذرا سی اٹھا کر کھڑکی میں سے باہر سبز ہلالی پرچم دیکھا۔ اس کے خستہ حال نیم مردہ چہرے پر ایک چمک سی آئی، اس نے کلمہ طیبہ پڑھا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ شہید ہو گیا۔ پاکستان زندہ باد بوڑھا کسان زندہ باد، حامد بٹ زندہ باد، بوڑھا درزی زندہ باد، طاہر شاہ زندہ باد مسلمانوں کا امرتسر زندہ باد چوک فرید زندہ باد۔ چوک پراگداس کی مسجد زندہ باد دریائے بیاس کی لہروں میں سوئی ہوئی بہن زندہ باد! رام تلائی کے مندر سے چھلانگ لگا کر شہید ہونے والی بیٹی زندہ باد! چودہ اگست زندہ باد!

خواتین و حضرات! خواتین و حضرات! ۔۔۔

امرتسر کا جلیانوالہ باغ

سماوار میں سبز چائے جوش کھانے لگی۔

کشمیری چائے کی لطیف بھاپ نے کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مل کر کمرے کو مہکا دیا۔ ریحانہ نیلی پتی دار جاپانی پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی اور میں نے پائپ سلگا لیا۔ اب کمرے کی فضا میں ایک تیسری خوشبو نے جنم لیا۔ کشمیری چائے، گلاب کے پھول اور ایرن مور تمباکو کے فلیور کا ملاپ۔ یہ تھی تیسری خوشبو۔ امرتسر کی خوشبو۔ کمپنی باغ کے بارش میں بھیگتے اور گرم دوپہروں میں بڑی نہر کے کنارے اُگے ہوئے مرطوب گھاس اور رات کے پچھلے پہر امرتسر کی کسی گلی سے ڈولی میں سوار ہو کر رخصت ہوتی دلہن کی خوشبو! امرتسر اس وقت میری سبز چائے کی پیالی میں تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں میں تھا اور میرے پائپ کے فلیور میں تھا اور میرے سامنے بیٹھے ہوئے والد صاحب کی سمٹی ہوئی آنکھوں میں تھا۔

ابا جی چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ آج میں ان سے امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے بارے میں کچھ باتیں کرنے والا تھا۔ جب کبھی وہ مجھے میز پر بیٹھے کچھ نہ کچھ لکھتا دیکھتے تو کہا کرتے۔ "حمید یار کبھی ہماری ڈائری بھی نوٹ کر لو۔ عمر کا کیا بھروسہ!"

ڈائری سے ان کی مراد جلیانوالہ باغ کے واقعات تھے۔ جس وقت جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا آرڈر دیا، ابا جی دوسرے لوگوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ میں ہنس کر ٹال جاتا۔ لیکن اس روز میں نے والد صاحب کی جوانی کی یادوں کے سمندر میں غوطہ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بحرِ ہند کا تاریک سمندر تھا۔ ہیبت ناک کالے پانی کا سمندر

تھا جس کی مہیب شوریدہ سر موجوں کو چیرتے کبھی امرتسری محبِ وطن قیدیوں سے بھرے ہوئے جہاز گزرے تھے۔ ان جلاوطن عمر قیدیوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ اس لئے کہ امرتسر کا مسلمان سیاسی اعتبار سے زیادہ بیدار تھا اور اُس میں ہندو اور سکھوں کے مقابلے میں آزادی کی زیادہ تڑپ اور زیادہ ولولہ تھا۔ بقول اباجی، جلیانوالہ باغ کی تاریخ امرتسری مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہے۔

جلیانوالہ باغ پر خونیں حادثے کو گزرے سترہ اٹھارہ برس گزر چکے تھے میں امرتسر کے گورنمنٹ ہائی سکول میں نویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اور جلیانوالہ باغ میں دوستوں کے ساتھ دن میں ایک آدھ بار گلی ڈنڈا کھیلنے ضرور جایا کرتا۔ یہ باغ ہمارے محلے کے پاس ہی تھا۔ کہنے کو تو یہ باغ تھا لیکن اس میں باغ کہیں نہیں تھا۔ بس ایک گول میدان سا تھا جس کے چاروں طرف اونچے اونچے مکانوں کے پچھواڑے لگتے تھے۔ میدان میں ایک پرانی سمادھ تھی۔ ایک چھتری نما زنگ خوردہ چھت والا اندھا کنواں تھا۔ (جب گولی چلی تو یہ کنواں لاشوں سے بھر گیا تھا) باقی میدان میں اِدھر اُدھر کچھ درخت تھے۔ کہیں کہیں گھاس اُگی تھی ایک جانب ڈھکی ہوئی بنسبلی تھی جس میں دو موجی نہر کا پانی بہہ کر دربار صاحب کے تالاب کو جاتا تھا۔ ایک بار ہماری گلی باغ کے اندھے کنوئیں میں گر گئی۔ ہم اُسے نکالنے کے جتن کر رہے تھے کہ ایک فقیر نے ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "بچو! اِس کنوئیں میں سینکڑوں ماؤں کے لال دفن ہو گئے۔ تم کیا ڈھونڈھ رہے ہو؟"

ہمارا گھر کوتوالی کے عقب میں تھا۔ کوتوالی سے ہو کر جب آپ کیسری باغ کے سامنے ملک کے بُت والے چوک سے گزریں تو سامنے دُتے پٹھان کی بیٹھک کے پہلو والے بازار میں اونچے چو منزلہ مکانوں میں بھنچا ہوا جلیانوالہ باغ کا آہنی سلاخ دار دروازہ آ جائے گا۔ یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ آگے ایک چار فٹ چوڑی کچی راہداری ہے جو بتدریج ذرا بلند ہو کر ڈھلان کی شکل میں باغ میں اُتر گئی ہے (اسی اونچان پر ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈائر کے گورکھا سپاہیوں نے مورچے سنبھالے تھے۔) چاروں طرف مکانوں کے پچھواڑے ہیں جن کی کھڑکیاں میں اکثر کھلی دیکھتا۔ ہندو سکھ اپنے مکانوں پر مسلمانوں کی طرح چقیں

نہیں ڈالا کرتے۔ ان کھلی، بے پردہ کھڑکیوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اُن آنکھوں کا خیال آتا جن کی پلکیں غائب ہوں۔ کہیں کہیں مکانوں کی دیواروں پر لکڑی کے جالی دار چوکھٹے لگے ہیں جن کے نیچے لکھا ہے "گولی کا نشان ہے" جالیوں کے پیچھے ابھی تک اینٹوں میں سوراخ ویسے ہی تھے۔ یہ اُن بے رحم گولیوں کے نشان تھے جو انگریز بریگیڈئر جنرل آر۔ اِی۔ ایچ ڈائر کے حکم سے اس تاریخی باغ میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کی ایک سہ پہر کو نہتے امرتسریوں پر برسائی گئیں۔ میرے والد صاحب کی عمر اُس وقت ۲۰ برس کے قریب تھی اور وہ اُس جلسہ گاہ میں موجود تھے۔

سبز چائے کی دوسری پیالی اباجی کے ہاتھ میں تھی اور اُس کی خوشبودار بھاپ اُن کے بوڑھے چہرے کی جھریوں کو دھندلاتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔ وہ آنکھیں نیم وا کئے گہری سوچ میں تھے اور انچاس سال پہلے کی یادوں کے گہرے سمندروں میں غوطہ زن تھے۔ اس سے پہلے کہ میں ان تاریخی یادوں کی غواصی کروں اور کچھ انمول اور گمنام موتی چن کر لاؤں میں جلیانوالہ باغ کے پس منظر پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور انگریزی حکومت نے ہندوستانی لیڈروں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو ہوم رول دے دیں گے۔ لیکن فتح کے بعد نہ صرف یہ کہ انگریز اپنے وعدے سے پھر گئے بلکہ رولٹ ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کو مزید غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ انگریز ہندوستان پر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد سے راج کرتے چلے آئے تھے۔ وہ اِس سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہندوستانی ہائی کورٹ کے جج سر سڈنی رولٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بیٹھی جس نے رولٹ ایکٹ کے نفاذ کے ذریعے ہندوستانیوں کی رہی سہی آزادی بھی چھین لی۔ اس ایکٹ کی رُو سے حکومت کو اندھا دھند گرفتاریوں کا اختیار مل گیا اور مقدمہ چلائے بغیر سزاؤں کے خلاف اپیل کا بھی عوام کو حق نہ تھا۔ ہند کے مسلمان پہلے ہی انگریزوں سے بدظن تھے۔ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ زد مسلمانوں پر ہی پڑی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو ابھی اپنی منزل کا تعین کرنا تھا۔ فی الحال وہ اپنے مشترکہ دشمن

کو کچلنے کے لئے کانگریس کے ساتھ تھے۔ یہ ہندو مسلمان اتحاد نہیں تھا۔ بلکہ انگریزوں کے خلاف ایک جنگ تھی۔ آزادی کی لگن اور ولولہ تھا۔ جس نے ان دو مختلف تہذیبوں کو ایک پل کے لئے ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا۔

کالے قانون نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گاندھی نے ستیہ گرہ کی تحریک شروع کردی یکم مارچ ۱۹۱۹ کو بمبئی میں سول نافرمانی کی قرارداد منظور ہوئی۔ ۷ مارچ کو دلی کے ایک جلسے میں کالے قانون کی پرزور مذمت کی گئی۔ ۶ اپریل کو کانگریسی اور مسلمان لیڈروں کے ایما پر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں کامیاب ہڑتال کی گئی۔ دلی ریلوے سٹیشن پر جب ہڑتالیوں نے ایک ریڑی والے کو سوڈا لیمن بیچنے سے منع کیا تو ہنگامہ ہوگیا۔ پولیس نے گولی چلادی۔ دو ہڑتالی مارے گئے۔ لاہور، امرتسر، بمبئی اور دلی میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ لوگوں نے اکا دکا انگریز شہریوں کو زدوکوب کرنا شروع کردیا۔ لاہور میں ہڑتالیوں نے کالی جھنڈیوں کا جلوس نکالا۔ سات، آٹھ اور نو اپریل کے دن امن سے گزر گئے۔

پہلا دھماکہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ کو ہوا۔

پنجاب کے اس وقت کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے حکم سے گاندھی کو بمبئی سے امرتسر آتے ہوئے پلول سٹیشن پر روک کر واپس روانہ کردیا گیا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی سارے ہندوستان میں بلوے شروع ہوگئے۔ اس اثنا میں جلیانوالہ باغ کا بدنام قاتل جنرل ڈائر دلی سے جالندھر اپنے ہیڈ کوارٹر جا چکا تھا۔ گورنر پنجاب کے حکم پر اس نے امرتسر ریلوے سٹیشن کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک دستہ روانہ کردیا۔ دس اپریل کی دوپہر کو وائرلیس کے ذریعے جنرل ڈائر کو ایک خفیہ پیغام ملا جس میں کہا گیا کہ جتنی جلدی ہوسکے مزید فوج، ہلکی توپیں اور ایک ہوائی جہاز امرتسر بھیجا جائے۔

امرتسر میں ۱۸۵۷ کے بعد آزادی کا دوسرا جوالا مکھی پھٹ پڑا تھا۔ ہڑتالیں، زوروں پر تھیں۔ امرتسر کے گلی کوچوں اور ہال دروازے کی دیواروں پر جا بجا پوسٹر لگے تھے جن پر لکھا تھا۔

"امرتسر کے شہریو! مارو یا مر جاؤ"

رام نومی کے تہوار پر شہر میں ایک زبردست جلوس نکلا جس میں "انگریزی راج مردہ باد" کے نعرے لگائے گئے۔ امرتسر میں آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ امرتسر کے پنوں ریلوے سٹیشن اور سول لائنز کی انگریز آبادی کی حفاظت کے لیے کمپنی باغ میں سومرسٹ لائیٹ انفنٹری نمبر ۱۲ ایمونیشن کالم اور رائل آرٹیلری کے فوجی تعینات تھے۔

۱۰ اپریل ۱۹۱۹ کو صبح آٹھ بجے دو سرکردہ کانگریسی لیڈروں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مائیلز ارونگ کی طرف سے پیغام ملا میرے بنگلے پر دس بجے تشریف لائیں۔ شہر کے حالات کے بارے میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے اس وقت پولیس سے بھری ہوئی دو لاریاں اور ایک موٹر کار بنگلے کے عقبی حصے میں تیار کھڑی تھیں۔ جب یہ دونوں لیڈر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچے تو انہیں اسی وقت گرفتار کرلیا گیا اور کار میں بٹھا کر دھرم سالہ روانہ کردیا۔

کچلو اور ستیہ پال کی گرفتاری نے شہر میں آگ لگادی۔ لوگوں نے دھڑا دھڑ دکانیں بند کرنی شروع کردیں۔ اور ہجوم در ہجوم ہال بازار میں سے گزر کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ گورا فوج نے سٹی مجسٹریٹ مسٹر آر۔ بی۔ بیکٹ کی معیت میں فوراً انجمن پارک والے ریلوے پل کی دوسری طرف پوزیشن سنبھال لیں۔ آزادی کے متوالے امرتسری عوام کا یہ بپھرا ہوا ہجوم جب نعرے لگاتا پل پر پہنچا تو گورا فوج نے رائفلیں تان لیں جلوس ایک پل کے لئے رک گیا۔ تیس ۳۰ ہزار کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بیکٹ گھوڑے پر سوار این۔ سی۔ او کو حکم دے رہا تھا کہ جلوس کسی حالت میں بھی پل عبور نہ کرنے پائے ادھر جلوس نے آگے بڑھ کر گورا فوج کو پیچھے دھکیلنا شروع کردیا۔ ایک آدمی نے مسٹر بیکٹ کے گھوڑے کے منہ پر سونٹی ماری۔ وہ الف ہوگیا۔ مشتعل ہجوم نے پتھراؤ شروع کردیا۔ اس وقت ایک گھڑ سوار فوجی نے پستول سے دو فائر کردیئے جس سے دو آدمی زخمی ہو کر گر گئے۔ ان کے گرتے ہی ہجوم ذرا پیچھے ہٹا۔ ان زخمیوں کو اٹھا کر چوک فرید میں ڈاکٹر بشیر کی ڈسپنسری پہنچا دیا گیا۔ اب ہجوم بے قابو ہوگیا۔ امرتسر کے ڈی۔ ایس۔ پی مسٹر پلومر نے وہاں آتے ہی فائرنگ کا حکم دے دیا۔ گورا فوج نے

فوراً گولی چلا دی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

"پھر کیا ہوا؟"

میں نے والد صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے سگریٹ جلایا اور آنکھیں ذرا سی میچ کر بولے۔

"بس پھر کیا تھا۔ پل سے لوگ زخمی ہو کر اور لاشیں اٹھا کر شہر میں آئے تو ایک طوفان آگیا۔ امرتسر کے گلی کوچے انتقام کے نعروں سے گونج اٹھے۔ میں ان دنوں پورا جوان تھا اور پہلوانی کیا کرتا تھا۔ تکیہ شیخ چلی میں غلام رسول حلوائی کے ساتھ زور کیا کرتا۔ بدن میں شباب کا خون گردش کر رہا تھا۔ میں بھی جلوس کے ساتھ وہاں سے لوٹ کر اپنے محلے میں آگیا جس وقت میں ہال بازار میں سکندر خاں والی اونچی مسجد کے پاس پہنچا تو میرے دیکھتے دیکھتے سامنے والے نیشنل بنک کو آگ لگا کر لوٹ لیا گیا۔ اس بنک کا ایک انگریز منیجر سٹوارٹ صاحب تھا اس کو قتل کر کے آگ میں پھینک دیا گیا۔ بجلی والے چوک میں بنک کی لوٹی ہوئی بڑی بڑی پیٹیاں، پائپوں اور سریوں سے توڑی گئیں اور ان میں سے جو ریشمی سوتی کپڑا اور سامان نکلا اسے کچھ لوگ اٹھا کر لے گئے اور باقی وہیں چوک میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اسی طرح ہمارے اپنے بازار میں محمد جان کی مسجد کے سامنے والے الائنس بنک اور پہلو والے چارٹرڈ بنک کو بھی لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ بنک کے ہندو خزانچی نے انگریز منیجر کو بچانے کی کوشش کی مگر جیے دھوبی نے انگریز کو بازوؤں پر اٹھا کر یا علی کا نعرہ لگایا اور آگ میں پھینک دیا۔ اس وقت امرتسر کے اُن گھروں میں عورتیں بین کر رہی تھیں جہاں گورا فوج کی گولیوں سے چھلنی بھائیوں اور بیٹوں کی لاشیں پڑی تھیں۔"

والد صاحب نے سگریٹ کا کش لگایا اور ٹانگ سیدھی کر کے اُسے دبانے لگے۔

مجھے محمد جان کی مسجد اور یہ سارے بنک یاد آ گئے۔ یہ بعد میں پھر سے تعمیر ہو گئے تھے اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ اُن کے برامدوں میں کھیلا کرتا تھا۔ پھر یہ بینک ہندو ساہوکاروں نے خرید لئے اور امرتسری مسلمانوں کا خون چوس چوس کر اک منزلہ سے دو منزلہ اور سہ منزلہ ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ان بنکوں کو خود ہم نے آگ لگا۔ مجھے اُس ہندو

بنک کی سہ منزلہ عمارت سے اٹھتے ہوئے شعلے آج بھی یاد ہیں جس کی چھت پر ایک آدمی شعلوں میں گھرا بدحواس چوہے کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ یہ وہ چوہے تھے جنہوں نے اور جن کے آباؤ اجداد نے امرتسر کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی عمارت کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ اب میری امرتسر کی یادوں کا در کھل رہا تھا۔ میں نے پائپ سلگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ یادوں کے دَر بند کر دیئے۔ اور سماوار میں سے گرم گرم چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"اباجی! کوڑیاں والے کھوہ کا واقعہ کیا تھا؟"

والد صاحب نے اپنے خشخشی سر کو کھجایا اور اپنی پیالی پر جمی ہوئی بالائی کو پھونک مار کر بولے۔

"ایک انگریز لیڈی (مس فارسلا شیروڈ) جو کہ امرتسر کے مشن سکولوں کی بڑی استانی تھی سائیکل پر سوار گھر کو جا رہی تھی کہ راستے میں بلوائیوں نے اُس پر حملہ کر دیا۔ وہ بھاگ اٹھی۔ لیکن کوڑیاں والے کھوہ والی گلی میں پہنچ کر سائیکل سے گر پڑی۔ لوگوں نے اُسے وہیں ختم کر دیا۔ بعد میں جب مارشل لا لگا تو جنرل ڈائر خود وہاں پہنچا اُس نے کل کوڑیاں والی کھوئی کے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ گھر سے نکلیں تو گلی کے فرش پر گھٹنے ٹیک کر بازار میں آئیں اور ویسے ہی گھروں کو واپس جائیں —— مگر اُس وقت ابھی مارشل لا نہیں لگا تھا۔ اُس وقت امرتسریوں کا راج تھا۔ اور یہ امرتسری ننانوے فی صد مسلمان تھے۔ یہاں تک کہ جلیانوالہ باغ بھی مسلمانوں کے محلے میں تھا۔ ہندو سکھ محلوں میں کسی جگہ بھی بنکوں کو آگ نہیں لگی تھی۔ کانگریسی لیڈر محض نعرے لگاتے۔ کانگریسی ہندو اُن نعروں کا جواب دیتے اور بس —— دشمن سے لڑنا اور مقابلہ کرنا۔ یہ کام امرتسری مسلمانوں کا تھا۔ اور ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی اس بات کی گواہ ہے۔" میں نے ماچس جلا کر والد صاحب کا سگریٹ سلگایا۔

"لیکن اباجی! آپ تو کہا کرتے ہیں کہ لوٹ کا مال ہمارے محلے میں بھی آیا تھا۔"

"ضرور آیا تھا۔ ہر جگہ ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ گاما رفوگر جو ململ کا تھان لایا وہ

اسی گز کا تھا۔ اس نے فوراً اسے منگوا کر کُرتے سلوائے۔ احمد دین پٹو لئے کا بھائی اسی ململ کا رنگ دار کرتہ پہن کر جلیانوالے باغ جلسہ سننے گیا تھا کہ گولی کھا کر مر گیا۔ ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کوتوالی میں ٹاؤن ہال کے کونے میں پہلے ایک ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا۔ مسجد عیدالون گلی ڈوگراں کے مولوی صاحب کا جوان بیٹا غلام حسن میرا یار تھا۔ بڑا شینہ جوان تھا۔ ہم دونوں جمعے کے جمعے سخی سرور والے اکھاڑے میں زور کیا کرتے تھے۔ وہ ڈاکخانے کا دروازہ توڑ کر اندر چلا گیا۔ بس جوانی کے زور میں ایسا کر گیا۔ سینے میں آزادی کی آگ جو لگی تھی۔ اندر جا کر اس نے روپے اور ٹکٹ نکالے اور انہیں باہر سڑک پر لا پھینکا۔ اور نعرہ مار کر بولا۔

" یہ کافر کا مال ہے۔ اسے آگ لگا دو۔ یہ مسلمان پر حرام ہے "

حمید میاں۔ جب مارشل لا لگا تو ایک ہندو اشنام فروش نے اس کی مخبری کر دی۔ غلام حسین گرفتار ہو گیا۔ انگریز نے اسے پھانسی کی سزا دی اور اسے میانوالی جیل میں پھانسی چڑھا دیا گیا "

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دل اسی ولولہ خیز شہید کی یاد میں سوگوار ہو گیا جو برصغیر میں آزادی کے اولین بیج بونے والوں میں سے تھا۔ میں نے پیالی میں سے سبز چائے کا تلخ گھونٹ پی کر کہا۔

" سیری قصائی کون تھا؟ "

" سیری! سیری قصائی تھا۔ بڑا دلیر جوان تھا۔ چھ فٹ تھا۔ ہر جلسے، ہر جلوس میں جھنڈا اٹھا کر چلتا تھا۔ عید میلاد کے جلوس میں حلیم کی دیگ کا ریڑھا لے کر سکتری باغ جایا کرتا تھا۔ سیری اس کا نام اس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ دوپہر کو گلی گلی پھیر کر سری پائے بیچتا تھا اور " سری! سری! " آواز لگایا کرتا تھا۔ سب سے پہلا جلوس جب پرانجمن پارک والے ریلوے پل پر گولی چلی اس میں سیری نے لال رنگ کا ترکی کی حکومت کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ اور رومی ٹوپی پر اتاترک کی تصویر پن کے ساتھ لگی تھی۔ اس کے نعروں نے جلوس میں آگ لگا دی تھی۔ وہ چارنگ بنک میں آگ لگانے والوں کے آگے آگے تھا۔

وہ بنک کے چبوترے پر کھڑا تھا اور بنک کے نوٹوں کی گڈیاں آگ میں پھینک پھینک کر کہہ رہا تھا۔

" کافر کا مال بھی کافر کے ساتھ جہنم میں جائے گا "

مارشل لا میں سیری کی بھی مخبری ہوئی۔ پکڑا گیا۔ پیچھا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پھانسی کے بعد جب اس کی بھی لاش گلی میں آئی تو ایک کہرام مچ گیا۔ "

والد صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ ان پرانے ہم جولیوں کی سوگوار یادوں میں کھو گئے تھے۔ جنہوں نے جوانی میں ہی ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور آزادی کے پرچم تلے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ میں نے پوچھا۔

" لیکن ابا جی! حاکموں کو ان لوگوں کے بارے میں پوری معلومات کس نے دیں؟ "

" یہ مخبریاں سی آئی ڈی کے ملازموں۔ دولت کے پجاری اور حاکموں کے مطیع ہندو ساہوکاروں اور ان پہاڑیئے ہندو نوکروں نے کیں جو سول لائنز میں انگریزوں کی کوٹھیوں میں کام کرتے تھے۔ وہ سوا سی آئی ڈی میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھیں۔ لالہ گیان چند ہی نے تو ڈی سی کو ہمارے محلے کے مسلمانوں کے نام دیئے تھے "

" لیکن یہ بتایئے کہ پھر اس دور میں ہندو مسلم اتحاد کیسا تھا؟ "

" اصل میں ہم تو پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا امرتسر میں کبھی بھی ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ مل کر بیٹھے نہیں دیکھا۔ ان کا رہن سہن ہی ہم سے الگ تھا۔ برتن بھانڈے الگ تھے۔ برتنوں کے نام ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے۔ چنانچہ ہر محرم کو فساد ہو جاتا۔ اس وقت اصل میں انگریز سانجا دشمن تھا۔ تو مسلمان جاپانیوں کو بھی ساتھ ملا لیتے۔ رام نومی پر ہندوؤں کا مسلمانوں سے کس قدر اتحاد تھا۔ مجھے یاد ہے میں چکن کا کُرتہ پہنے، موبونیاں والے بازار گیا تو ہندو لالوں نے تھالی میں مصری اور لاچی پیش کی۔ میرے کُرتے پر صندل میں بھگو کر ٹھپہ لگایا۔ مگر اس کے ایک ہی سال بعد ہندوؤں کے انہیں محلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلسے ہوئے اور انہیں قتل کرنے کی سکیمیں بنائی

گئیں۔ جس روز گول باغ میں جلسہ ہوا تو قمرو نے (قمر دین آف جنو ہاؤس (انار کلی) مجھے آکر کہہ دیا تھا۔

خلیفہ اب یہاں سے بوریا بستر گول سمجھو۔ ہندو لیڈروں نے کہہ دیا ہے، مسلمانو! تم عرب سے آئے ہو عرب چلے جاؤ۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہندو مسلمان ہندوستان میں ایک ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے تھے۔ رام نومی والا اتحاد اصل میں انگریزوں کے خلاف تھا۔ مسلمان ہندوستان میں شروع ہی سے نجات حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی ڈیڑھ سو برس کی غلامی میں انہوں نے کئی بار علمِ آزادی بلند کیا اور قربانیاں دیں۔ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ خون مسلمانوں کا بہا۔ ہندوؤں نے اس وقت بھی مخبریاں کیں، اور اونچے سرکاری عہدے پائے۔ اسی طرح جلیانوالہ باغ میں بھی مسلمان ہی زیادہ تر شہید ہوئے۔ ہندوؤں نے مخبری کر کے چُن چُن کر مسلمان شہریوں کو پھانسی پر لٹکوایا، یا کالے پانی بھجوایا۔ اب بھی دیکھ لو کبھی تم نے یہ بھی سُنا ہے کہ فلاں ہندو لالہ کالے پانی سے رہا ہو کر آیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم نے چچا محمدی اور فیروز کے نام ہی سُنے ہوں گے۔ حمید میاں ہم نے ہندو سکھوں میں عمریں گزاری ہیں۔ یہ کبھی مسلمان کے دوست نہیں ہو سکتے۔"

والد صاحب نے نفی میں گردن کو ہلایا اور ریحانہ کو آواز دی۔

"ریحانہ بیٹا! سماوار ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

"آئی آپا جی!"

اتنے میں ریحانہ مسکراتے ہوئے اندر آئی اور سماوار اٹھا کر لے گئی۔ اس وقت مجھے اپنی والدہ مرحومہ آپو جی بہت یاد آئیں۔ کشمیری چائے بنانے کا جو سلیقہ اُن میں تھا وہ امرتسر کی بزرگ کشمیری خواتین کا ہی حصّہ ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے منہ اندھیرے اٹھ کر آگ جلاتیں۔ پتیلی، چمچ اور پیالے گرم پانی سے پاک کرتیں۔ تازہ پانی میں چائے کی پتی ڈالتیں جب خوب جوش آجاتا تو ٹھنڈے پانی کا چھینٹا دیتیں۔ دودھ الگ گرم کرتیں اور پھر اس میں چائے کا رس انڈیلتیں۔ ٹھیک جس وقت چائے کا رنگ سُچے گلاب ایسا

ہو جاتا تو ہاتھ روک لیتیں۔ میں اُن کے پاس بیٹھ جاتا۔ بڑی محبت سے میری پیالی میں چائے ڈالتیں۔ چائے میں سے کبھی گلاب کی خوشبو آتی اور کبھی مجھے یوں لگتا جیسے کسی گرم دوپہر کو چنبیلی سے لدے ہوئے جنگل میں سے گزر رہا ہوں۔ میں اپنی گرم خوشبودار جنگلوں میں سے ہوتا ہوا امرتسر کی نہروں اور پھولوں بھرے باغوں میں نکل گیا —— اس میں کوئی شک نہیں کہ امرتسر کی رگوں میں کشمیری مسلمانوں کے کلچر اور ثقافت کا خون دوڑ رہا تھا۔ امرتسری مسلمانوں میں زبردست سیاسی شعور اور ادبی ذوق تھا۔ اس شہرِ بے مثال میں جتنی ادبی اور سیاسی تحریکوں نے جنم لیا وہ مسلمانوں ہی کی مرہونِ منت تھیں۔

اس شہر نے بلند مرتبت مسلمان خطیب، لیڈر، شاعر، ادیب، پہلوان اور ہنرمند پیدا کئے۔ ہندو گوکل مارکیٹ، چھتی ڈیوڑھی بازار مائی سیواں اور گورو بازار کی تنگ و تاریک دکانوں پر توند نکالے دن بھر پلپلے پیٹ کھجاتے رہتے جبکہ امرتسری مسلمان کاریگروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے قالین، جامہ واریں اور پشمینے کی چادریں سمرقند و بخارا کی منڈیوں میں دادِ تحسین وصول کرتیں۔ اُن کے اللہ اکبر کے جوشیلے نعرے آج بھی انجمن پارک، گول باغ اور سکتری باغ کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔ بہت بعد میں متعصب ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے سنگھٹن کی تحریک شروع کی اور مندروں میں ہندو نوجوان ورزش کرتے دکھائی دینے لگے۔ ورنہ اس سے پہلے امرتسر کے اکھاڑے مسلمانوں ہی کے دم سے قائم تھے لیکن پچاس ڈنٹر پیلنے کے بعد بمشکل تین پاؤ دودھ پینے والا پلپلا زور ہندو بھلا ایک ہزار ڈنٹر لگا کر سالم بکرے کی یخنی چڑھا جانے والے امرتسری مسلمان کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا! چنانچہ ۱۹۴۷ کے فسادات میں ہندو کسی بھی جگہ کھل کر مسلمان کے مقابلے میں نہیں آیا۔ وہ اپنی اکثریت کے محلوں میں چھپ کر بیٹھے رہے تھے۔ اُدھر کوئی اکا دکا دلیر مسلمان جا نکلتا تو آ سے آ لیتے۔ ہاں سکھوں نے ضرور مقابلہ کیا۔ مگر وہ بھی اللہ اکبر کے نعروں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ سب سے پہلا حملہ ہمارے محلے کٹڑہ مہان سنگھ پر برج پھولا سنگھ کے نہنگ سکھوں نے کیا۔ میں خود مقابلہ کرنے والوں میں موجود تھا۔ نہنگ اپنے ایک ساتھی

کی کٹی ہوئی موٹی پنڈلی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس مقابلے میں قادر شوز کمپنی انار کلی کے قادر صاحب شدید زخمی ہوئے تھے۔ اگر امرتسر میں باقاعدہ فوج برین گنیں، دستی بم۔ توپیں اور بکتر بند گاڑیاں لے کر نہ آتی تو یقین کیجیے امرتسر کو امرتسری مسلمانوں سے خالی کروانا ناممکن بات تھی۔

بہر حال اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا لدھیانہ اور جالندھر کی طرح امرتسر بھی اسلام کے کلچر اور دینی آزادی کا زبردست مرکز تھا۔ اور ہر سیاسی تحریک کے پیچھے مسلمانوں ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ کون امرتسری ہے جو چوہدری فضل حق، شیخ حسام الدین، سید عطاء اللہ شاہ بخاری سیف الدین کچلو، غازی عبدالرحمان اور مولوی غلام محمد ترنم کی شعلہ فشاں تقریروں کو بھلا سکے گا؟ قاصداں والی مسجد کے گنبد و مینار آج بھی مولوی ترنم کی پُرجوش خطابت کے امین ہیں۔ مسجد خیرالدین کے در و دیوار آج بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آتش نوائیوں پر ہمہ تن گوش ہیں۔ یہ وہ اسلام کے جیالے سپوت ہیں جنہوں نے اپنے خون سے دین محمدی کے چمن کی آبیاری کی اور مسلمانوں کو وہ سیاسی اور دینی استحکام بخشا جس نے ۶۵ کی جنگ میں کہیں میجر عزیز بھٹی، کہیں جنرل سرفراز خاں، کہیں کیپٹن میجر عبدالحبیب کہیں حوالدار شیر دل، کہیں راجہ مسعود اختر کیانی اور کہیں میجر عباسی بن کر ہندو حملہ آور دشمن کو آگ اور خون کے جہنم میں نیست و نابود کر دیا۔

امرتسر کا ہندو بنیا پائی پائی دمڑی دمڑی کے حساب سے کپڑا بیچتا تھا اور بہی کھاتوں کا زرد رو کیڑا تھا۔ سکھ گنک منڈی اور پاپڑ منڈی میں یا پاپڑ وڑیاں بناتا تھا اور یا بوری میں آری تیشہ ڈالے گلی گلی منجی پیڑھی ٹھکاؤ کی آوازیں لگاتا تھا۔ لیکن امرتسر کا مسلمان مجلس احرار اور نیلی پوشوں کے جلوس میں ستارہ و ہلال کا پرچم اٹھا کر سینہ تانے چلتا تھا۔ انقلاب زندہ باد۔ اسلام زندہ باد اور پھر پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتا تھا۔ امرتسر ابھی پُرجوش، پُرخون، زندہ دل، شیر دل اور بیدار مغز مسلمان نوجوانوں کی جد و جہد کا دوسرا نام تھا۔ امرتسر کی ساری رونقیں سیاسی ہنگامے، شعر و ادب کی بزم آرائیاں، صبح سری پائے کے ناشتے، نہر کی آم پارٹیاں اور ہنگامہ خیز جلسے جلوس امرتسری مسلمانوں ہی کے دم قدم کی برکت سے قائم تھے۔ امرتسری مسلمان ہمیشہ ہندو کے تن لاغر میں اپنی سیاسی

بصیرت، ملی سطوت بے مثال ذہانت اور جذبہ عمل کا خون دیتے رہے۔ امرتسر کے تاج محل کی عمارت مسلمانوں ہی کی بنیادوں پر کھڑی تھی۔ مسلمانوں نے امرتسر چھوڑ دیا۔ تاج محل گر پڑا۔ ہندوؤں کی سپلائی لائن ٹوٹ گئی۔ اب امرتسر کی مثال اُس ہندو عورت کی سی ہے جیسے اُس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو۔ اُس مریض کی سی ہے جو قلت خون کے باعث مر گیا ہو اور جس کی لاش سٹریچر پر ڈال کر مردہ خانے لے جائی جا رہی ہو۔

"بھائی جان چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"

چھوٹی بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں امرتسر کی شمشان بھومی سے واپس لاہور کی انارکلی میں آ گیا۔ ریحانہ چائے پیالیوں میں انڈیل بھی چکی تھی اور والد صاحب بڑے سکون سے پی رہے تھے۔ وہ ۱۹۱۹ کے جلیانوالہ باغ کی یادوں میں گم تھے اور میں ۱۹۴۷ کی یادوں میں کھو گیا تھا۔ دراصل ۱۸۵۷ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۴۷ء۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جد و جہد آزادی کے درخشاں مینار ہیں جن کی روشنی میں ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے دینی ورثے اور اسلامی عظمت کے احیا اور بقا کی منزل پائی۔

ابا جی نے اب پیالی میں نمکین کلچہ ڈبو لیا تھا اور اُسے چمچ سے بڑے مزے سے کھا رہے تھے۔ میں نے پائپ میں نیا تمباکو بھرا اور کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں کو دیکھ کر اُسے سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے بعد کیا ہوا ابا جی؟"

"بس پھر جو ہونا تھا ہو کے رہا۔ جنرل ڈائر گورکھا فوج لے کر امرتسر میں آن داخل ہوا۔ دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ جلسے جلوسوں پر پابندی لگ گئی۔ بیساکھی کے دن تھے۔ رام تلائی کے سامنے والے میدان میں میلہ لگا تھا۔ اگلے روز ۱۳ اپریل کا دن تھا۔ اس روز امرتسر کے آسمان پر ہلکا گرد و غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ میں سخی سرور کے اکھاڑے میں زور کر کے گھر آیا۔ نہا دھو کر دوپہر کا کڑھا ہوا دودھ پیا۔ مونچھوں پر بالائی کی مالش کی۔ سلک کا کُرتا اور پمپ شو پہنا۔ ماسٹر الٰہی بخش (والد محترم جناب ظہور الحسن ڈار) اور چھوٹے شاہ کو ساتھ لیا اور ہم تینوں جلیانوالہ باغ کی طرف روانہ ہو پڑے۔ ہم تینوں جوان تھے

اور بدن میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا۔ بازار بکرواناں سے نکل کر کیسری باغ سے ہوتے ہوئے ہم جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔

میں نے پوچھا۔

• آپ نے فضا میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کی؟

• کوئی خاص بات نہیں تھی۔ امرتسر میں دفعہ ۱۴۴ لگا ہی کرتی تھی اور جلسے ہوا ہی کرتے تھے۔ جلیانوالہ باغ میں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ حمید خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی پچاس ہزار کا ہجوم تھا۔ اردگرد مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں بھی لوگوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے بیچ میں تخت پوش پر ایک کرسی رکھی تھی جس پر ڈاکٹر کچلو اور ستیہ پال کی تصویریں رکھی تھیں۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے اُس وقت کانگریس کا ہنس راج تقریر کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ہوائی جہاز نے جلسہ گاہ کا ایک چکر لگایا اور قلعے کی پریڈ کی طرف چلا گیا۔ اب ایک شاعر اٹھا اور اُس نے اردو میں لکھی ہوئی انقلابی نظم پڑھنی شروع کر دی ——— ہم چونکہ دیر سے آئے تھے اس لئے لوگوں کے پیچھے ہی تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گورکھا فوج نے باغ کے دروازے والے ٹیلے پر آکر ایکدم مورچہ سنبھال لیا اور جنرل ڈائر سفید گھوڑے پر ذرا اوپر اٹھ کر دوربین سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

چھوٹے شاہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

خلیفہ ایسا لگتا ہے آج گولی چلے گی۔

میں نے کہا۔

• شاہ جی فکر نہ کرو۔ یہ محض ڈرانے کے لئے ہے۔

ماسٹر اللہ بخش نے بھی کہا کہ خلیفہ آثار اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔ میرا خیال ہے یہاں سے نکل چلو ——— ماسٹر اللہ بخش ہم میں پڑھا لکھا تھا۔ اُس کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ہم تینوں آہستہ سے اٹھے اور باغ کے گیٹ کی طرف بڑھے۔ ہمارے سامنے دروازہ ہی دبی تھا۔ وہاں فوجی مشین گنیں تانے بیٹھے تھے۔ جنرل ڈائر نے ہمیں

اپنی طرف آتے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر بولا۔

• گو اَوَن۔ چاؤ۔ چاؤ۔ پیچھے •

ایک گورکھا رائفل لے کر ہماری طرف لپکا۔ ہم الٹے پاؤں بھاگے۔ ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ پیچھے سے تڑاتڑ تڑ مشین گن کے فائروں کی آواز آئی۔ جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا آرڈر دے دیا تھا۔ مشین گن کی یہ پہلی باڑ لوگوں کے سروں کے اوپر سے ہو کر گزر گئی۔ اس باڑ کی ایک گولی گھونی گیٹ کے باہر اوپلے تھاپتی ایک گوجر عورت کو لگی اور وہ ہلاک ہو گئی۔ جلیانوالہ باغ فائرنگ کی یہ پہلی مسلمان شہید عورت تھی۔ ہم تینوں ہجوم میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اُس وقت سٹیج پر لالہ ہنس راج نے چلا کر کہا۔

لوگو! بیٹھے رہو۔ یہ پھوک کے فائر ہیں۔

مگر لوگ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دراصل زیادہ بھگدڑ اُن دیہاتیوں نے مچائی جو بیساکھی کے میلے پر امرتسر آئے ہوئے تھے اور اس قسم کی سیاسی ہنگامہ خیزیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ اب فوج نے دوسرا راؤنڈ چلایا جس کی باڑ جلسے میں موجود لوگوں پر ماری گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں چیخ و پکار اور کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بھاگنے اور گولیاں کھا کھا کر گرنے لگے۔ گولیوں کا ٹھائیں ٹھائیں اور تڑ تڑ کرتا مینہ برس رہا تھا۔ ہر طرف کہرام مچا تھا۔ لوگوں نے گھبرا کر کنوئیں میں چھلانگیں لگا دیں اور ایک دوسرے کے اوپر گرتے چلے گئے اور دب کر ہلاک ہو گئے۔ بچے بھاگتے لوگوں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔ میں ہجوم کے ریلے میں باغ کی مشرقی دیوار کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزری اور ایک سکھ کو سر میں لگی۔ وہ آہ کئے بغیر گرا اور اس کی لاش دیکھتے دیکھتے لوگوں کے پاؤں تلے کچلی گئی۔ میرا سلک کا کرتہ تار تار ہو چکا تھا۔ بمبئی شو جانے کہاں رہ گئے تھے۔

میں نے دھوتی کا لنگوٹا کس لیا اور لوگوں کے اوپر سے ہوتا باغ کی دیوار کی طرف بڑھا۔ یہ دیوار باغ کے گرداگرد چلی گئی تھی اور کوئی ۹ فٹ اونچی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ دیوار کو پھلانگنے کی کوشش میں گولیاں کھا کھا کر گر رہے ہیں اور ہلاک ہو رہے ہیں۔ دیوار پر

خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اب میرے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ دیوار پھاند جاؤں۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ زمین پر لیٹے ہوئے لوگوں کے سروں پر بھی گولیاں لگی تھیں۔ جنرل ڈائر کے فوجی، رائفلیں نیچی کر کے بھی فائر کر رہے تھے۔ میں بڑا جوان اور طاقتور تھا۔ بدن کمایا ہوا تھا۔ جونہی میں دیوار کے پاس پہنچا میں خدا کا نام لے کر اچھلا اور دوسرے لمحے میں دیوار کی دوسری جانب ٹال کی لکڑیوں پر پڑا تھا۔ میں اُسی گرمی سردی میں اٹھا اور دیوار کی اوٹ میں چلتا وہاں آ گیا جہاں دیوار ختم ہوتی تھی اور میں فوجیوں کو گولیاں چلاتے دیکھ سکتا تھا۔ فوجی اُس وقت تیس راؤنڈ چلا رہے تھے اور جلسہ گاہ میں ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جنرل ڈائر اشارے کر کے فائرنگ کرا رہا تھا۔ پھر اُس نے فائرنگ بند کرا دی اور فوجیوں کو ساتھ لے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔ اب میں بھاگ کر جلسہ گاہ میں آ گیا کیونکہ مجھے اللہ بخش اور چھوٹے شاہ کی تلاش تھی۔

حمید۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ میدان میں کیا حشر مچا تھا۔ بس تم اُسے دیکھتے تو لکھتے میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ لاشوں کے انبار تھے اور خون کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ میں نے ایک آٹھ دس برس کے لڑکے کو دیکھا کہ لاشوں کے نیچے دبا اپنا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے لاشوں کو ہٹایا تو وہ نیم بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اُسے اٹھایا اور دربار صاحب والی ہنسلی کی حوضی میں سے پانی پلانا چاہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حوضی کے پانی میں دس گیارہ لاشیں تیر رہی ہیں پانی اُن کے لہو سے سرخ ہے۔ ایک آدمی سہما ہوا پانی میں لٹکا ہے۔ چہرہ سفید ہے۔ ہاتھ نیلے ہیں۔ آنکھیں پھٹی پھٹی ہیں مجھے دیکھتے ہی ہاگوب کی طرح پکار اٹھا۔

"کیا گولی چلنی بند ہو گئی!"

ہنسلی کی نہر میں بھی ان گنت لاشیں تیر رہی تھیں۔ ان میں سے میں نے نمک منڈی کے ایک مسلمان رنگریز بابا صمرو کی لاش پہچان لی۔ اُسے دو گولیاں لگی تھی ایک سر کے بیچ میں اور ایک داہنے جبڑے سے ذرا اوپر۔ میں نے لڑکے کو نہر کا خون ملا پانی پلایا۔ وہ بدحواس ہو کر ادھر اُدھر تکنے اور پھر چیخنے لگا۔

"بتا جی! لالا جی! پتا جی!"

اور پھر زور زور سے رونے لگا۔ میں نے اُسے چپ کرایا اور سوچا کہ اسے سامنے والی گلی کے کسی گھر میں چھوڑ آؤں۔ میں جو اُسے لئے گلی میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ادھیڑ عمر کا ہندو لالہ مرف بنیان اور نیکر پہنے روتا ہوا ادھر اُدھر واویلا کرتا۔ "میرے بلرام پتر نوں ویکھیا جے! میرے بلرام پتر نوں ویکھیا جے لوکو! ہائے میریا پُترا ——"

وہ زار و قطار دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اب جو اُس نے اپنے بیٹے کو میرے ساتھ دیکھا تو باپ بیٹا چیخ مار کر لپٹ گئے۔ ہندو باپ نے بیٹے کو کندھے پر لادا اور وہاں سے آندھی کی طرح بھاگ گیا۔

اب میں پھر اپنے دوستوں کی تلاش میں باغ میں آ گیا۔ میں نے راستے میں دیکھا بازار بُرج میوہ سنگھ اور بازار جلیانوالہ باغ میں بھی لوگوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو جلسے میں گولی کھا کر گھروں کی طرف بھاگے اور بازار میں ہی گر کر دم توڑ گئے۔ میں نے ایک زخمی کو دیکھا کہ بالکل نیلا پڑ چکا تھا اور بازار کی نالی پر منہ رکھے پانی پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں جلسے کا تخت پوش بچھا تھا وہاں کم از کم تین سو کے قریب لاشیں پڑی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق سارے باغ میں اس وقت خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین چار ہزار کے قریب بچوں بوڑھوں اور جوانوں کی خون آلود لاشیں پڑی تھیں ان میں شدید زخمیوں کی بھاری تعداد بھی تھی۔ میرے ایک دوست سکندر علی جو ڈھاب کھٹیکاں میں رہتے تھے شام سات بجے اپنے چھوٹے بیٹے کی تلاش میں وہاں پہنچے۔ اُن کے لختِ جگر کی لاش مُردوں کے انبار تلے پڑی تھی۔ گولی اُس کے سر کو توڑ کر نکل گئی تھی۔ اُس کے پاس ہی مَس کے ہوٹل اسمٰعیل کی لاش پڑی تھی جس کے ساتھ وہ جلسہ سننے آیا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے سکھ کو دیکھا کہ بچے کو سینے سے لگائے زمین پر پڑا ہے۔ مشین گن کی گولیوں نے دونوں کے جسموں کو ادھیڑ ڈالا ہے۔ ہنسلی دربار صاحب والی میں ہی میں نے ترنتارن کے ایک چپڑاسی کو مرے پڑے دیکھا۔ وہ کبھی کبھی امرتسر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ لاشوں کے ساتھ ساتھ میدان میں جوتوں کے انبار بھی لگے تھے۔ مجھے چھوٹے شاہ اور اللہ بخش کہیں نظر نہ آئے۔ اب میں بھی لاشوں اور زخمیوں کے درمیان پھرتے دہشت زدہ ہو گیا

تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ لوگ لالٹینیں لئے اپنے اپنے لوگوں کی لاشیں ڈھونڈھ رہے تھے میں گھر کی طرف چل پڑا۔ بازار بند تھے اور ایک عجیب دہشت ہر طرف طاری تھی۔ بازاروں میں لوگ اپنے عزیزوں کی لاشیں چارپائیوں پر اٹھائے جلدی جلدی اپنے گھروں کو لئے جا رہے تھے کیونکہ ۸ بجے کے بعد شہر میں کرفیو لگنے والا تھا۔ ملکہ کے بت کے پاس مجھے والد صاحب ملے۔ وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ماسٹر اللہ بخش اور چھوٹے شاہ کے ساتھ میری تلاش میں آ رہے تھے۔ سوا سات بجے شام ہی شہر پر ہُو کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ روڑاں والی مسجد کے پاس ہمیں ایک نیم عریاں پریشان حال سکھ بوڑھا ملا جو رو رو کر ہر ایک سے پوچھتا تھا۔ میرے بیٹے کو کسی نے دیکھا ہے!

اُسی روز مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور امرتسر میں وحشت و بربریت کے ایک عبرتناک باب کا آغاز ہوا۔ کوتوالی کے سامنے ٹکٹکیاں نصب کر دی گئیں۔ لوگوں پر بے رحمی سے کوڑے برسائے جانے لگے۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ وہیں عدالت لگتی اور سزا سنا دی جاتی۔ کسی کو پھانسی اور کسی کو عبور دریائے شور ــــــ کتنے ہی آزادی پسند جیالے مسلمان جوانوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ یا انہیں کالے پانی عمر قید کے لئے بھیج دیا گیا ــــــ کوڑیاں والے کھوہ کے محلے میں انگریزوں نے لیڈی کے قتل کا پورا پورا بدلہ لیا۔ گلی والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ گھٹنوں کے بل چل کر گھروں سے باہر نکلیں اور واپس گھروں کو جائیں ــــــ ایک روز ڈھنڈورا پھر گیا کہ آج جنرل ڈائر شہر کی گشت کریں گے۔ تمام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جنرل صاحب کو اٹھ کر سلام کریں۔ جب ڈائر ہمارے محلے کٹڑہ میاں سنگھ میں آیا تو صدیق قصائی گوشت کاٹنے میں لگا تھا۔ اُس نے سلام نہ کیا۔ اچانک ہالٹ کی آواز آئی۔ ایک سپاہی نے زور سے صدیق کو ہنٹر مارا۔ صدیق نے وہی ہنٹر کھینچ کر سپاہی کے منہ پر دے مارا۔ پھر کیا تھا۔ فوراً اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ صدیق کو بھی کالے پانی بھیج دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے کڑیل جوان اور ماؤں کے سوہنے لعل پھانسی چڑھا دیئے گئے۔ شفو کے ہاتھ میں ابھی شادی کی مہندی بھی پھیکی نہ پڑی تھی کہ اُس کی لاش گھر آ گئی۔ اُس کا گھر گلی فراسیاں میں تھا۔ مائی ابھری بیوہ کے لڑکے کو جلسے میں

ہی گولی لگی تھی۔ بعد میں جب حکومت نے اُسے بھی کچھ روپے بطور معاوضہ دیئے تو مائی نے اس رقم سے گھی منڈی والے قبرستان کے نالوں کی پُلیاں پکی کروا دیں۔"

والد صاحب چائے پینے لگے اور مجھے گھی منڈی والا قبرستان یاد آ گیا جو امرودوں کے باغوں میں گھرا ہوا تھا اور جس کے ارد گرد نہروں میں سے کاٹے ہوئے نالے بہتے تھے۔ ان کی پکی پلیوں پر بیٹھ کر ہم باغ میں سے توڑے ہوئے کچے پکے امرود کھایا کرتے تھے۔ عید بقر عید کو منہ اندھیرے ہم یہاں اپنے آباؤ اجداد کی قبروں پر چاول اور گلاب کے پھول نچھاور کرنے آتے۔ اگربتیاں سلگائی جاتیں۔ یہاں وہاں جلتی موم بتیوں کی روشنی میں قرآن شریف پڑھنے کی آوازیں آیا کرتیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد اب ان قبروں کو ڈھا کر ہندو سکھوں نے وہاں مکان بنا لیے ہیں۔ کیا ہم اپنے اجداد کی روحوں کو کفار کے بوجھ سے آزاد نہ کرائیں گے؟ کیا مسجد قاصداں، مسجد خیرالدین اور مسجد جان محمد کے میناروں میں کبھی اذان نہ گونجے گی؟ ــــــ ہمیں خدا کے گھروں میں رکھے ہوئے بتوں کو پاش پاش کرنا ہے۔

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

میری آنکھوں میں اقبال کی ایک تصویر آ گئی کہ وہ مسجد قرطبہ کے گنبد کے ستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا ہے اور میں امرتسر کی ویران مسجدوں سے نکل کر غرناطہ و قرطبہ کے مسلمان بادشاہوں کے اجڑے ہوئے محلات میں نکل گیا۔

ابا جی کہہ رہے تھے۔

"ــــــ اب کانگریس اور مسلم لیگ دو الگ جماعتیں بن چکی تھیں۔ مسلمانوں پر ہندوؤں کی فریب کاری کھل گئی تھی۔ غالباً ۲۲-۱۹۲۱ میں گول باغ میں لیگ کا جلسہ ہوا۔ تنبو قناتیں تن گئیں۔ اسی میدان میں ساتھ ہی کانگریس کا سالانہ جلسہ بھی ہو۔ نہرو، گاندھی، اور تلک آئے۔ ابوالکلام آزاد بھی ساتھ تھے۔ دوسری طرف محمد علی جناح (قائد اعظم) بھی آئے۔ انہوں نے ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں بھی لیگ کے جلسے میں

گیا۔ امرتسر میں لیگ کا بڑا زور تھا۔ قائداعظم نے انگریزی میں تقریر کی۔ ایک بابو نے میرا کرتہ تہبند دیکھ کر پوچھا۔

"تم کیا انگریزی سمجھ لیتے ہو جو یوں جم کر بیٹھے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں جناح صاحب (قائداعظم) کی تقریر سننے آیا ہوں"

وہ بابو بڑا خوش ہوا اور مجھے قائداعظم کی تقریر کا ایک ایک لفظ سمجھاتا رہا۔

میں نے پوچھا۔

"قائداعظم نے کیا فرمایا تھا؟"

اب ٹھیک طرح یاد نہیں۔ ان کی تقریر کا مطلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو انگریزی غلامی سے نکال کر اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں جسے مسلمان کبھی گوارا نہیں کریں گے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہی ہوا کہ جلیانوالہ باغ میں مسلمان شہیدوں کا بہایا ہوا خون رنگ لایا۔ پاکستان بن گیا اور امرتسر میں جو کشت و خون کا بازار گرم ہوا اس سے تم سب نوجوان واقف ہی ہو۔ ہم نے بڑی قربانیاں دے کر پاکستان حاصل کیا ہے۔ اب اس ملک کو طاقتور بنانا اور قائم و دائم رکھنا تم لوگوں کا کام ہے۔"

میں نے کہا۔

"ابا جی! پاکستان کی طاقت اور اس کے دوام کا ثبوت دشمنوں کو ۶ ستمبر ۶۵ کو مل چکا ہے۔ آپ فکر نہ کریں اور اگر کبھی پھر امتحان کا وقت آیا تو ہم اس سے بھی بہتر ثبوت مہیا کریں گے۔"

"انشاءاللہ"

والد صاحب نے پیالی میز پر رکھ دی اور میری نظر کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں سے ہوتی کھلی کھڑکی میں سے باہر نکل گئی جہاں مغل پورہ، واہگہ، اور امرتسر جانے والی ریلوے لائن سورج کی سنہری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اب میرے کانوں میں امرتسر کی ویران مسجدوں کی فلک شگاف اذانیں گونجنے لگیں اور انجمن پارک میں گونجتے ہوئے "پاکستان زندہ باد" کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں اور میں نے اقبال کو قرطبہ کے دریا وادالکبیر کے کنارے گہری سوچ میں گم کھڑے دیکھا۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

امرتسر کا کمپنی باغ

میں نے ابھی ابھی وائٹ جیسمن چائے کی ایک پیالی پی ہے اور امرتسر کے کمپنی باغ پر مضمون لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس چینی چائے کی خوشبو میرے ہر سانس کے ساتھ کمرے میں پھیلنے لگی ہے۔ میرا دل چنبیلی کا سفید پھول بن کر میرے سینے میں دھڑک رہا ہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے گویا میں قلم سے نہیں گلاب کی ٹہنی سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں کاغذ کے تختے پر گلاب کی ٹہنی بہار کی ہوا کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور سطروں کی شاخوں پر یادوں کے شگوفے بن کر کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ کمپنی باغ پر کچھ لکھتے ہوئے وائٹ جیسمن چائے کی ایک پیالی بڑی ضروری تھی۔ یہ چینی چائے میرا ایک دوست چین سے لایا تھا۔ جب میں نے پہلی بار ٹین بیلو کر کے اس گول ڈبے کو کھول کر سونگھا تو میری آنکھیں اس کی خواب آلود خوشبو کے سحر سے خود بخود بند ہو گئیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں صبح کی شبنمی ہوا بن کر کمپنی باغ کے درختوں میں سے گزر رہا ہوں کمپنی باغ کے ہر درخت میں وائٹ جیسمن چائے کی مہک تھی اور اس کی روشوں کی گھاس میں جنگلی گلاب اور بنفشے کے پھول کھلا کرتے تھے میں نے آنکھیں کھول کر ڈبے میں چینی چائے سیاہی مائل سبز خشک پتیوں کو دیکھا تو مجھے وہ خشک پتے یاد آ گئے جو شروع سردیوں کی ہلکی بارش میں کمپنی باغ کے درختوں پر سے گرا کرتے تھے۔

ڈن ہل کی دیسی انگلش مہک والا سگریٹ ایش ٹرے میں سُلگ رہا ہے۔ کھڑکی سے باہر ڈوبتے سورج کی سُرخ کرنیں سفیدے کی ٹہنیوں کو چوم کر پیچھے سمٹتی جا رہی ہیں۔ سبز پتوں کے بیچ میں نیلے آسمان پر شام کی سنہری انگلیاں رات کی تحریر لکھتی نظر آ رہی ہیں۔ یہ تحریر پُر اسرار ہے، سحر زدہ ہے۔ اس میں وقت کے اہراموں میں سوئی ہوئی شہزادیوں کی سرگوشیاں ہیں۔ خلاؤں کے بیکراں سناٹوں میں اپنی طرف بلانے والی آوازیں ہیں۔ سامنے آ کر چھپ جانے والی شکلیں ہیں

گھنے جنگلوں کو جاتے پرانے راستے ہیں۔ سیاروں کے اُفق سے طلوع ہوتے سیارے ہیں اور سورجوں کے ساتھ ساتھ سیر کرتے سورج ہیں اور ان تحریروں میں نشانیاں ہیں۔ روشن اور تابناک نشانیاں......

کمرے کی فضا میں اعلیٰ انگلش تمباکو اور اعلیٰ چینی چائے کی خوشبو نے مل کر ایک تیسری خوشبو کو بیدار کر دیا ہے۔ یہ خوشبو ہے اعلیٰ خیالات، پُر جلال فکر اور پُر شکوہ تصورات کی ___ قرطبہ کی ویران مسجدوں کو تکتی، ہجرت زدہ اندلسی شہزادوں کی آنکھیں اور اُن مسجدوں کے بے اذان، میناروں کے عقب سے طلوع ہوتا آتشیں، غضب ناک آفتاب۔ بے سجدہ محرابوں نیچے ٹھنڈے سنگِ مرمر میں سجدوں کے دہکتے نشان۔ مفتوح محلات کی شاہی خوابگاہوں میں شہنشاہوں کے لاشے، لعل و جواہر، زمرد و عقیق سے محروم لُٹے ہوئے تاج، بے تاج اُموی حکمرانوں کی ڈوبتے سورج کو گھورتی آنکھیں اور ٹوٹی تلواروں کے قبضوں پر جمے ہوئے خون آلود پنجے۔ قرطبہ! ہم پھر آئیں گے، غرناطہ ہم پھر آئیں گے۔ ہم اپنی اذانوں کو تیرے میناروں میں اور اپنے سجدوں کو تیری محرابوں میں بطور امانت چھوڑے جا رہے ہیں۔ ہم تجھ سے اپنی امانتیں واپس لینے ایک دن ضرور آئیں گے۔ ہم دیوار گریہ کے ساتھ لگ کر نہیں روئیں گے۔ ہم اپنی خامیوں کے داغ بحیرۂ روم کے پانیوں میں دھوئیں گے۔ ہم اور اپنی عظمتوں کے یاقوت ابھرتے سورج کی روشنیوں میں چمکائیں گے۔ ہم تیرے الحمرا کے باغات میں کھلے ہوئے سیاہ گلابوں کو سینے سے لگا کر رکھیں گے اور تو ہماری بخشی ہوئی عظمتوں کو فراموش نہ کرنا۔ ہماری مسجد قرطبہ کے گنبد پر سورج کی کرنوں کو چمکاتے رہنا۔ ہمارے غرناطہ کی وادیوں میں سرو و شمشاد کے درختوں کی آبیاری کرتے رہنا، اور ہمارے الحمرا کے باغوں میں سیاہ گلاب کے شگوفے کھلاتے رہنا ___ ہم آج تجھے الوداع کہتے ہوئے تیری مسجدوں، تیرے باغوں، تیری وادیوں اور تیرے دریاؤں سے جدا ہو رہے ہیں اور کل تو ہم فاتحین کو خوش آمدید کہنے کے لیے فصیلِ شہر کے باہر اپنی سرزمین کے بہترین تحائف لیے کھڑا ہو گا۔ الوداع! الوداع! خوش آمدید! خوش آمدید!

ایک آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ ایک ماہتاب طلوع ہو رہا ہے یہ ماہتاب اُسی آفتاب کے نُور سے منور ہے۔ ہمارے تخت و تاج سے ٹوٹا ہوا سونا ہمیں دُور سے دکھا رہا ہے اُداس اور غمگین چاند کی اُداس روشنی میں مجھے غرناطہ کے کھنڈر اور اُن کھنڈروں کے اُجڑے باغوں

میں کمپنی باغ کے درخت سر جھکائے نظر آ رہے ہیں۔

کمپنی باغ ـــــ میرے غرناطہ کا الحمرا! جس کی روشوں پر میرے قدموں کے نشان سو رہے ہیں۔ جس کے درختوں پر میری محبتوں کے نام لکھے ہیں۔ جس کی برساتوں میں کوئلیں آج بھی میری یاد میں نوحہ کناں ہیں اور جس کی بہاروں میں آلوچے کے پھول شاخوں پر کھلے میری راہ دیکھتے ہیں اور شاداب نہروں کا پانی آج بھی میرا نام لے کر اپنے کناروں کو چوم کر گزرتا ہے۔ کمپنی باغ کی مشک بار ہوائیں میرے سانس میں ہیں۔ اس کے پھولوں کی خوشبو میرے خون میں ہے۔ امرتسر میں جب میں نے آنکھ کھولی تو میرے اوپر کمپنی باغ کے یوکلپٹس کے درختوں کا سایہ تھا۔ جب میں نے چلنا سیکھا تو میرے پاؤں تلے کمپنی باغ کی گھاس تھی اور جب میری پہلی محبت مجھے چھوڑ کر ڈولی میں سوار ہو کر اپنے گھر چلی گئی تو اس باغ کے خشک پتے میرے آنسوؤں کے ساتھ زمین پر گرتے تھے۔ اس کی سردیوں کی سنہری دھوپ، اس کی برساتوں میں گھنے درختوں سے ٹپ ٹپ گرتی جامنیں اور اس کی تپتی دوپہروں میں باغوں سے آتی گلاب کی گرم خوشبو اور نہر کنارے اگی ہوئی بھنگ کی جھاڑیوں کی تیز مہک اور ٹھنڈی کھوئی کا یخ پانی اور اوس میں بھیگے ناشپاتی کے پھولوں سے ٹپکتی شبنم ـــــ کمپنی باغ کو میں کس طرف سے لکھنا شروع کروں؟ اس کتاب کا کون سا صفحہ پہلے کھولوں؟ یادوں کے اس ویران شہر میں کس دروازے سے قدم رکھوں؟ کون سے درخت پر سب سے پہلے اپنی محبت کا نام پڑھوں؟ اس زندہ شوہر کی بیوہ کو کس نام سے پکاروں؟

اگر ہم ہال دروازے کی طرف سے کمپنی باغ میں داخل ہوں تو ہمیں انجمن پارک کے ساتھ ساتھ ریلوے پل کی چڑھائی چڑھنی ہوگی۔ انجمن پارک جہاں میں نے سب سے پہلے مسلم لیگ کے جلسے میں راجہ محمود آباد کی تقریر سنی اور پاکستان زندہ باد کے نعرے سنے۔ جہاں ہندو سبھا کالج اور ایم او کالج کے درمیان کرکٹ کے زبردست میچ ہوا کرتے اور مروت حسین کی باؤلنگ پر ہمارے دینیات کے استاد آیتیں پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارا کرتے تھے۔ آج اس انجمن پارک میں میوہ منڈی بن گئی ہے۔ چاروں طرف بیہودہ کھوکھے ہی کھوکھے لگے ہیں اور گلے سڑے پھلوں کا بیوپار ہوتا ہے اب نہ وہ انجمن ہے اور نہ پارک ـــــ ریلوے پل کی اترائی اتریں تو ایک جانب کرسٹل ہوٹل اور دوسری جانب وکٹوریہ جوبلی ہسپتال کا دروازہ۔ یہی وہ کرسٹل ہوٹل ہے جہاں میں نے اردو کی

ڈکشنری بیچ کر اپنی محبوبہ کو آئس کریم کھلائی تھی۔ اب سامنے کمپنی باغ ہے۔ ایک چھوٹی سی سڑک ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ساتھ شریف پورے کو نکل جاتی ہے۔ ایک سڑک ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ساتھ شریف پورے کو نکل جاتی ہے۔ ایک سڑک دائیں ہاتھ پر انگریزی گراؤنڈ کو چھوڑ کر سیدھی مجیٹھ روڈ کی طرف نکل جاتی ہے۔ اردگرد پھولوں کے تختے ہیں جگہ جگہ املتاس کے درخت اپنے زرد پھولوں کے گچھے لٹکائے ہوا میں جھوم رہے ہیں۔ ذرا آگے جا کر پرانے وقتوں کی بنی ہوئی ایک بارہ دری ہے جس کے بیچ میں سبز پانی کا حوض ہے یہاں سے گھنے درختوں میں گھرا ہوا کچا راستہ ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ کو نکل جاتا ہے۔ اس راستے میں تناور درختوں کے تنے کھود کر بیٹھنے کو کرسی نما جگہیں بنا دی گئی ہیں۔ بائیں ہاتھ کو پختہ روشوں کے بیچ میں فوارے لگے ہیں جو دور باغ کی شرقی جانب کے تختوں کو چلے گئے ہیں۔

اگر ہم رام باغ دروازے کی جانب سے کمپنی باغ کو چلیں تو ہمارے بائیں ہاتھ پہلے ہندو پان والوں کی دکانیں آتی ہیں جو پان میں ناریل کی گری، خشخاش، چینی اور خدا جانے کیا کیا ملا کر کھلاتے ہیں۔ ایک دکان میں گنیش اور کرشن کی تصویریں سجی ہیں جن کے سامنے ہر وقت لوبان سلگتا رہتا ہے۔ ایک طرف دھوتو والا گراموفون رکھا ہے، پاس ہی ریکارڈوں کا انبار لگا ہے۔ سونے کے دانت والا ایک لمبا سا ہندو آدمی بڑے زور سے گراموفون کو چابی دیتا ہے۔ مشین چلاتا ہے اور ساؤنڈ بکس کی سوئی گھماتے ریکارڈ پر رکھ دیتا ہے اور پھر دھوتو میں سے کسی عورت کی تیز اور تیکھی آواز بلند ہوتی ہے۔

چرا کے لے گیا ظالم میری زنجیر سونے کی۔
کبھی اسے کاش لیلیٰ کے گلے کا ہار ہو جاتا۔
ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے، جام ہے۔
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے۔
یا دل سے باز آجا یا دل نواز ہو جا۔

کبھی اختری بائی فیض آبادی، کبھی کملا جھریا، کبھی اندو بالا، کبھی بھائی چھیلا پٹیالے والا اور کبھی کلن خاں کی آوازیں ہمارا دور تک تعاقب کرتی ہیں اور ہم سیدھے ہاتھ پر عشق پیچاں کی بیل میں چھپتے ہوئے گرجا گھر کو پیچھے چھوڑتے جی ٹی روڈ کو عبور کر جاتے ہیں۔ اب ہمارے ایک طرف

ڈاکٹر موہن سنگھ کا آنکھوں کا ہسپتال ہے اور دوسری طرف عیدگاہ کی دیوار۔ ایک محرابی ڈیوڑھی میں سے دروازہ عیدگاہ کو جاتا ہے۔ کائی لگے حوض کے سبز پانی میں گرے پڑے پتے اور سنہری مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ جامنوں لدے گھنے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ حوض کی پرانی روشوں پر کالی سیاہ موٹی موٹی جامنیں گری پڑی ہیں۔ ہم برسات کے مینہ میں بھیگتے۔ سونٹیاں شپشپاتے خالی نیکریں پہنے، دوڑیں لگاتے یہاں آتے۔ خوب جامنیں کھاتے۔ نیکر کی جیبیں بھرتے اور شور مچاتے کمپنی باغ کے کچے کچے امرودوں پر حملہ کرنے بھاگ جاتے۔ اب ریل کا پھاٹک عبور کرتے ہیں تو بائیں ہاتھ پر اسی وکٹوریہ جوبلی ہسپتال کا مشرقی دروازہ ہے اور سامنے کمپنی باغ ہے۔ یہ کمپنی باغ کا سب سے پرانا دروازہ ہے مغلیہ طرز کی ایک کشادہ ڈیوڑھی ہے جس کے اوپر پرانے اندھیرے کمروں میں کمپنی باغ سے متعلق دفتر ہے عمارت کی پیشانی پر ایک بارہ دری ہے جس کا آدھا حصہ پھول دار بیلوں نے چھپا رکھا ہے۔ ڈیوڑھی کی فضا نیم روشن اور ٹھنڈی ہے سامنے کمپنی باغ کے ہرے بھرے دھوپ میں چمکتے ہواؤں میں جھومتے درخت نظر آرہے ہیں۔ ڈیوڑھی سے باہر نکلیں تو کونے میں ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی باؤلی ہے جس پر باؤلی کا گھنا درخت سایہ کیے ہوئے ہے۔ باؤلی کا شفاف پانی اچھل اچھل کر چھوٹے نالے میں بہتا باغ کی اس جانب جا رہا ہے جدھر لوکاٹ کے درختوں کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ اب ہم کمپنی باغ کی بڑی اور سب سے پرانی سڑک پر جا رہے ہیں سیدھے ہاتھ پر جامن کے پرانے درخت ہیں اور دوسری طرف آموں کے درختوں کی قطار چلی گئی ہے۔ بیچ میں کہیں کہیں چوڑے پتوں والے بھیڑے کے پیڑ بھی ہیں۔ سامنے پھر ایک پرانی مغلیہ طرز کی عمارت کھڑی ہے جس کے شرقی اور غربی پہلوؤں میں سنگِ مرمر کے حوض ہیں اور ان میں سرخ مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ کہتے ہیں اس عمارت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ آکر آرام کیا کرتا تھا۔ اب یہاں امرتسر میونسپل کمیٹی نے ایک لائبریری بنا دی ہے۔ باغ کی سیر کرتے کبھی میں اندر چلا جاتا تو محراب دار چھتوں والے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے میں ایک بڑی سی گول میز پر کچھ اخبار پڑے ہوتے اور کسی کونے میں کوئی بوڑھا لالہ یا ادھیڑ عمر کا مسلمان مطالعے میں محو ہوتا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں اس جگہ ایک لوکل ریڈیو سٹیشن بنا دیا گیا تھا جو کمپنی باغ میں جگہ جگہ لاؤڈ سپیکروں پر جرمنوں کے خلاف تقریریں سنایا کرتا اور کبھی کوئی شوقیہ فن کار ایک آدھ گیت بھی گا جاتا۔ شام کو یہاں سے فلمی گانے

نشر ہوا کرتے۔ ان دنوں امرتسر میں فلم انمول گھڑی بڑے زوروں پر چل رہی تھی، چنانچہ کمپنی باغ کے لاؤڈ سپیکروں پر نورجہاں کے گانے نشر ہوا کرتے۔ ایک روز میں بھی یہاں سے سہگل کا ایک گیت گا آیا تھا۔ آگے دونوں طرف ہرے بھرے گھاس کے میدان ہیں جہاں جگہ جگہ پھولوں کے تختے ہیں۔ سامنے ٹھنڈی کھوئی ہے جس کا پانی گرمیوں میں برف سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ کنوئیں کی ایک جانب ہندو پانی پلانے والا بیٹھا اور دوسری جانب مسلمان —— پانی دونوں جانب ایک ہی ہوتا تھا۔ اگر ہم مسلم ہائی سکول یعنی شریف پورے والے پھاٹک سے کمپنی باغ میں داخل ہوں تو سامنے بھائیوں والی نہر کا چھوٹا پُل آتا ہے۔ اس پل پر سے ہم نہر میں چھلانگیں لگایا کرتے تھے اس کے کنارے پل کے پاس ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور نہر کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا۔ یہاں پانی کی تہہ میں چھوٹے چھوٹے روڑے بہت ہوا کرتے تھے اور چھلانگیں لگاتے ہوئے اکثر ہمارے گھٹنے چھل جاتے۔ یہ نہر کمپنی باغ کو جاتی ہے۔ اس کی ایک جانب امرودوں کے وسیع باغ ہیں اور دوسری جانب کنارے کے ساتھ ساتھ کوٹھیوں کی قطار چلی گئی ہے۔ امرودوں کے باغ میں ہم ایم اے او سکول سے بھاگ کر پناہ لیا کرتے تھے۔ ساری دوپہر ہم باغوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے اور کچے امرود توڑ کر کھاتے۔ جب امرود پک جاتے تو باغ میں رکھوالوں کی ہو ہو کی آوازیں آنے لگتیں۔ پھر ہم نہر کی پرلی جانب شہتوت ڈالیوں پر آویزوں کی طرح لٹک رہے ہوتے اور پہر کی گرم فضا میں ان کی میٹھی خوشبو رچی ہوتی تھی۔

یہاں ایک کوٹھی کے برآمدے میں ستون کے ساتھ عشق پیچاں کی بیل چڑھی تھی جس کے کاسنی پھولوں کے سائے میں ایک ہندو لڑکی کرسی پر بیٹھی کبھی کتاب پڑھا کرتی اور کبھی سویٹر بنا کرتی۔ میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا۔ میں اس لڑکی سے عشق کرنے لگا۔ بچپن اور بڑھاپے کا عشق بڑا ظالم ہوتا ہے۔ لڑکی دبلی پتلی اور بادامی رنگ کی تھی۔ ماتھے پر سرخ بندیا لگی ہوتی۔ میں اسکول سے بھاگ کر اسے دیکھنے آتا۔ وہ مجھ سے بڑی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے سر کے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا کہ میں نہر کنارے بیٹھا اسے کیوں دیکھتا رہتا ہوں۔ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور کانسی کی تھالی میں دو لڈو لے آئی۔ اس نے مجھے لڈو کھلائے اور میرا کان آہستہ سے کھینچ کر

"خبردار جو تم پھر اسکول سے بھاگے۔"

مگر میرے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ میں ہر روز وہاں جا کر اس لڑکی کے درشن ضرور کرتا۔ ایک روز میں درختوں سے پکے پکے امرود توڑ کر اس کے لیے لے گیا۔ اس نے امرود لے لیے اور ہنس کر بولی۔

"تمہیں رکھوالے نے نہیں پکڑا؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے دیکھتا رہا۔ مجھے آج بھی اس کے ماتھے کی سرخ بندیا اور سفید خوبصورت دانت یاد ہیں۔ اس نے کاسنی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ ہنس کر کہنے لگی:

"ہم تو جا رہے ہیں ......"

اس اثنا میں اندر سے کسی مرد نے اسے بلایا اور وہ "آئی بھاپا جی" کہہ کر اندر چلی گئی۔ وہ دوبارہ باہر نہ آئی۔ میں اداس آنکھوں میں آنسو لیے کمپنی باغ کی طرف چل دیا۔ اگلے روز اس کوٹھی پر تالا پڑا تھا اور ہفتے بعد دوسرے لوگ وہاں آن بسے۔ اس کے بعد میں نے اس ہندو لڑکی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اب بھی جب کبھی میں سرخ انگور یا قرمزی شہتوت دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے کانوں میں لٹکتے آویزے یاد آ جاتے ہیں۔ خدا جانے آج وہ لڑکی کہاں ہوگی، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا بیاہ ہو چکا ہوگا۔ بچے ہوں گے، پتی ہوگا، اسے یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ کبھی ایک لڑکا نہر کنارے شہتوت کے پیڑ تلے کھڑا اس کے برآمدے میں نکلنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وقت نے اس کی نو عمری کی یادوں کو محو کر دیا ہوگا، لیکن میرے حافظے کی لوح پر یادوں کے نقوش وقت کے ساتھ ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مٹی میں بوئے ہوئے بیج اب تناور گھنے درخت بن کر میری محبتوں کے پرانے راستوں پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کی چھاؤں میں کہیں موتیے کے جھاڑ ہیں اور کہیں جنگلی گلاب کھلے ہیں۔ زندگی کے اسٹیج پر جب آخری ایکٹ کا پردہ گرے گا تو میں واپس موتیے کی خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے اپنی محبتوں کے ان پرانے راستوں میں نکل جاؤں گا، لیکن گم شدہ محبتوں کے خواب آلود جنگلوں میں نکلنے سے پہلے میں آپ کو کمپنی باغ کی سیر ضرور کراؤں گا۔

آیئے اب تحصیل پورے کی طرف سے کمپنی باغ میں داخل ہوتے ہیں۔

دروازہ مہاں سنگھ سے نکل کر جی ٹی روڈ عبور کرتے ہیں تو ایک طرف تحصیل کا دفتر ہے

اور سامنے کونے والی گھنی بیری تلے مائی کا کچا مکان ہے۔ اس بیری میں بڑے میٹھے لال لال بیر لگتے تھے۔ ہم ڈھیلے مار کر بیر گراتے تو مائی لاٹھی لے کر گالیاں دیتی اندر سے باہر نکل آتی اور ہم مائی کا منہ چڑاتے ایک ٹانگ پر ناچتے، ہنستے شور مچاتے نہر کی جانب بھاگ جاتے۔ مائی کی بیری سے ذرا آگے ایک طرف ہندو سکھوں کے مکان اور دوسری جانب لوکاٹ کے باغ شروع ہو جاتے ہیں۔ ہندو سکھوں کے مکانوں کے درمیان ایک چھتا ہوا کنواں ہے۔ اب ایک کچی پگڈنڈی لوکاٹ کے باغوں کے بیچ میں سے ریلوے لائن کو جاتی ہے۔ اس پگڈنڈی پر کھٹے اور لیموں کی ٹہنیوں پر سفید پھول کھلتے ہیں تو سارا راستہ خوشبو سے مہک جاتا ہے۔ صبح صبح سیر کرتے ہوئے جب میں اس چھتی ہوئی کچی پگڈنڈی پر سے گزرتا تو خوشبوئیں مجھے چاروں طرف سے لپیٹ لیتیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں کسی پھول میں سے گزر رہا ہوں ____ لوکاٹ کے باغ میں رسیاں بٹنے والے اپنے تکلے لگائے کام میں مصروف ہوتے۔ درختوں پر کیسری رنگ کی لوکاٹوں کے گچھے لٹکتے ہوئے۔ اب ریلوے لائن سامنے ہے۔ لیموں کی جھاڑیوں میں اس کی چمکتی ہوئی پٹڑی نظر آنے لگی ہے۔ ریلوے لائن کے پار مقبول پورے کی مسجد کے سفید مینار صبح کی سنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ سیر سے واپسی پر کبھی کبھی میں اپنے دوستوں کے ساتھ ورزش کرنے کے بعد اس چھوٹی سی مسجد کے سقاوے میں نہایا کرتا تھا۔ ہم نہر کی طرف سے پھلاہی کی مسواکیں کرتے ہوئے یہاں آتے۔ دھوتیوں کے پلو دانتوں میں داب کر لنگوٹ باندھتے بدن پر تیل ملتے۔ نارنج کی اوپر کو اٹھی چھریری ٹہنیوں والے درختوں کے پاس ڈنٹر لگاتے۔ ٹونٹی سے بوکے نکال نکال کر سقاوے میں پانی بھرتے اور سقاوے کے اندر ٹونٹی میں پھنسی ہوئی لکڑی یا مسواک نکال کر ٹھنڈے پانی کی موٹی دھار کے نیچے بیٹھ جاتے۔ مسجد کے باہر کیاریوں میں کیسری رنگ کے گیندے کے پھول کھلے ہوتے تھے۔ شریف پورے کے سامنے والی یہ آبادی خالص مسلمانوں کی "آبادی" تھی ۱۴ اگست کے بعد یہ لوگ بھی شریف پورے میں آ گئے تھے۔ یہاں آگے جا کر ایک نسبتاً کشادہ جگہ ملتی ہے۔ یہاں درختوں کے سائے اس قدر گھنے تھے کہ آسمان نظر نہیں آتا تھا۔ اس جگہ ایک ویران کنواں بھی تھا جس میں ایک بار میری چپل گر گئی تھی۔

اب کمپنی باغ کو جاتی نہر کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی ہے۔ اس ہوا میں مرطوب جھاڑیوں کی بو ہے۔ اس نہر پر آم کے درختوں کی چھاؤں ہے۔ یہ چھوٹی نہر ہے۔ اس نہر پر آم کے درختوں

کی چھاؤں ہے۔ یہ چھوٹی نہر ہے۔ یہاں سے مشرق کو ایک فرلانگ کے فاصلے پر دو موہنی کھوکر ہے یہاں ایک مندر ہے جس کے صحن میں ہندو، فسادات کے دنوں سے کچھ پہلے ورزش کیا کرتے تھے۔ نہر کے پار گاؤں کی آبادی ہے۔ یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے۔ کہیں کہیں نیم اور دھریک کے درختوں میں مسجدوں کے مینار نظر آ رہے ہیں۔ فسادات میں اس گاؤں کی اکثر آبادی شہید کر دی گئی تھی۔ یہاں ایک بار میں صبح سیر کرتے گزرا تو گاؤں میں شادی کی ڈھولک بج رہی تھی اور لڑکیاں ڈھولک کی تال پر گا رہی تھیں ؎

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی
دسے تجھے اپنے بابل کی گلیاں
خواب ہو جائیں گی ۔۔۔۔۔۔)

میں لوکاٹ کے گھنے باغ کو جانے والی چھوٹی سی ندی کی پلیا پر بیٹھ گیا اور دیہاتی لڑکیوں کا درد بھرا الوداعی گیت سننے لگا۔ میرے قریب ہی زرد لوکاٹوں کا ایک گچھا اپنی ٹہنی کو جھکائے ندی کے پانی کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا اور مٹیالا پانی ننھی ننھی لہروں کی صورت میں گزرتا چلا جا رہا تھا۔ گیت کے بول صبح کی شبنمی ہوا میں کبھی قریب آ جاتے اور کبھی دور چلے جاتے۔ خدا جانے ان لڑکیوں میں سے کسی کو پاکستان کی سرحد تک پہنچنا نصیب ہوا ہو گا یا نہیں! انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ جو کچھ گا رہی ہیں وہ ایک دن سچ ہو جائے گا اور انہیں بابل کی پیاری گلیاں بابل کا شفقت بھرا پیارا چہرہ خواب ہو جائے گا۔ میں نے لاہور آ کر سنا کہ اس گاؤں پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کر کے بے گناہ مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا مجھے وہ لڑکیاں یاد آ گئیں جو اپنی سہیلی کو دلہن بنا کر ڈھولک کی تھاپ پر اپنی بھولی بھالی آواز میں گا رہی تھیں ؎

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی

اب ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلتے کمپنی باغ میں آ گئے ہیں۔ یہ نہر اب کمپنی باغ کے بیچ میں سے گزرتی ہے۔ یہاں ایک کنارے پر آم کے درخت جھکے ہوئے ہیں اور دوسرے کنارے

پر دور تک ناشپاتی کا باغ پھیلا ہوا ہے۔ ہم اکثر نہر پار کر کے اس باغ میں گھس جاتے۔ درختوں سے بگو گوشے توڑ توڑ کر نیکر کی جیبوں میں بھرتے اور نہر میں کود کر ٹھنڈی کھوئی کی طرف بھاگ جایا کرتے تھے اسی نہر کے پاس لاہور کے گلستانِ فاطمہ کی طرز کا ایک بڑا ہی خوبصورت پلاٹ تھا۔ یہاں گلاب، گیندا اور طرح طرح کے اعلیٰ قسم کے پھولوں کے تختے تھے۔ جگہ جگہ سنگِ مرمر کے بنچ رکھے تھے جن کے پاس مور پنکھ کے پودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ پہلو میں ناشپاتی کا باغ تھا جس کے درخت بہار کے موسم میں سفید اور گلابی پھولوں سے بھر جاتے۔ انہی پھولوں میں، میں اپنی پہلی محبت سے آخری بار جدا ہوا تھا۔ وہ نسواری برقعے کا نقاب الٹے گھاس پر نظریں جھکائے بیٹھی اور میں سلکی قمیض، کلکتے کی چارخانہ دھوتی اور سلیپر پہنے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے اور پاسنگ شو کا سگریٹ میری انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو کچھ سفید اور گلابی پھول ٹوٹ کر ہم پر گر پڑتے۔ اس کی ناک میں سرخ رنگ دمک رہا تھا۔ سفید گالوں میں کشمیری سیب کی لالی تھی۔ لپ سٹک سے بے نیاز گلابی ہونٹوں کے اوپر پسینے کے موتی جھلملا رہے تھے اور اس کے کپڑوں میں سے سرخ حنا کی گرم، پُراسرار، سحر خیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ طوطوں کا ایک جھنڈ شور مچاتا ہوا ہمارے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے راجدہ کا ہاتھ آہستہ سے چھو لیا۔ جس طرح شام کی ہوا گیندے کے پھول چوم کر گزر جاتی ہے۔ راجدہ سمٹ سی گئی اور پھر جب اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خوشبو، گیندے کے پھول، ناشپاتی کے گلابی شگوفے تھے۔ راجدہ کی سیاہ آنکھوں میں جھلملاتے محبت کے ستارے تھے اور اڑتے پرندوں کے گیت تھے۔ ہم محبت میں جدا ہو رہے تھے اور یوں لگتا تھا گویا یہ ہماری محبت کی ابتدا ہے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی، لیکن یوں مل رہے تھے گویا پہلی بار مل رہے ہوں اور کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ محبت کی کوئی ابتدا اور انتہا نہیں ہوتی۔ یہ جس سمندر سے بادل بن کر اٹھتی ہے، قطرہ بن کر پھر اسی میں جذب ہو جاتی ہے شگوفہ بن کر جس مٹی سے پھوٹتی ہے، بیج بن کر پھر اسی خاک میں سما جاتی ہے۔ یہ اگر مغرب میں غروب ہوتی ہے تو مشرق میں ایک بار پھر طلوع ہو جاتی ہے۔

امرود کے باغوں میں طوطے شور مچانے لگے۔ ہم اٹھے اور گھر کی طرف چل دیئے۔ پرے باغ کے پلاٹ میں لڑکیاں جھولے جھلا رہی تھیں اور ان کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پاکستان

بن جانے کے بعد میں اس باغ میں آگیا تو نہ پردہ تھا نہ حجرے اور نہ باپردہ مسلمان لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے ــــــ پلاٹ کا گھاس سوکھ کر سیاہ ہو رہا تھا اور گارڈینیا کی پانچ فٹ اونچی باڑھ کو کاٹ کر زمین کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ جہاں ناشپاتی کے پیڑ ہوا کرتے تھے وہاں شرنارتھیوں نے کچے پکے بےہنگم مکان بنا ڈالے تھے اور جس جگہ میں نے راجدہ کا ہاتھ اپنی انگلیوں سے چھوا تھا اور جہاں ناشپاتی کے گلابی شگوفے ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے تھے، وہاں ایک موٹی پلپلی توند والا ہندو لالہ دھوئیں بھری دکان میں بیٹھا میلے میلے پکوڑے تل رہا تھا۔

اب میں اور راجدہ یوکلپٹس کے درختوں میں سے گزر رہے تھے۔ بائیں طرف کمپنی باغ کلب کی کائی زدہ دیوار پر ایک بادامی بلی بیٹھی تھی۔ اس نے ہمیں گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے دیکھا، منہ کھول کر انگڑائی لی اور کلب کی دیوار پھلانگ گئی۔ کلب کے اندر سے دو ایک بار بلیرڈ کھیلنے والی چھڑی کی ٹھک کی آواز آئی اور ہم خاموشی سے آگے گزر گئے۔ ایک ہفتے بعد راجدہ کا بیاہ ہو گیا، وہ دلّی چلی گئی میں کلکتے کی طرف نکل گیا۔ پاکستان بننے کے آٹھ برس بعد میں نے راجدہ کو میو ہسپتال میں دیکھا وہ اپنے ساتویں بیمار بچے کی دوا لینے ہسپتال آئی تھی اور میں راشن کارڈ بنوانے راشننگ آفس کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں نہ گرم حنا کی سحر انگیز خوشبو تھی اور نہ ناشپاتی کے گلابی شگوفے نہ میرے بدن پر ریشمی قمیض تھی اور نہ ـــ راجدہ کی ناک میں عقیق دمک رہا تھا۔ نہ خوبصورت طوطے گیت گاتے امرود کے جھنڈوں کو جا رہے تھے اور نہ ٹھنڈی نہر کی طرف سے چنبے گلابوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ رکشوں، بسوں، ٹرکوں کا شور تھا۔ بیماروں کی چیخیں تھیں۔ زرد مرجھائے ہوئے چہرے تھے۔ چوٹی سے ایڑیوں تک بہتا پسینہ تھا۔ گرمی میں جھلستے درختوں پر بیٹھے پیاسے کووں کی کائیں کائیں تھی اور بھاگتے، دوڑتے، گرتے پڑتے، گرگرا اٹھتے، اٹھ اٹھ کر گرتے، مرتے ہوئے لوگوں کے ہجوم تھے۔ راجدہ کے ہاتھوں میں مہندی کی جگہ بیمار بچہ تھا اور میرے ہاتھ میں گلاب کے شگوفے کی جگہ راشن کارڈ تھا ـــــ نہ راجدہ نے مجھے پہچانا نہ میں نے راجدہ کو پہچانا۔ وہ بیمار بچے کو لیے اور میں راشن کارڈ کو لیے آگے گزر گیا۔ پھر جیسے یادوں کے جنگل میں کسی نے ہم دونوں کو آواز دی۔ ہم نے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک پل کے لیے ہم ٹھٹھکے، رکے اور پھر چل دیے ـــ اُسے اپنے بیمار بچے کے لیے دوا لانی تھی اور مجھے اپنی بھوکی بہنوں کے لیے آٹا لانا تھا۔

اے میری محبت، میرے پھولو، میری یادو، میرے درختو، میری نہرو، میرے شگوفو، میری انار کلی! تجھے کس نے پتھر کی دیوار میں زندہ چن دیا؟ اے میری محبت!

اب کے بچھڑے کب ملیں گے؟

اے میری محبت! اے میری محبت!

راجدہ کا مکان گلی میں ہمارے مکان کے سامنے تھا پرانے چھجے والا مکان۔ کھڑکی پر چق پڑی رہتی۔ میں گلی میں سے گزرتا تو راجدہ چق کی تیلیوں میں دو انگلیاں ڈال کر اسے ذرا سا اپنی طرف کھینچتی اور مجھے گلی میں سے گزرتے دیکھتی۔ میں بالوں کو جھٹکنے کے بہانے اُسے دیکھتا۔ گلابی ناخنوں والی دو گوری انگلیاں اور سیاہ آنکھیں مجھے نظر آتیں اور میرا چہرہ خوشی سے کھل جاتا۔ میں گلی مڑتے ہوئے پلٹ کر اُسے تکتا۔ وہ چلمن کی اوٹ میں مجھے تک رہی ہوتی۔ دور سے مجھے اُس کی چمکتی آنکھیں اور کان میں دمکتا ہوا آویزہ دکھائی دیتا اور گلی والی مسجد کے گنبد پر سفید کبوتر چکر لگا رہے ہوتے۔ برسات کی جھڑیاں لگتیں تو وہ اپنے مکان کی چھت پر سے میری طرف آم پھینکتی اور میں انہیں دبوچ لیتا۔ کسی وقت جب وہ آم چوس کر گٹھلی میری طرف پھینکتی اور میں اُسے آم سمجھ کر شوق سے ہاتھوں میں دبوچ لیتا تو وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی اور اسے بار بار اپنے بھیگے ہوئے لمبے بال اوپر جھٹکنے پڑتے۔ عید شبرات پر جب وہ کرن گوٹ لگے نئے نویلے کپڑے پہن، عطر لگا کر میری بہنوں سے ملنے آتی تو ہم چھپ چھپ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ اور ہمارے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے۔ شادی بیاہ میں وہ ڈھولک پر گیت گاتی تو میں کسی نہ کسی بہانے کمرے میں جا کر اُسے گاتے ہوئے دیکھتا۔ اس کے مہندی لگے گورے ہاتھ ڈھولک بجا رہے ہوتے خوبصورت سیاہ بالوں والا سر ایک طرف کو ذرا سا جھکا ہوتا۔

کبھی میں اس کے گھر جاتا تو وہ کیلے رنگ کی گرم کشمیری شال اوڑھے پلنگ پر بیٹھی سویٹر بُن رہی ہوتی اور یا نمکین سبز چائے پی رہی ہوتی۔ سبز پھولوں والی جاپانی پیالی اُس نے نازک گلابی انگلیوں میں تھام رکھی ہوتی۔ ہونٹوں کا پھول چائے کا گھونٹ لیتے وقت سمٹ کر شگوفہ بن جاتا۔ سبز خوشگوار چائے حلق سے اتارتے ہوئے وہ آنکھیں بند کر لیتی پھر بڑی بڑی ریشمی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھتی اور ذرا سا مسکرا کر چائے پینے لگتی اور کھڑکی سے باہر چنبیلی کی تیز بارش اور تیز ہو جاتی اور

سبز چائے کی مہک اپنے ساتھ اڑا کر ان پہاڑوں پر لے جاتی جہاں چنار کے درختوں پر سفید برف گر رہی ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں منہ اندھیرے ماجدہ کے گھر کے نلکے میں پانی آتا تو اس کے نیچے رکھی ہوئی خالی بالٹی شور مچا دیتی۔ یہ صبح کے چار بجے کا الارم تھا۔ ماجدہ کی ماں اور بہنیں فوراً اٹھتیں۔ محلے کی دوسری عورتوں کو گھروں میں جا کر جگایا جاتا اور یہ ٹولی سیر کرنے کمپنی باغ کی طرف چل پڑتی۔ ماجدہ کا ادھیڑ عمر لنگوٹی چچا اس ٹولی کی قیادت کرتا۔ وہ کلکتے میں بیس برس تک شالیں بیچتا اور جوا کھیلا کرتا تھا۔ اور اب امرتسر میں رفوگری کرتا تھا۔ تانبے ایسی رنگت، گنجا سر، چہرے پر جھریاں، سخت مزاج، اکھڑ، بات بات پر گالی، بچے کے جیسے ڈاڑھی منڈواتا۔ فارسی کے ان گنت نصیحت آموز شعر اسے ازبر تھے اور ہر شعر کو وہ شیخ سعدی کی طرف منسوب کر دیتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ اکثر اردو اور پنجابی کے شعر بھی یہ کہہ کر سنایا کرتا تھا کہ یہ شیخ سعدی نے کہے ہیں۔ اس کا جواز وہ یہ دیا کرتا کہ شیخ سعدی سیلانی آدمی تھا۔ وہ پنجاب میں آیا تو اس نے پنجابی سیکھی اور پھر پنجابی میں شعر کہے۔

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی ہوتی کہ ہم کمپنی باغ میں داخل ہوتے۔ نیلے آسمان پر مشرق کی طرف نورانی جھلکیوں میں ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے ہوتے۔ باغ کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو چچا نہر کے کنارے بیٹھ کر اونچی آواز میں کلمہ شریف پڑھتے ہوئے زور زور سے کھانس کھانس کر وضو کرتا اور سنگِ مرمر کے بنچ پر نماز پڑھنے لگتا۔ عورتیں اور بچے نہر میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیتے۔ پو پھٹنے کی نیم روشن نیم تاریک فضا میں نہر کا ریتلا ٹھنڈا پانی پرسکون خاموشی سی سرگوشیاں کرتا بہہ رہا ہوتا۔ ہوا میں شبنم کی ٹھنڈک اور کچے امرودوں کی خوشبو رچی ہوتی۔ آلوچے کے پیڑوں کی ٹہنیاں گھاس پر اوس ٹپکا رہی ہوتیں۔

عورتیں ناشپاتی کے پیڑوں کی اوٹ میں نہاتیں۔ مشرق میں صبح کا ستارہ نمودار ہوتا۔ آسمان پر نیلی روشنی کا غبار مشرق سے مغرب کی طرف پھیلنے لگتا۔ باغ میں یہاں وہاں سیر کرنے والوں کے ہیولے دکھائی دینے لگتے اور ہم لوگ واپس اپنی گلی میں آ جاتے۔ ہم اپنے ساتھ پھولوں کے گلدستے بنا کر لاتے۔ گلاب، چنبیلی، مولسری اور ناشپاتی کے گلابی پھولوں کے دستے۔ کسی روز ہم آلوچے کی سفید پھولوں بھری ٹہنیاں ہی توڑ کر لے آتے۔ ہم اونچے مکانوں میں گھری ہوئی اپنی گلی میں داخل ہوتے

تو ہمیں گلی میں گھٹن سی محسوس ہوتی۔ ہمارے کپڑوں میں شبنم کی ٹھنڈک ہوتی اور شگفتہ پھولوں اور تر و تازہ سبزے کی مہک اٹھ رہی ہوتی۔ ایک دن ماجدہ نہر میں سے نہا کر بال نچوڑتی ہوئی باہر نکلی تو ہم مولسری کے درخت تلے پھول چننے لگ گئے۔ مولسری کے گول گول ننھی ننھی کرنوں والے پھول اندھیرے میں زمین پر تاروں کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ ہم نے بہت سے پھول اکٹھے کر لیے۔ میں نے اپنے پھول بھی ماجدہ کے دوپٹے میں ڈال دیے۔ ان پھولوں میں سے بڑی گہری اور شیریں خوشبو آ رہی تھی۔ ماجدہ مسکرائی۔ اس کے سفید دانت پچھلے پہر پو پھٹنے کے اندھیرے میں ناریل کی دودھیا گری کی طرح نظر آتے۔ اس نے گیلے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا تو میرے منہ پر نہر کے ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑی۔ اب اس پھوار میں جانی خوشبو بھی تھی۔ ٹھنڈی کھوئی والی مسجد کی طرف سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ چچا وضو کر رہے تھے۔ ہم دیر تک پھول توڑ توڑ کر گلدستے بناتے رہے اور جب ہم اپنی گلی کی طرف واپس جا رہے تھے تو کمپنی باغ کی جادو بھری خوشبوئیں ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔

کمپنی باغ والی مسجد ٹھنڈی کھوئی کے پہلو میں تھی۔ یہ چھوٹی سی خوبصورت مسجد پکتہ اور چمک دار پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ شام کو مسلمان سیر کرنے آتے تو وہاں باجماعت نماز ادا کرتے۔ پاکستان بننے کے بعد جب میں امرتسر گیا تو یہ مسجد ویران ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے پتھر اکھاڑ کر لے گئے تھے اور اس کے صحن میں لمبی لمبی جنگلی گھاس اگ آئی تھی۔ گرے ہوئے ستونوں کے اوپر گلہریاں بھاگ دوڑ رہی تھیں۔ محرابوں کی پتھریلی جالیاں توڑ پھوڑ دی گئی تھیں۔ یوکلپٹس کے درخت اپنی سوگوار ٹہنیاں جھکائے مسجد کے کھنڈروں کو چشمِ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تیری بادِ سحر میں

کمپنی باغ کی مسجد کے کھنڈر قرطبہ کی مسجد کا ماتم کر رہے تھے۔ غرناطہ کے بعد امرتسر کی بڑی بڑی مسجدیں ایک بار پھر مسلمانوں کی درد انگیز ہجرت کا المیہ دہرا رہی تھیں۔ وہ اپنے پتھریلے منبر و محراب کے سینے چاک کیے ہم سے پوچھ رہی تھیں کہ ہم انہیں کیوں چھوڑ گئے! کن کے

پاس چھوڑ گئے؟ کیا ہمارے ٹوٹے ہوئے میناروں سے اب کبھی اذان کی صدائیں بلند نہ ہوں گی؟ کیا ہمارے صحن میں اگر کوئی مسلمان خدا کے حضور میں سجدہ ریز نہ ہوگا؟ تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اذانوں کی دل نواز صدائیں اپنے ساتھ لے گئے اور بے آواز مناز میرے پاس چھوڑ گئے تسبیح کے سارے دانے اپنی جھولیوں میں ڈال کر لے گئے اور خالی رشتہ میرے ہاتھ میں چھوڑ گئے۔ تم مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے؟ کیا اب کبھی پلٹ کر نہ آؤ گے؟ مجھے بتاؤ میں اپنے سینے پر ٹوٹے ہوئے میناروں کا بوجھ رکھے کب تک تمہاری راہ دیکھتی رہوں گی؟ کیا میں اب کبھی تلاوت کی پُر شکوہ آواز نہ سن سکوں گی؟ اگر مجھے ایک روز بُت پرستوں کے حوالے کرنا تھا تو پھر میری پیشانی پر کلمہ طیبہ لکھ کر خدا کی وحدانیت کا اعلان کیوں کیا تھا؟ میں کمپنی باغ کے اس ویران کونے میں کھنڈر بنی پڑی ہوں میری محرابوں کی سلیں ہندوؤں کے غسل خانوں میں لگی ہیں۔ میری عبادت گاہ کے پتھر سکھوں کی ڈیوڑھیوں میں نصب ہیں۔ تم جہاں سجدہ کرتے تھے یہ لوگ وہاں پاؤں رکھ کر اپنے مکانوں میں داخل ہوتے ہیں۔ تمہارکا اذانیں ان کے ناقوس کے شور میں ڈوب گئی ہیں۔ اے خدا! اے خدا!

عج[illegible] ہے کہاں روزِ مکافات اے خدا! اے خدا!

کمپنی باغ کے منتظمِ اعلیٰ چوہدری نور الٰہی تھے۔ ان کا مکان ہماری گلی میں ہی تھا۔ دُبلے پتلے ادھیڑ عمر کے۔ نماز روزے کے پابند۔ بے حد با اخلاق۔ گلی میں سے گزر کر باغ کو جاتے تو ہر بڑے چھوٹے کو سلام علیکم کہنا کبھی نہ بُھولتے۔ رات گئے تک اُن کے گھر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز آیا کرتی۔ سفید پگڑی۔ بوسکی کی قمیض۔ کالی کنی والی سفید دھوتی اور پمپ شو۔ میں نے ہمیشہ ان کو اسی لباس میں دیکھا۔ باغ کی فضاؤں میں رہ کر رنگ نکھر گیا تھا۔ چہرے پر ملائمت اور پاکیزگی کی چمک تھی۔ کمپنی باغ کے وسط میں اُن کا دفتر تھا جہاں بہت بڑی نرسری بھی تھی۔ چھڑکاؤ کرنے والی کچھ شکستہ گاڑیاں وہاں پڑی رہتیں۔ چوہدری صاحب درختوں کی چھاؤں میں پھولوں سے لدے ہوئے گملوں کے پاس پڑی چارپائی پر بیٹھے مالیوں سے باتیں کیا کرتے۔ دور خشک پتوں کا ڈھیر سلگ رہا ہوتا۔ آج بھی جب کبھی مجھے جلتے ہوئے سوکھے پتوں کی خوشبو کہیں سے آجاتی ہے تو مجھے کمپنی باغ یاد آجاتا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک بار دوپہر کو میں کمپنی باغ سے املتاس کے زرد پھولوں کے چھ سات گچھے توڑ

کر بھاگا تو دو مالیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے ان کی منت سماجت بھی کی اور یہ بھی کہا کہ ہمارے گھر میں ختم شریف ہو رہا ہے۔ اُس کے لیے پھول لیے جا رہا ہوں۔ لیکن وہ نہ مانے اور مجھے پکڑ کر چوہدری نور الٰہی کے پاس لے گئے چوہدری صاحب نے مجھے دیکھا تو بولے،

"اوئے ایہہ تے جلیبے دا پُتر اے"

پھر مجھے ڈانٹ کر کہا،

"نٹھ جا اوئے"

اور میں زرد پھولوں کے گچھے اٹھائے گھر کی طرف بھاگ گیا۔

رمضان المبارک کے دنوں میں ہم سحری کھا کر سیدھے کمپنی باغ میں آجاتے میں اور میرے محلے کے دوست لڑکے۔ اُن دنوں روزے بڑی سخت سردیوں میں آیا کرتے تھے۔ مگر ہمیں سردی نہیں لگتی تھی۔ روزہ کھولنے اور سحری ختم ہونے کی نوبت بجانے کا ہمیں بڑا شوق تھا اس شوق میں ہم مسجد میں سب سے پہلے پہنچ جاتے۔ سحری کی نوبت بجا کر ہم اذان کی آواز کے ساتھ ہی پچھلے پہر کے نیم روشن اندھیرے میں گلیوں گلی کمپنی باغ کی طرف دوڑ لگا دیتے۔ راستے میں ہم بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر مکانوں کی دیواروں سے لگے فلمی پوسٹر بھی اکھاڑتے جاتے۔ تہہ در تہہ لگے ہوئے پوسٹر بڑی جلدی اتر جاتے۔ فلمی اشتہاروں کے نام یہ ہوتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں، زہری سانپ، جادوئی بنسری، ہند کیسری، دشمنت سیتا، شیل بالا، بھولا شکار، خدا دوست، شاہی لکڑہارا چنڈی داس، صبح کا ستارہ سیتا۔ بھگت پر ہلاد، ٹمبل گرل، بمبئی کی بی بی۔ دکن کوئین وغیرہ۔

کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک بڑا پرانا درخت تھا جس کی گھنی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ ہم ان اشتہاروں کو اس درخت کے نیچے لا کر ڈھیر کر دیتے اور انہیں آگ لگا کر اردگرد بیٹھ کر آگ تاپتے ـــــ پھر ہم درخت پر چڑھ جاتے اور لیڈی بھاور ناٹن کا کھیل کھیلتے۔ ایک ٹہنی کو پکڑ کر بندر کی طرح اچھلتے اور جھولتے ہوئے دوسری ٹہنی کو تھام لیتے اور وہاں سے تیسری شاخ پر جا پہنچتے۔

برسات میں کمپنی باغ کے پلاٹ بارش کے پانی سے لبالب بھر جاتے تو ہم ان میں پانی اچھالتے، لمبی لمبی دوڑیں لگاتے۔ ٹراتے مینڈکوں پر ڈھیلے برساتے۔ روشوں پر گری ہوئی

جامنیں اٹھا اٹھا کر کھاتے۔ نہر کی طرف نکل جاتے تو آم اور امرود کے درختوں پر ٹوٹ پڑتے۔ رکھوالے چوکس ہو کر ہماری طرف لپکتے تو ہم ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھرتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ جو سڑک میڈیکل کالج کو جاتی تھی اس پر جامن کے پیڑوں نے چھت ڈال رکھی تھی۔ کالج کی گراؤنڈ بڑی سرسبز تھی۔ کنارے کنارے چاروں طرف آم کے گھنے درختوں کا سایہ تھا۔ سڑک کے پار لڑکیوں کا ہوسٹل تھا۔ یہاں ہندو سکھ لڑکیوں کے علاوہ بٹالہ، گورداسپور، پٹھانکوٹ اور ہوشیار پور سے تعلیم حاصل کرنے آئی ہوئی مسلمان لڑکیاں بھی رہتی تھیں۔ اس علاقے میں اکثریت سکھوں کے بنگلوں کی تھی؛ چنانچہ امرتسر میں جب فسادات کا شعلہ بھڑکا تو اس ہوسٹل سے بہت کم مسلمان لڑکیاں نکل کر شریف پورہ کیمپ میں آسکی تھیں۔ وہ کہاں گئیں! وہ کہاں ہیں؟ اس کا جواب نہ میرے پاس ہے اور نہ اُن لیڈروں کے پاس جو امرتسر کی انجمن پارک اور گول باغ میں دھواں دھار تقریریں کیا کرتے تھے اور جو لاہور میں آج ایئرکنڈیشنڈ ڈرائینگ روموں میں نیم دراز اپنے سیکرٹریوں کو تازہ بیان قلمبند کروا رہے ہیں۔

انگریزی ہند راگراؤنڈ، ورٹنگھ پارک میں ڈی اے وی کالج، ہندو سبھا کالج اور کریسنٹ کلب اور ایم اے او کالج کے درمیان کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے۔ ہم ایم اے او اسکول میں پڑھتے تھے چنانچہ میچ کے روز چھٹی ہوتی۔ ہم بستے گھروں میں پھینک میچ دیکھنے کمپنی باغ پہنچ جاتے۔ زندہ دلانِ امرتسر ہجوم در ہجوم یہاں آئے ہوتے۔ قلچے چھولے، قیمے کے پکوڑے اور نان ہر لیسہ عام بک رہا ہوتا۔ سردیوں کی خوشبودار چمکیلی دھوپ میں لوگ منڈلیاں بنائے، دریاں اور قالین بچھائے بیٹھے میچ دیکھ رہے ہوتے۔ سبز سبز میٹھی مولیاں بیچنے والے گراؤنڈ کے چکر لگا رہے ہوتے۔ لنچ کا وقت ہوتا تو ایک کس کر باندھی ہوئی پگڑی والا سکھ ہاتھ سے گھنٹی بجاتا ساری گراؤنڈ کا چکر لگاتا۔ لوگ ہنستے، مذاق کرتے کھیل پر تبصرہ کرتے اور پھر کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے۔ ہم گراؤنڈ میں دوڑیں لگانی شروع کر دیتے، درختوں سے پتے توڑ توڑ کر ان کے تاج بناتے۔ اسی بھاگ دوڑ میں امپریل ہوٹل کی طرف نکل جاتے جس کے صحن میں بوڑھے انگریز آرام کرسیوں پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے ہوتے۔ وہ ہمارے شور غل سے تنگ آکر وردی پوش بیروں کو ہماری مرمت کو بھیجتے۔ مگر ہم چالاک چو بند امرتسری کشمیری لڑکے بھلا اُن کے ہاتھ کب آنے والے تھے۔

شام کو کرسٹل ہوٹل کے کیبنوں کی روشنی باہر نالے کے پانی میں جھلملایا کرتی۔ ہم نالے کی چھوٹی سی پلیا پر بیٹھے لوگوں کو شیشوں کے پیچھے آئس کریم کھاتے اور چائے پیتے دیکھا کرتے۔ ایک بار ہم سب لڑکوں نے آپس میں چندہ کر کے وہاں جا کر آئس کریم کھائی اور اُن کے دو گلاس توڑ کر بھاگ آئے۔

باغ کی لائبریری والی گراؤنڈ میں سردیوں میں پھولوں کی نمائش لگا کرتی۔ مختلف رنگوں کے گل داؤدی کے سینکڑوں گملے بڑے قرینے سے سجا دیئے جاتے۔ سخت کالروں میں پھنسی ہوئی تھی گردنوں والے افسر ہیڈ مالیوں کے ساتھ گھوم پھر کر پھولوں کا معائنہ کرتے اور نوٹ بک میں کچھ لکھتے جاتے ۔۔۔۔ تڑکے پھر اذان سے پہلے میں سیر کرتا اس گراؤنڈ میں پہنچتا تو گل داؤدی کے پھول ٹھنڈی یخ شبنم سے تربتر ہوتے۔ تاروں کی ہلکی ہلکی نورانی روشنی میں یوں لگتا جیسے بے شمار ولایتی گڑیاں اپنے رنگ برنگ ریشمی بال لٹکائے گملوں میں کھڑی ہیں۔ میں دونوں ہاتھوں میں گل داؤدی تھام کر اپنی آنکھیں گرم ہو جاتیں اور نیم گرم سوتی خوشبو میرے رگ و پے میں سرایت کر جاتی۔ پھر ٹھنڈی کھوئی کی جانب آم کے جھنڈوں کے پیچھے سورج طلوع ہو جاتا اور زرد، سفید، پنک، قرمزی اور گلابی گل داؤدی کے پھولوں پر شبنم کے قطرے زر و جواہر بن کر دمک اٹھتے۔ ایک ایک شبنم کے موتی میں سینکڑوں سورج طلوع ہوتے دکھائی دیتے۔ میری آنکھوں کی شبنم سے سورج کی سنہری کرنیں ٹکرا کر پھولوں کی شبنم پر منعکس ہوتیں اور وہاں سے پھر میری آنکھوں میں آکر چمکنے لگتیں۔ گویا میں ہزاروں سورجوں کے بیچ میں سورج بن کر پھولوں، شبنم کے موتیوں کے سورجوں اور کمپنی باغ کے درختوں، شاخوں، شگوفوں کے محور کے گرد گردش کر رہا ہوں۔ میں طلوع ہوتے آفتاب کی طلائی کرن بن کر صبح کی خوشبودار فضاؤں میں تحلیل ہو جاتا۔

کمپنی باغ میں سورج آج بھی طلوع ہوگا، لیکن صبح کیسی نہیں ہوتی ہوگی۔ مسنا ند میرے شبنم پھولوں پر گرتی ہوگی مگر ان کا منہ نہیں چومتی ہوگی۔ بادِ سحر آہیں بھرتی ہمیں یاد کرتی درختوں پر ہماری محبتوں کے نشانوں کو بوسہ دیتی چپ چاپ گزر جاتی ہوگی۔ ساون کی گھٹائیں باغ کے آسمان پر ہمیں ڈھونڈیں دے دے کر گرجتی ہوں گی۔ بارشیں اُجڑی ہوئی مسجدوں کے شگاف زدہ گنبدوں اور خزاں نصیب پیڑوں پر روتے ہوئے برستی ہوں گی۔ ٹھنڈا زرد چاند آم کے درختوں پر ٹھوڑی رکھ کر دیر تک باغ میں ہمیں تلاش کرتا ہوگا اور نہر کا پانی پچھلی شب کی نورانی روشنی میں کناروں کی گھاس پرے ہٹا کر اپنی آبی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے کی بے سُود کوشش کرتا ہوگا۔

آخر وہ خوبصورت، خوش پوش لوگ کہاں چلے گئے! کمپنی باغ ضرور سوچتا ہوگا۔ اسے کیا معلوم کہ بت جھڑ میں سوکھے پتے جس ٹہنی سے ٹوٹتے ہیں اس کے نیچے کبھی نہیں گرتے۔ ہوا میں چکر کھاتے، جدائی کے بے آواز نوحے پڑھتے، وہ ایک سسکی کے ساتھ زمین پر آکر بچھ جاتے ہیں اور پھر ہوا انہیں جدھر کو چاہے اٹھا کر لے جاتی ہے۔

میں کمپنی باغ کے درختوں کے پتوں کے ساتھ کئی بار ٹوٹ کر گرا ہوں اور ہوائیں مجھے اڑائے لئے پھرتی رہی ہیں۔ میں بھی تو ایک ہوں۔ جانے کس شاخ سے ٹوٹا کس سرزمین کی خاک پر آکر بچھ گیا اور اب ہوائیں کس دیس کو اڑائے لیے پھر رہی ہیں! کیا اب کبھی اپنی شاخ سے لگ کر پھول کھلتے دیکھنے نصیب نہ ہوں گے؟

کمپنی باغ! میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اُن پرندوں کو یاد رکھوں گا جو صبح دم تیرے درختوں کے جھنڈوں میں چہچہایا کرتے تھے اور ان کوئلوں کو جو ساون کی سیاہ کالی بھیگتی راتوں میں آم کے پیڑوں میں بولا کرتی تھیں اور لوکاٹ کے اُن زرد گچھوں کو جو تیری نہر کے شفاف پانیوں میں جھک کر اپنا عکس دیکھا کرتے تھے اور ان گلابی شگوفوں کو یاد رکھوں گا جو بہار میں تیری ناشپاتی کی ٹہنیوں پر کھلا کرتے تھے اور اُس اذان کو یاد رکھوں گا جو تیری مسجد کے گنبد سے بلند ہوا کرتی تھی اور اُن نورانی چہروں کو جو تیرے صحنوں میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ میں اس لیے یاد رکھوں گا کہ مجھے یہ سب کچھ تجھ سے واپس لینا ہے اور تو اُس لیے یاد رکھنا کہ ایک دن تجھے یہ ساری امانتیں ہمیں واپس کرنی ہوں گی۔

میرے غرناطہ! میرے اُندلس! میرے قرطبہ! ہم تیرے دریاؤں میں ڈوبے ہوئے اپنے موتیوں کی غواصی کرنے ایک دن ضرور آئیں گے۔ ہم اپنے تاج، اپنے زرہ بکتر اور اپنی تلواریں آنے والی نسلوں کو دلانے کے لیے عجائب گھروں میں نہیں رکھیں گے۔ ہم اللہ کے نام پر اپنی تلواروں کو بے نیام کریں گے اور اللہ کے لیے تجھے ایک بار پھر حاصل کریں گے۔ ہماری مسجدوں کے میناروں، ہمارے عظیم کتب خانوں کے گنبدوں اور ہمارے الحمرا کے باغات کے پھولوں بھرے تختوں پر سورج کو طلوع ہوتے دیکھ۔ اپنی سبز پوش وادیوں کی فضاؤں میں ہمارے رجز یہ اشعار کی آگے بڑھتی ہوئی آواز سن! اور اپنے قلعوں کی رنگ خوردہ فصیلوں پر کھڑے ہو کر دور گرد و غبار میں ہمارے شہسواروں کی چمکتی ہوئی تلواریں دیکھ اور اپنی خندقوں پر پُل گرا دے اور شاہی قلعوں کے دروازے کھول دے۔

میری کھڑکی سے باہر سفیدے کے درختوں میں سُرخ زہرہ سیارہ انگارے کی مانند دہکنے لگا ہے۔ اس سیارے نے میرے چہرے کو سُرخ کر دیا ہے اور یہ سُرخی ہے عظمت، غیرت اور شکوہ کی — دود صیا گنبدوں کو چمکاتے سورج طلوع ہو رہے ہیں۔ پنجے ٹوٹی ہوئی تلواروں کے قبضوں پر جمے ہیں۔ گرد آلود پاؤں رکابوں میں پیوست ہیں اور جھاگ اڑاتے، ہنہناتے گھوڑوں کی گردنیں تنی ہیں۔ ڈوبا ہوا سورج روشنی کے تخت پر بیٹھا ایک بار پھر مشرق سے ابھر رہا ہے۔

طلوع ہو! طلوع ہو اے میرے اللہ کی عظیم نشانی! میں اندھیروں میں کھڑا ہوں اور تیرے طلوع ہونے کا وقت آن پہنچا ہے ؎

کون سی منزل میں ہے کون سی وادی میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

اَمرتسر کی ایک گلی

پاکستان بن جانے کے سات آٹھ برس بعد جب میں پہلی بار امرتسر گیا، تو ہال بازار والے سندھ شکار پور ہوٹل میں ٹھہرا۔ کل امرتسر میرا گھر تھا، لیکن آج وہ مجھے اجنبیوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میں بھی وہاں اجنبی تھا۔ سکھ اور ہندو دوستوں کے گھر ٹھہرنا مجھے پسند نہ تھا۔ اس لیے کہ ان کے گھروں سے ہمیشہ ایک خاص قسم کی بُو آیا کرتی، جو مجھے ناگوار تھی۔ میں پَو پھٹے ہوٹل سے نکلا اور کمپنی باغ کی سیر کرتا ہوا اپنے محلے کی جانب آ گیا۔ اپنی گلی میں داخل ہوا، تو امرتسر کی صبح کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ سب سے پہلا فرق جو میں نے گلی میں داخل ہوتے ہی محسوس کیا وہ یہ تھا کہ کسی بھی مکان کی کھڑکی یا دروازے پر چق نہیں تھی۔ پردہ داری اور حیاداری مسلمانوں کے ساتھ ہی پاکستان چلی گئی تھی۔ چقوں کے بغیر کھڑکیوں پر مجھے ان حیا باختہ آنکھوں کا گمان ہوا جن کی پلکیں غائب ہو چکی ہوں۔ اکثر مکانوں کے پٹ کھلے تھے اور ڈیوڑھیوں سے دالانوں تک نظر جاتی تھی۔ آٹھ برس پہلے یہ گلی ایک برقعہ پوش خاتون تھی اور آج کسی طوائف کی طرح کھڑکی میں بیٹھی راہ چلتوں کو اشارے کر رہی تھی۔

مکانوں کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ دوسری منزلوں کے چھجے مزید جھک گئے تھے۔ منڈیریں ڈھے چکی تھیں۔ رضیہ کے مکان کا دروازہ کھلا تھا اور جس دیوان خانے میں وہ شہزادیوں جیسے وقار کے ساتھ قالین پر بیٹھ کر سلائی مشین پر اپنی دیورٹ کی قمیض سیا کرتی تھی وہاں اب ایک گائے بندھی تھی۔ میں نے مکان کے آگے سے گزرتے ہوئے رضیہ کو یاد کیا، تو گائے نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے گائے سے پوچھا "ان گھروں میں سرگوشیوں میں باتیں کرنے والی اور بے داغ میز پوشوں پر بیلے خوبصورت پھول کاڑھنے والی شریف زادیاں کہاں چلی گئیں؟" گائے

نے کوئی جواب نہ دیا اور میں حاجی قمر دین شال مرچنٹ کے مکان کو تکنے لگا۔ جس کی تیسری منزل کے چھجے پر اخروٹ کی لکڑی کا کام کیا گیا تھا۔ وہاں اب سوائے ملبے کے ڈھیر کے اور کچھ نہ تھا۔ مسجد عبدالرحمٰن کے صحن کو توڑ کر وہاں پیپل کا درخت اگا دیا گیا تھا۔ محرابوں پر "اوم" لکھا تھا اور منبر پر کرشن کی مورتی رکھی تھی۔ اس مسجد کے سامنے ہمارا مکان تھا ——— ہمارا پہلا مکان۔ جس کے دیوان خانے میں بیٹھ کر میں خلیل جبران کے ترجمے پڑھا کرتا تھا اور جس کے آگے تخت پر سماور گرم کیے میرے دادا جان اپنے دوستوں کے ساتھ میٹھی کشمیری چائے پیا کرتے اور پہلوانوں، دنگلوں اور مشہور کشتیوں کی باتیں کیا کرتے۔ جس کے دالان میں موتیے، رتن جوت اور عشق پیچاں کے گملے رکھے ہوئے تھے اور گرمیوں کی راتوں میں موتیے کی میٹھی خوشبو سے سارا گھر مہک جاتا۔ اس مکان کو میں پہچان نہ سکا۔ اس کا دروازہ اکھڑ چکا تھا۔ دوسری منزل غائب تھی۔ جس دیوان خانے میں بیٹھ کر میں خلیل جبران کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، اس کا آدھا پٹ کھلا تھا اور اندر ایک بوڑھی ہندو عورت فرش پر گائے کے گوبر کا لیپ کر رہی تھی۔ جہاں میرے دادا جان تخت پوش پر سماور گرم کیے کشمیری چائے پیا کرتے تھے وہاں ایک بودی والا ہندو لالہ باسی پکوڑوں کی چھابڑی سجائے سیتا رام سیتا رام کا جاپ کر رہا تھا۔

ماسٹر رفیق سنار کی دکان میں ایک موٹی توند والا سکھ حلوائی بیٹھا اپنے گندے گندے ہاتھوں سے لسی بنا رہا تھا۔ ماسٹر رفیق بڑا صاف ستھرا نوجوان تھا۔ وہ دکان کو شیشے کی طرح چمکائے رکھتا۔ دیوار آلتی پالتی مارے بیٹھا لاکھ میں جڑی سونے کی انگوٹھی میں نگینے جڑ رہا ہوتا۔ اس کے بال نسواری تھے، آنکھیں شفاف اور بے داغ تھیں۔ دانت صحت مند مونگ پھلی کے زردی مائل سفید دانوں کی طرح ہموار اور خوبصورت تھے۔ سلام کرتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ نعت بھی پڑھتا جاتا۔

نبی جی کرو ستاد دکھیاریاں نوں
مصیبت دے غم دیاں ماریاں نوں

اسے ہم ماسٹر پھول ہی کہا کرتے تھے۔ وہ محلے کی نعتیہ پارٹی کا صدر بھی تھا۔ ان دنوں میں بھی میلاد کی محفلوں میں نعتیں پڑھا کرتا، چنانچہ ماسٹر رفیق مجھے ہر محفل میلاد میں اپنے ساتھ لے جاتا۔ قرمزی پھول دار رومال میرے گلے میں ہوتا جسے میں نعت پڑھتے ہوئے سر پر کر لیتا۔ جاجم پر طشتوں میں پھل مٹھائیاں، چھوہارے، مکھانے سجے ہوتے۔ آٹا بھرے پیالوں میں لگی ہوئی اگربتیاں اپنا خوشبودار

دھواں پھیلا رہی ہوتیں۔ تھوڑی دیر بعد کوئی اہلِ محفل گلاب دانی لیے اٹھتا اور ہم پر گلاب کا عرق چھڑک دیتا۔ نعت پڑھتے ہوئے میری آنکھیں بند ہوتیں۔ جب گلاب کے عرق کا ٹھنڈا اور خوشبودار قطرہ میری بند پلکوں، ہونٹوں اور گالوں پر پڑتا تو مجھے روحانی سرور ملتا۔ محفلِ میلاد سے واپسی پر ہمیں الگ الگ تبرک ملتا جسے ہم اپنے اپنے رومالوں میں باندھ لیتے۔

ماسٹر رفیق کی دکان پر اس کے دوست بیٹھے اکثر سہگل کانن بالا، ماسٹر نثار اور اس دور کے مشہور فلم ایکٹروں کی باتیں کیا کرتے۔ دراصل ماسٹر رفیق کو فلم میں کام کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ خوش شکل تھا۔ آواز سُریلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر نیو تھیٹرز فلم کمپنی والے اسے بلا لیں، تو وہ سہگل سے کم ثابت نہیں ہوگا۔ میں ہر روز صبح سامنے والی مسجد کے سقاوے میں نہایا کرتا۔ ماسٹر رفیق بھی روزانہ اسی مسجد میں آکر نہایا کرتا۔ وضو کرنے والی ٹونٹیوں کے سامنے بیٹھا وہ کتنی ہی دیر مسواک کرتا۔ پھر کالی نوس ٹوتھ پیسٹ سے رگڑ رگڑ کر دانتوں کو صاف کرتا۔ اس کے بعد سقاوے میں لکس اور پام آلیو صابن سے خوب مَل مَل کر نہاتا۔ مصیبت یہ تھی کہ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ گورا ہو جائے۔

سنتوکھ سر والی گراؤنڈ میں ایک تھیٹریکل کمپنی نے آکر تمبو لگائے۔ تو خدا جانے کس کی سفارش سے ماسٹر رفیق کو ایک روز وہاں کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ رات کے بارہ بجے تھیٹر سے گھر واپس آیا تو منہ پر لگی سُرخی پاؤڈر سمیت ہی سو گیا۔ صبح مسجد میں آیا، تو لوگوں نے پوچھا۔

"ماسٹر! یہ منہ پر کیا لگا ہے؟"

"میک اپ ہے اور کیا ہے؟"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماسٹر رفیق اپنے اور اپنی دکان کے میک اپ کا ہر لحظہ خیال رکھتا تھا مگر آج اس کی دکان کا میک اپ اُجڑ چکا تھا۔ جس جگہ وہ قالین کا ٹکڑا بچھا کر اسے ہر روز بُرش سے صاف کیا کرتا تھا، وہاں آج چوکی پر میل سے بھرا ہوا بوریا بچھا تھا جس پر میلا کچیلا توندیل سکھ بیٹھا لسّی بنا رہا تھا۔ میں آگے نکل گیا۔ ممے جولاہے کے مکان کی ڈیوڑھی ڈھے گئی تھی۔ پچھلے دروازے پر سوراخ دار بوریا پڑا تھا جس کے آگے جھلنگا سی چارپائی پر ایک بیمار بوڑھا بندھو لیٹا کھانس رہا تھا۔ مگر اب وہ شالوں کی رفوگری کا کام کرتا تھا۔

گل خان بڑے بڑے گل گچھوں والا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ جس کا گلی کے پچھلے کونے میں چائے خانہ تھا۔ چائے خانہ دراصل برائے نام ہی تھا۔ وہ اپنے چوبارے پر جوا کرواتا تھا۔ ہر جمعے کی جمعے ختم شریف بھی کرواتا اور رو رو کر گڑگڑا کر خدا سے اپنے پچھلے ہفتے کے گناہوں کی معافی مانگتا۔

مسجد خیرالدین کے جگمگاتے صحن میں ہم مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی پُرجوش اور ایمان افروز تقریریں سُنا کرتے تھے۔ آج اس کی محرابوں میں دراڑیں پڑی تھیں۔ صحن والا حوض خشک ہو چکا تھا جس میں جال لگا کر دو سکھ لڑکے چڑی چھینکا کھیل رہے تھے۔ وضو کرنے والے بڑے نلکے کے ساتھ ایک گائے بندھی تھی۔

مسجد جان محمد میں لائل پور کے سکھوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ خطیب مسجد مولوی سلام بابا مرحوم و مغفور کے حجرے میں ایک سکھ مرد کچھا پہنے چارپائی پر بیٹھا اپنے گیلے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں مولوی سلام بابا کا بھرا بھرا شیر ایسا گول پُرنور کشمیری چہرہ گھوم گیا۔ ان کی بارعب کڑک دار آواز مسجد میں گونجا کرتی تھی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کبھی انہوں نے زبان سے پورا ادا نہ کیا تھا۔ حضورؐ کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی مولوی صاحب کی ہچکی بندھ جاتی۔ میں نے کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مولوی صاحب جمعے کا خطبہ دے رہے ہیں۔ حضورؐ کا نام زبان پر آیا اور زار و قطار رونے لگے۔ آنکھوں سے دیکھا۔ مولوی صاحب جمعے کا خطبہ دے رہے ہیں۔ حضورؐ کا نام زبان پر آیا آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ہچکی بندھ گئی۔ ہائے! کیسے کیسے مردانِ پاک طینت و مردانِ حق آگاہ تھے کہ جن کے سوز و گداز سے زمین کا دامن خالی ہو گیا۔

مسجد قاصداں کے دونوں میناروں پر اکالی سکھوں نے اپنے زرد جھنڈے گاڑ رکھے تھے اور اس کی محرابوں پر سکھ عورتیں اوپلے تھاپ رہی تھیں۔ یہ وہی مسجد تھی جس کے در و دیوار جمعے کے روز مولانا غلام محمد ترنم کی ولولہ انگیز تقریروں سے گونجا کرتے تھے۔ شہر کے دور دراز محلوں سے مسلمان مسجد قاصداں میں مولوی ترنم کی تقریر سننے آیا کرتے۔ سیاہ کالی گھنی ڈاڑھی، گٹھا ہوا مضبوط بدن، چوڑا چکلا ہر وقت مسکراتا ہوا نورانی چہرہ ــــ مولوی ترنم گیندے اور سرخ گلاب کے ہاروں سے لدے پھندے جب منبر پر چڑھتے، تو نمازیوں میں عقیدت اور جوش کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ مسجد کا صحن، ہال کمرہ، چھتیں اور گلی نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ مسجد کا صحن،

ہال کمرہ، چھتیں اور گلی نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ چھت پر تنبو قناتیں لگی ہوتیں جہاں پردہ دار بیبیاں ہمہ تن گوش ہوتیں۔ مولوی ترنم عشق رسالت مآب میں سرشار آنکھوں سے مجمع پر نگاہ ڈالتے۔ والہانہ انداز میں گردن کو دائیں بائیں گھماتے اور پھر جیسے خدا کے حضور میں مؤدب ہو کر آنکھیں بند کر لیتے اور لبِ معجز نما سے یہ الفاظ نکلتے:

نحمدہٗ و نصلی ......

اس کے بعد خطابت و بلاغت کا ایک دریا بہہ نکلتا جو پُرپیچ وادیوں کے ٹیلوں سے ٹکراتا کھاتا کو پر کرتا، سنگلاخ چٹانوں کو پیچھے چھوڑتا بالآخر ایک بحرِ زخار میں جا ملتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار محرم کے جلوس میں مولانا ترنم شہدائے کربلا کا ذکر کر رہے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ چھت پر عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

مولانا ترنم تبلیغِ دین کے لیے گلی گلی محلے محلے جا کر جلسے کیا کرتے۔ ان کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی۔ تقریر کرتے ہوئے ایک آدھ جملہ سامعین پر کچھ اس طرح چست کر جاتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ ان دنوں امرتسر کے سینما گھروں میں بدھ وار سپیشل زنانہ شو نیا نیا شروع ہوا تھا۔ ترنم صاحب ہمارے محلے میں بعد از نماز عشاء تقریر کر رہے تھے۔ گلی میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مکانوں کی چھتیں اور کھڑکیاں عورتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ تقریر کرتے کرتے مولانا نے زنانہ فلمی شو کی بات شروع کر دی۔ اچانک مکانوں کی منڈیروں کی طرف دیکھ کر بولے۔

”اکوں وات نہ سٹ دینا“

پھر انھوں نے نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ بدھ وار کو فلمی شو پر جانے کے لیے کس طرح ایک دوسری کو اکٹھی کرتی ہیں۔

”نی سکینہ! اج منڈوے چلنا ایں۔ روٹی جلدی پکا لئیں“

”نی دلاں! جلدی جلدی کپڑے دھو۔ اج بدھ وار اے“ لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے

پھر فوراً ہی مولانا ترنم کا لہجہ پُرعتاب ہو جاتا اور کہتے۔

”سنو! ہماری بیٹیوں اور بہنوں کو تو خدا کے حضور میں جانے کی تیاریاں کرنی چاہییں تھیں“

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

ایک جلسے میں کشمیری گھرانوں کی شاہ خرچیوں اور خاص طور پر بیاہ شادیوں کے موقعہ پر ان کی خوش خوراکی اور بے جا اسراف پر تقریر کر رہے تھے کہ شادی کی دعوت کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا۔

”دیگیں کھل گئی ہیں۔ دستر خوان لگ گئے ہیں۔ پلاؤ کی مہک اڑنے لگی ہے۔ زردہ، بریانی متنجن سے بھرے ہوئے قاب جا رہے ہیں۔ اوئے چیدے قورمہ ہور دے جا۔ کاکا جی! پٹھ دی بوٹی بھیج دیا جے بی صغراں! متنجن دا اک قاب دے جا“

لوگ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے۔ اچانک مولانا ترنم کا لہجہ بدل گیا۔ بجلی کی طرح کڑک کر کہا۔

”شرم کرو! ہنستے ہو! کیا تمہیں یاد نہیں ہمارے نبی اکرمؐ نے پیٹ پر پتھر باندھے تھے۔ ان کے گھر میں فاقہ آ جاتا تھا۔ مسلمانو! تم کہاں سے چلے تھے اور کہاں آ گئے ہو! .....“

اس کے بعد اسلامی تاریخ کے اوراق کچھ ایسے دلگداز انداز میں الٹنا شروع کرتے کہ وہی مجمع جو ایک منٹ پہلے ہنس رہا ہوتا سسکیاں بھرنے لگتا۔

اب میں اپنی گلی کی لال حویلی کے سامنے سے گزر رہا ہوں۔ اس حویلی سے محرم کے سوگوار دنوں میں جلوس نکلا کرتا تھا۔ ہم اپنے بازار میں محرم کے جلوس کا بے تابی سے انتظار کیا کرتے۔ جب لکڑ منڈی کے چوک میں سیاہ علم نظر آتا، تو ہم بھاگ کر جلوس میں شامل ہو جاتے۔ سوز خوانوں کی آواز میں آواز ملاتے۔ ماتم والوں کے پیچھے پیچھے چلتے جاتے۔ مکانوں کی چھتوں سے عورتیں جلوس پر پتیاں اور گیندے گلاب کے پھول نچھاور کرتیں۔ جو پھول جلوس سے نیچے سڑک پر گر پڑتے ہم انہیں فوراً اٹھا کر چومتے آنکھوں سے لگاتے اور جیب میں رکھ لیتے۔ ہماری والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ جلوس سے سڑک پر گر پڑتے تو ہم انہیں فوراً اٹھا کر چومتے۔ آنکھوں سے لگاتے اور جیب میں رکھ لیتے۔ ہماری والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ جلوس سے گرا ہوا پھول چوم کر گھر لے آنا۔ وہ ان پھولوں کو چینی کے مرتبانوں میں سنبھال کر رکھا کرتی تھیں۔ مہندی کے دن محلے کے ہر گھر سے ریشمی سُرخ دوپٹے لے کر ہم ان کے علم بنا کر تانگوں میں بیٹھ جاتے اور سوز خوانوں کی معیت میں آدھے شہر کا چکر لگاتے۔ ہماری گلی سے کئی تعزیے نکلتے۔ رام باغ والا تعزیہ اپنی لکڑی کے بے مثال کام اور آٹھ منزلہ ہونے کی وجہ سے سارے محلے میں اول تھا۔ نویں محرم کو شبیہہ ذوالجناح ہمارے محلے سے گزرتی تو گتکے بازوں کی ٹولیاں آگے آگے ہوتیں۔ شیعہ سُنّی کا وہاں کوئی سوال نہ تھا۔ سب اسلام

کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے ـــــ امرت سر میں محرم کے دنوں میں ہندو مسلم فساد ضرور ہو جاتا جس میں مسلمانوں کا پلّہ ہمیشہ بھاری رہتا۔ پٹ رنگوں کا تعزیہ گورو بازار یعنی ہندوؤں کے گڑھ سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہندو ضرور شرارت کرتے۔ مسلمان بھی ہر قسم کے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم لے کر نکلتے تھے۔ ایک دفعہ یہ تعزیہ کرموں ڈیوڑھی کے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ ایک ہندو حلوائی نے جو پوڑیاں تل رہا تھا چھلنی سے گرم گرم کھولتا ہوا گھی مسلمانوں کی طرف اچھال دیا۔ مسلمان "نعرۂ تکبیر" اور "یا علی" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ دکان پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے لمحے دکان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

لال حویلی میرزا بیضا خان مروی ایرانی کے آباؤ اجداد نے بنائی تھی۔ میرزا صاحب بڑے کم گو حلیم الطبع، خوش اخلاق، خوش وضع اور خوش فکر شاعر تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ہم آٹھویں نویں میں پڑھا کرتے تھے، ان کی علمیت کا اندازہ نہ لگا سکتے تھے، لیکن میرزا صاحب اپنے دیوان خانے میں کبھی کبھی شعر و سخن کی محفل گرم کرتے، تو میں ضرور گھس گھسا کر کہیں نہ کہیں بیٹھ جاتا۔ اہلِ محفل میرزا صاحب کے شعروں پر خوب داد دیتے ـــــ آج میرزا بیضا خاں مروی ایرانی کی شمعِ محفل سیاہ پوش رہی تھی۔ لال حویلی کی منڈیروں پر سوکھی گھاس اُگ رہی تھی۔ ڈیوڑھی میں ایک گائے کھڑی کونے میں پڑا نمک کا ڈلا چاٹ رہی تھی۔ میرزا صاحب کے دیوان خانے میں ایک موٹی لالائن چرخہ کات رہی تھی اور اس کی زرد رو بچی پاس ہی بیٹھی رو رہی تھی۔ بہار کا کارواں گزر گیا اور اپنے پیچھے ایک ایسی خزاں چھوڑ گیا جس کی بہار کبھی نہیں آئے گی۔ راستے خون اور مٹی میں چھپ گئے۔ گرے ہوئے پتوں کو ظلم کی ہوا اڑا کر لے گئی۔ پھر کسی دور کسی سمت اور کسی گلشن میں نہ ملنے کے لیے اڑا کر لے گئی۔ سورج غروب ہوا۔ اندھیری رات چھا گئی اور پھر اس رات کی کوئی صبح نہ ہوئی، کوئی سورج نہ نکلا۔ کسی مشرقی افق کی گود سے سنہری کرنوں نے طلوع ہو کر خاک بسر مرجھائے ہوئے پھولوں کا منہ نہ چوما۔

بچپن میں میں نے ایک پنجابی شعر سنا تھا۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی صبحوں کو ایک پوپھٹے گلی میں سے گاتا گزر جاتا ـــــ

تینوں سفنا ہو جان گیاں

بابل دیاں گلیاں نی،

[illegible] بابل کی گلیاں ایک دن خواب ہو جائیں گی،

میں اپنے لحاف میں دبکا اس فقیر کی درد بھری آواز سنتا اور پھر سو جاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا سچ مچ ایک روز بابل کی گلیاں خواب و خیال بن کر رہ جائیں گی۔ کوئی ہمیں نہیں پہچانے گا۔ مسجدیں اُجڑ جائیں گی۔ ان کے میناروں کے سنہری کلس مندروں کی بُرجیوں پر لگا دیے جائیں گے۔ مکانوں کے چھجے جھک جائیں گے اور چھتوں پر پڑی چلمنیں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ چھتوں کی منڈیروں پر سوکھی گھاس اُگ آئے گی۔ گلیاں ننگی اور بے حیا ہو جائیں گی اور ہر گھر دہلیز سے لے کر عقبی کمرے تک عریاں دکھائی دے گا۔ اس گلی کے سر پر سے چادر کس نے کھینچ لی تھی؟ اس کا سہاگ کون لوٹ کر لے گیا تھا؟ کل تک یہ گلی میرے نصیبے کی مانگ تھی اور اس مانگ میں سہاگ کا زعفران مہک رہا تھا اور جوڑے میں موتیے کے سفید پھول مسکرا رہے تھے، لیکن آج اس پراگندہ خشک نالی کا گمان ہو رہا تھا۔ کل اس گلی میں سے سفید نسواری، سیاہ بُرقعوں میں لپٹی، شرمیلی، حیادار، سہمی سمٹائی لڑکیاں گزرا کرتی تھیں اور آج یہ ننگے سر، برہنہ پاؤں بیچ بازار میں کھڑی تھی ـــــ کل یہ ہمیں دور دور سے اپنے پاس بلایا کرتی تھی اور آج یہ اتنے قریب سے بھی ہمیں نہیں پہچان رہی تھی۔

یہ اندھی، سنگدل، ویران گلی!

اس گلی نے ہمارا دودھ پیا ہے، ہمارا خون پیا ہے۔ اس نے وفا کا حلف ہم سے لیا اور پیمانِ وفا غیروں سے باندھ لیا، لیکن ـــــ لیکن یہ گلی تو مر چکی ہے اور میں اس کی لاش پر کھڑا آنسو بہا رہا ہوں۔ مجھے لاش پر آنسو نہیں بہانے۔ میں آنسو بہانے والی اُمت میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اس لاش پر پاؤں رکھ کر آگے گزرنا ہے۔ زمین میں دھنستے ہوئے اس ٹھنڈے بے جان پتھر کو پیچھے چھوڑ کر ابھرتے ہوئے روشن چاند کی طرف جانا ہے۔ اس کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھنے ہیں۔ اس کے کھنڈر پر ایک نیا، درخشاں اور تابناک تاج محل تعمیر کرنا ہے۔ الوداع! میری تاریک گلی کے روشن چہرو! میں ایک نئی گلی کے اُفق پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی کرنیں میری آنکھوں میں ہیں اور اس کی روشنی میرے راستوں پر ہے۔

امرتسر کی مسجدیں

امرتسر میں مسجدیں بہت تھیں۔ پُرشکوہ پُرجلال، کشادہ، رب جلیم کی حمد و ثنا سے گونجتی ہوئیں اور توحید کی فضائے سرمدی میں سرشار ٹھنڈی نیم روشن ڈیوڑھیوں اور پھول دار بیلوں میں چھپی ہوئی محرابوں اور پُرسکون برآمدوں والی مسجدیں۔ جن کے دودھیا گنبد اور سنہری کلس دھوپ میں چمکا کرتے تھے۔ ان میں ایسی مسجدیں بھی تھیں جنہیں محلے کے مکانوں نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ کچھ مسجدوں کے کشادہ صحنوں میں لبالب بھرے ہوئے تالاب بھی تھے جہاں بیٹھ کر نمازی وضو کیا کرتے ان تالابوں میں سرخ مچھلیاں تیرا کرتی تھیں۔ جمعہ کے روز یہاں شامیانے تان دیئے جاتے اور مسجدوں کی چھتیں اور صحن اجلے اجلے پاکیزہ کپڑوں والے نمازیوں سے بھر جاتے۔ فضا میں عطر گلاب اور عطر حنا کی خوشبوئیں بس جاتیں۔ خاص خاص موقعوں پر ان مسجدوں کو جھاڑ فانوس کیلے کے پتوں اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے خوب سجایا جاتا رات کو چراغاں ہوتا اور اگربتیوں کی خوشبو سارے محلے کو مہکا دیتی۔

لیکن یہاں میں صرف ان مسجدوں کا ذکر کروں گا جن سے میرے بچپن اور جوانی کی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ یہ وہ مسجدیں ہیں۔ جو آج بھی میرے خوابوں میں آتی ہیں اور جن کی پھولوں میں چھپی ہوئی محرابوں سے لگ کر میں بند آنکھوں سے آنسو بہاتا ہوں ان میں سے کوئی بھی مسجد میرے لئے مسجد قرطبہ سے کم نہیں۔ امرتسر میرا ہسپانیہ تھا۔ میرا اندلس تھا اور کمپنی باغ میرے اندلس کا الحمرا تھا۔ جہاں میں سات سو سال تک رہا اور پھر مجھے میری مسجد قرطبہ اور میرے الحمرا کی روشوں پر شہید کر دیا گیا۔ گلاب کے وہ سرخ پھول جو ان باغوں اور مسجدوں کے صحن میں کھلا کرتے تھے آج بھی میری یادوں کی سجدہ گاہوں میں شگفتہ و تر و تازہ ہیں اور میں اپنی بند آنکھوں میں ان پھولوں کی شبنمی ٹھنڈک اور نفسِ گرم میں ان کی آسمانی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔

آیئے میں سب سے پہلے آپ کو اپنے محلے کی، اپنی گلی کی مسجد میں لئے چلتا ہوں۔ میں نے تو اس مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنے آنسوؤں سے وضو کر لیا ہے۔ آپ بھی وضو کر لیں۔

یہ مسجد ہمارے گھر کے عین سامنے تھی اور مسجد عیداں والی کہلاتی تھی۔ وہ دیکھئے پیر جی صف پر بیٹھے محراب کی دیوار سے ٹیک لگائے کتابت کر رہے ہیں۔ لکڑی کا لمبوترا روغنی قلمدان قریب پڑا ہے یہ ہماری مسجد کے امام ہیں نام ان کا بھول گیا ہوں۔ سب انہیں پیر جی کہتے تھے اونچے لمبے دوہرا بدن، بھری بھری داڑھی، جس میں سفید بال بھی تھے۔ خالص کشمیری تھے۔ محلے کے ابّاؤں اور میری نانی سے کشمیری زبان میں گفتگو کرتے تھے سر پر کلاہ پہنتے۔ جمعہ کی نماز سے پہلے خطبہ دیتے تو نسواری رنگ کا ایک جبہ زیب تن ہوتا۔ فرصت کے وقت محلے کے بچوں کو دینیات پڑھاتے اور حدیث و فقہ کے مسودات کی کتابت کرتے۔ کسی وقت مسجد کی روش پر بیٹھے گلی میں آنے جانے والوں کو غور سے دیکھا کرتے۔ ہماری شرارتوں پر بڑی سختی سے ہمارے کانوں میں ناخن چبھو کر بڑی نرم آواز میں سرزنش کرتے تھے۔ کشمیری لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔ ہم وضو کرنے والے حوض کی ٹونٹیاں کھلی چھوڑ کر بھاگ جاتے تو ہمیں لپک کر پکڑ لیتے۔ کان کی لو میں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے ناخن چبھو کر بڑی شفقت سے کہتے:

"ٹونٹی کھلی نئیں چھوڑ دی"

مسجد کے پیچھے ان کا گھر جس کا ایک راستہ حجرے میں سے بھی جاتا تھا۔ پیر جی کا لڑکا امین میرا ہمجولی تھا۔ غضب کا شرارتی تھا۔ کبھی آرام سے نہیں بیٹھتا تھا اور کچھ نہیں تو مسجد کی چھت پر چڑھ کر گلی میں سے گزرتے لوگوں کو روڑے مارنے شروع کر دیتا۔ امرتسر میں ایک سرکس آیا۔ جس میں ایک کتا بلندی سے آگ میں چھلانگ لگاتا تھا۔ ہم دونوں نے مسجد کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں بالٹی سے پانی بھرا۔ کتے کو لے کر امین چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے پانی میں مٹی کے تیل سے بھری ہوئی بوری کو آگ لگا کر ڈال دیا۔ امین نے اوپر سے کتے کو پھینک دیا۔ کتے کی قسمت اچھی تھی کہ باہر گرا اور بچ گیا۔ پیر جی کے حجرے میں ایک نوبت پڑی رہتی۔ رمضان المبارک میں سحری اور افطار کے وقت یہی نوبت بجائی جاتی۔ یہ نوبت کبھی میں بجاتا اور کبھی امین بجاتا تھا۔ زیادہ تر یہ فرض مسجد کا موذن ہی سرانجام دیتا تھا۔ لیکن ہمیں نوبت بجانے کا بڑا شوق

تھا۔ ایک روز افطار کے وقت سے پانچ چھ منٹ پہلے ہی نوبت بجا دی۔ پیر جی ڈنڈا لے کر ہمارے پیچھے بھاگے۔ رات کو مجھے بھی گھر سے مار پڑی اور امین کی بھی خوب خبر لی گئی۔

ایک روز میں اور امین ساتھ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ پہلے سجدے کے بعد سر اٹھایا تو میری جیب سے ایک دونی نکل کر صف پر گر پڑی۔ دل میں سوچا کہ سلام پھیرنے کے بعد اٹھا لوں گا لیکن دوسرا سجدہ کرنے کے بعد جو دیکھا تو دونی غائب تھی۔ معلوم ہوا کہ امین نے سجدے کے دوران کمال چالاکی سے اٹھالی تھی۔ ایک روز امین نے مجھے کہا۔

"میں ہوا میں اڑ سکتا ہوں"

"بکواس کرتے ہو۔"

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اڑ کر دکھاتا ہوں"

وہ مجھے ساتھ لے کر قبرستان گھی منڈی والی سڑک پر آ گیا۔

"یہاں کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا۔ وہ جو ٹاہلی ہے نا۔ بس اس کے پاس جا کر میں ہوا میں اڑ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر امین نے شلوار کے پائنچے اوپر کیے اور ہاتھوں کی بند مٹھیوں کو چوم کر اندھا دھند بھاگ اٹھا۔ میری نظر اس ٹاہلی پر تھی۔ جہاں سے امین نے ٹیک اوف کرنا تھا۔ آپ یقین کریں کہ وہ اس ٹاہلی کے پاس پہنچ کر غائب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور اڑ گیا ہوگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ سڑک پر دکھائی دیا۔ دونوں بازوؤں کو ناچنے والیوں کی طرح لہراتا میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم نے مجھے اڑتے ہوئے دیکھا تھا نا! پورے قبرستان کا چکر لگا کر آیا ہوں۔ جی ٹی روڈ والے بجلی کے کھمبے سے ٹکراتے بچا۔"

آج بھی جب وہ منظر یاد آتا ہے کہ امین کس طرح رقص کرتا میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

گرمیوں میں مسجد کے کنوئیں پر نہانے والوں کا ہجوم رہتا۔ دو سقاوے تھے۔ جن کی ٹونٹیوں میں مسواکیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ فرش پر پھسلن تھی اور دیواروں پر سبز کائی جمی تھی۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ منہ سر صابن کی جھاگ میں چھپا ہے اور سقاوے کی مسواک نکل کر فرش پر گر پڑی ہے اب ایک ہاتھ سقاوے کے سوراخ پر ہے کہ پانی نہ نکلے اور دوسرے ہاتھ سے فرش پر سے مسواک تلاش کی جا رہی ہے نہ مسواک ملتی اور

نہ پانی کی دھار رکتی۔ باہر سے جیرا قصائی سقاوے میں بوکا ڈال کر آواز لگاتا ہے۔

"چلو بھئی چھوٹے خلیفہ! اندر اتنی دیر کیوں لگا دی۔" گارڈ محمد حسین بٹ اپنے دانتوں پر کالی نوس ٹوتھ پیسٹ کرتے ہوئے کہتا۔

"یہ لڑکا اگر شملے میں ہو تو اس پر وار ٹیکس لگ جائے۔"

مسجد کے چبوترے پر مٹی کا ایک بڑا پیالہ رکھا ہوتا جس میں محلے کے بچے اور عورتیں آ کر کڑوا تیل ڈال جاتی تھیں۔ یہ تیل مسجد کے لئے ہوتا۔ چھوٹی پہلوان سقاوے کے باہر بیٹھ کر اسی تیل سے اپنی مالش کیا کرتا۔ ایک بار پیر جی نے اسے کہا۔

"چھوٹی! کبھی نماز بھی پڑھ لیندی"

چھوٹی پہلوان کو بڑی شرم آئی۔ اسی روز نماز کے وقت وضو کر کے جماعت کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ بعد میں محلے کے ایک آدمی نے اس کی نماز پر سخت تنقید شروع کر دی۔

"تمہارا وضو غلط تھا۔ تمہارا رکوع ٹھیک نہیں تھا۔ تم نے ہاتھ ٹھیک طرح سے نہیں باندھے تھے۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی۔"

چھوٹی کو بڑا غصہ آیا۔ سر پر بندھا ہوا صافہ اتار کر زور سے فرش پر مارا اور اتنا کہہ کر مسجد سے باہر نکل گیا۔

"اب کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔"

امام مسجد پیر جی کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ اسی وقت چھوٹی کے گھر گئے اور اسے کچھ ایسی محبت، پیار اور اخلاق کے ساتھ سمجھایا کہ وہ اس کے بعد سے پکا نمازی بن گیا۔ پیر جی کا اخلاق بڑا بلند تھا۔ مسجد کی رونق پر بیٹھے ہوتے اور گلی میں گزرتے ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ میں نے کبھی انہیں کسی کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرتے نہ سنا تھا۔ مسجد میں اگر ہم شور مچاتے تو اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر ہمیں منع کرتے۔ زیادہ شرارتیں کرتے تو بس کان میں ذرا سا ناخن چبھو دیتے۔

عید میلاد کے مبارک دن اسی مسجد کے باہر سے جلوس تیار ہوتا۔ ہم میں سے ہر لڑکے کی یہی خواہش ہوتی کہ سبز پرچم تھام کر جلوس کے آگے آگے چلے اس روز امین کی دوستی بڑی کام آئی۔ وہ مجھے ایک نہ ایک جھنڈا ضرور تھما دیتا جسے کندھے کے ساتھ لگا کر میں بڑی شان سے جلوس کے ساتھ

چلتا۔ رات کو مسجد میں ختم شریف ہوتا تو فیروز نعت خواں کی آواز محلے کے ہر گھر میں جاتی۔ میں بڑے شوق سے تبرک کے مکھانے اور کھجوریں لے کر گھر جاتا۔

مسجد کی چھت میں ایک خوبصورت فانوس لگا تھا۔ جس کی روشنی میں دیواروں پر لگی زرد روغنی ٹائلیں اور ان پر ابھرے ہوئے گلاب کے پھول چمکا کرتے۔ گرمیوں کی سنسان دوپہروں میں مسجد کے صحن سے اذان کی آواز ابھر کر فضا پر چھا جاتی۔ نماز کے وقت مسجد کے دروازے کے آگے عورتیں اور محلے کی لڑکیاں اپنے کمسن بچوں اور بھائیوں کو کاندھے سے لگائے کھڑی رہتیں نماز کے بعد نمازی باہر نکلتے تو ان بچوں پر پھونکیں مارتے جاتے۔

سن ۱۹۴۷ء کے اگست کے مہینے کی چودہ تاریخ کی رات کو ہمارے محلے پر ہندوؤں اور سکھوں نے اس قدر شدید فائرنگ کی کہ اتنی گولی پہلے کبھی نہیں چلی تھی۔ اسی رات پیر جی کا مسجد کے حجرے میں انتقال ہو گیا دوسرے روز ہماری گلی کے آہنی دروازے پر ڈوگرہ فوج نے بم مارا ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں، بچے جوان اور بوڑھے سراسیمہ ہو کر گلی کے دوسرے دروازے سے ہو کر جی ٹی روڈ پر آ گئے۔ سامنے شریف پورہ تھا بیچ میں ایک سڑک تھی۔ برج پھولا سنگھ میں نہنگ سکھ بیٹھے اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ غلام محمد شال مرچنٹ کا بڑا لڑکا موسیٰ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے نالا عبور کر رہا تھا کہ گولی بچے کے سر میں لگی اور کھوپڑی کو توڑ کر اس کے باپ کے سینے سے نکل گئی۔ دونوں نالے میں گرے اور پاکستان پر قربان ہو گئے۔

کیا کیا کچھ پاکستان پر قربان ہو گیا! کیسے کیسے انمول موتی خاک میں مل گئے! ہماری تاریخ کا یہ ایک الم انگیز باب ہے جس کا ہر ورق ہمارے عظیم شہداء کے خون سے سرخ رو ہے۔ جس کی ہر سطر ایک دیوار گریہ ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ پاکستان کی نئی نسل کو اس دیوار گریہ کے سامنے لے جاؤں۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر اپنے شہیدوں کے خون کے چھینٹے دکھاؤں اور پھر ان سے پوچھوں کہ کیا یہ قربانیاں اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتیں کہ ہم اپنے وطن کی آبرو پر اپنی جانیں قربان کر دیں!

تقسیم کے بعد میں ویزا لے کر امرتسر گیا تو اپنے محلے میں بھی آیا۔ مسجد عیدالون کے صحن میں پیپل کا درخت اگ رہا تھا اور جہاں کبھی پتھر کے منبر پر بیٹھ کر پیر جی جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ وہاں گنیش دیوتا کی مورتی رکھی تھی۔ اور ایک مہنت وہاں بیٹھا پوجا پاٹھ کر رہا تھا۔

بھٹہ والی مسجد ہمارے بازار کی پکی گلی کے سامنے تھی۔ ڈیوڑھی سے گزر کر سیڑھیاں مسجد کی گیلری کو جاتی تھیں جو مسجد کے اندر بنی ہوئی تھی۔ اس گیلری کا فرش لکڑی کا تھا اور رمضان شریف کے مہینے میں ہم لڑکے یہاں تراویح پڑھا کرتے۔ گیلری میں تراویح اس لیے پڑھتے تھے کہ جب تھک جاتے تو چپکے سے کھسک جایا کرتے۔ اس مسجد کے امام کا نام اگر بھول نہیں رہا تو احد شاہ تھا۔ گورے چٹے ادھیڑ عمر کے کشمیری بزرگ تھے۔ شرعی داڑھی تھی۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتے۔ سنہری فریم والی عینک لگی ہوتی۔ چہرے پر نور برستا تھا۔ سر پر سفید صافہ باندھتے تھے۔ بڑے ہی پاک صاف رہتے۔ ابراہیم عطار کی دکان شربت پینے آتے تو پہلے شیشے کے گلاس کو نمک سے دھلواتے۔ پھر ہونٹوں پر ململ کا دھلا دھلایا رومال رکھ کر شربت پیتے۔ ہفتے میں شاید ایک بار وہ چپ کا روزہ رکھتے۔ پھر وہ چراغ سبزی والے کی دکان پر کھڑے ہو کر اشاروں سے سبزی خریدتے۔

اس مسجد کے باہر بڑا گھنا درخت تھا۔ جس نے آس پاس کے مکانوں پر اپنا سایہ کر رکھا تھا۔ کنواں باہر کی طرف تھا۔ جہاں سے محلے کے بہشتی مشکیں بھرا کرتے۔ سحری کے وقت سخت سردی میں اس مسجد کی گیلری کی فضا گرم ہوتی۔ محرابوں پر پرندے گرے ہوتے۔ جماعت کھڑی ہوتی تو مسجد کی فضا میں ایک پُر جلال خاموشی چھا جاتی۔ اس مسجد کی دیواروں پر قرآنی آیات کے قطعے لگے تھے یہ مسجد بھی اتنی کشادہ نہیں تھی۔ مسجد عیدالون کی طرح یہ بھی مکانوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے کنوئیں کے چبوترے پر سبز کائی جمی رہتی۔ جس پر گرمیوں میں زرد بھڑیں آ کر بیٹھا کرتیں۔ ہم ان پر گیلا کاغذ مار کر پکڑتے۔ ان کے ڈنک نکال کر دھاگہ باندھ کر اڑایا کرتے۔ عید شبرات اور رمضان شریف میں اس مسجد میں بڑی رونق ہوتی۔

تقسیم کے بعد اس مسجد کو دیکھا کہ خستہ حالت میں تھی لیکن کشمیری بانو اور پانڈی یہاں رہ رہے تھے جن کی وجہ سے یہ مندر بننے سے بچ گئی۔

ہمارے محلے میں ہی کمیٹی کے باغ کے پہلو میں مسجد جان محمد تھی یہ مسجد دوسری منزل پر تھی اور کافی کشادہ تھی۔ نیچے دکانیں تھیں۔ ایک طرف سے یہ ہال بازار کو لگتی تھی۔ ہال بازار کی جانب مسجد کے نیچے امرتسر کے مشہور و معروف پینٹر عبدالغفار کی دکان تھی۔ مسجد کا دروازہ ہمارے بازار میں تھا۔ دوسری جانب وضو کے لیے نلکے لگے تھے۔ پیچھے سقاوے تھے۔ صحن چھوٹا تھا۔ محرابوں پر پرندے [illegible]

میں گرا دیئے جاتے اور گرمیوں میں پلنگ بچھے رہتے۔ دائیں جانب ایک احاطے میں مسجد کے بانی جان محمد کی قبر تھی۔ جو مسجد سے باہر تھی۔ اوپر کھلا آسمان تھا۔ امرتسر کا خوبصورت نیلا آسمان!

سلام بابا اس مسجد کے پیش امام تھے۔ بھاری بھرکم، گھنی سفیدی مائل داڑھی۔ چھوٹا قد مگر مضبوط جسم امرتسر کے پرانے کشمیریوں کی طرح سرخ و سفید رنگت تھی تیز تیز باتیں کرتے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے دروازے کے بالمقابل ان کا حجرہ تھا مگر بازار میں اپنے الگ مکان میں رہتے تھے ان کا ایک لڑکا بالکل ان کی شکل کا تھا۔ مجھ سے بڑا تھا۔ عینک لگاتا تھا۔ اوپر والے ہونٹ پر سردیوں میں بھی پسینہ آیا رہتا۔ پاسنگ شو کے سگریٹ پیتا تھا۔ جس کی خوشبو مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ گھر کی بیٹھک میں ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا۔ بڑا کم گو تھا۔ کسی وقت میری طرف دیکھتا تو مجھے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں میں ایک گہری اداسی کی جھلک دکھائی دیتی۔ تقسیم کے بعد پھر ان صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی مجھے ان کا نام بھی یاد نہیں رہا۔

اس مسجد کی ایک خاص بات یہ تھی کہ سال میں ایک بار یہاں کوئی کانفرنس ہوا کرتی جو تین روز تک جاری رہتی۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے علمائے کرام تشریف لایا کرتے۔ ایک بار معراج شریف کے موضوع پر باہر سے آئے ہوئے ایک مولانا صاحب نے سائینٹفک حوالوں کے ساتھ ایسی پر مغز تقریر کی کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ میں بھی اس جلسے میں بیٹھا تھا امرتسر میں مدتوں ان مولانا صاحب کی تقریر کے چرچے رہے۔ اس مسجد میں مجھے اپنا نماز پڑھنا یاد نہیں۔ لیکن کانفرنس کے اجلاسوں میں ضرور جاتا تھا۔ تقسیم کے بعد اس مسجد کو بھی سرینگر سے آئے ہوئے کشمیریوں نے اپنی تحویل میں لے لیا اور سنا ہے کہ بوہڑ والی مسجد کی طرح یہاں بھی پانچوں وقت اذان ہوتی ہے۔

مسجد خیر الدین ہال بازار میں تھی کشادہ صحن بیچ میں پانی کا حوض جس میں سرخ مچھلیاں تیرا کرتیں۔ چھتی ہوئی ڈیوڑھی میں ٹھنڈا ٹھنڈا نیم روشن اندھیرا چھایا رہتا۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس مسجد میں جو ولولہ انگیز پر جوش تقریریں کیں وہ امرتسر کے مسلمانوں کو آج بھی یاد ہوں گی۔ جس روز شاہ صاحب کی تقریر ہوتی مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی چونکہ لڑکپن کی یادوں کے سہارے یہ مضمون لکھ رہا ہوں اس لئے شخصیتوں کے منصبوں کے تعین کے سلسلے میں اگر کوئی سہو ہو جائے تو معذرت

چاہوں گا میرا خیال ہے کہ امرتسر کے مشہور اور جید عالم دین مفتی محمد حسین اس مسجد کے پیش امام تھے۔ میں انہیں اکثر اس مسجد میں تشریف لاتے دیکھا کرتا تھا۔ ان کے ایک پاؤں میں تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر تشریف لاتے ان کے قابل قدر صاحبزادے حافظ عبیداللہ میرے دوست تھے اور ماشاءاللہ اب بھی ہیں حافظ عبیداللہ اس مسجد میں حدیث اور فقہ پڑھتے بھی تھے اور درس بھی دیتے نو عمری ہی میں علوم کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے ان کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو ہم چشم غزال کہا کرتے تھے۔ ایسی خوبصورت آنکھیں ہمارے دوستوں میں سے کسی کی بھی نہیں تھیں آج بھی جب کبھی وہ مجھے ملتے ہیں تو میں ان کا ٹھنڈا چشمہ اتروا کر چشم غزالاں کا دیدار ضرور کر لیتا ہوں۔ مسجد کی ڈیوڑھی میں دائیں جانب ایک حجرہ تھا جہاں حافظ شفیع بچوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتے دبلے پتلے، خوش مزاج، خوش اخلاق و پرہیز گار، استغنا اور توکل علی اللہ کی زندہ تصویر مجھ سے عمر میں پندرہ بیس سال بڑے تھے "سبحان اللہ" تکیہ کلام تھا۔ کھانے کو مل گیا تو سبحان اللہ فاقہ آ گیا تو بھی سبحان اللہ کہہ کر مسکرا دیتے۔ بازار سے دو آنے کی چائے کی چینک منگواتے صندوقچی میں سے ٹین کی گول ڈبی نکال کر اس میں سے تھوڑا اصلی زعفران چائے میں ڈالتے اور پھر جب زعفران کی خوشبو اڑتی تو پیالی ہمارے آگے بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہتے۔

"سبحان اللہ"

بات کرتے وقت ان کے منہ سے لونگ کی خوشبو آیا کرتی۔ کیونکہ وہ پان میں لونگ ڈال کر کھاتے تھے۔ مسجد کی ڈیوڑھی میں ان کے حجرے کے باہر ایک گھنی بیل کا سایہ تھا جس کی شاخیں موسم بہار میں گلابی پھولوں کے جھمروں سے لد جاتیں۔ یہ پھول فرش پر بھی گرا کرتے۔ حافظ شفیع ان پھولوں کو دیکھ کر کہا کرتے۔

"سبحان اللہ! میری یہ بیل نمازیوں کے قدموں میں پھول نچھاور کرتی ہے۔"

اب میں آپ کو مسجد عیدگاہ کی طرف لئے چلتا ہوں۔

یہ ہمارے محلے کی عیدگاہ والی مسجد تھی۔ دروازہ رام باغ سے نکل کر سیدھا کمپنی باغ کی طرف چلیں تو جی ٹی روڈ کراس کرنے کے بعد یہ مسجد بائیں ہاتھ کو ریلوے پھاٹک سے پہلے آ جاتی تھی عیدگاہ کی چار دیواری میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے کی ڈیوڑھی میں سے گزریں تو سامنے [illegible] کے درختوں

نے اپنی ٹھنڈی چھاؤں ڈال رکھی تھی۔ اس کے بعد عید گاہ کا مختصر سا میدان تھا۔ یہاں ہم اجلے اجلے کپڑے پہن کر ماؤں کے لگائے ہوئے سرمے اور عطر میں بسے عید کی نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یہاں چھوٹے چبوترے سے بنے تھے۔ جن پر مکبّر کھڑے ہوتے اور "اللہ اکبر" کی صدا کو آگے بڑھاتے آج کل لاؤڈ سپیکروں کی وجہ سے بہت کم مکبّر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہر شخص نے اپنے گھر سے لایا ہوا کپڑا آگے بچھایا ہوتا۔ جس پر کھڑے ہو کر عید کی نماز پڑھی جاتی اور بیٹھ کر عید کا خطبہ سنا جاتا۔ خلیفہ یٰسین صاحب اس مسجد کے امام تھے جن کا گھر ہماری گلی میں تھا۔ سیاہ گھنی شرعی ڈاڑھی اور مشہدی کے ساتھ بڑے بارعب لگتے۔ مسجد کے چھوٹے سے باغیچے میں ان کا حجرہ بھی تھا۔ ریلوے لائن عید گاہ کی دیوار کے پار تھی ہم اس دیوار پر بیٹھ کر ریل گاڑیاں دیکھا کرتے تھے مسجد کے حوض کے اردگرد برسات میں موٹی موٹی جامنیں ٹپکا کرتیں جنہیں ہم بہت شوق سے کھایا کرتے۔ مسجد کے سامنے والے درختوں میں امرود پکتے تو ہم خلیفہ صاحب کی نظریں بچا کر انہیں توڑ کر نیکر کی جیبوں میں بھر لیتے ساون کی لمبی جھڑیاں لگتیں تو ان جامنوں میں کوئلیں بولا کرتیں۔

برسات کی بارش میں خالی نیکریں پہنے، ننگے پاؤں اپنے محلے سے نکل کر عید گاہ والی مسجد میں آتے اور جامن کے درختوں پر چڑھ کر جامنیں توڑا کرتے۔ بچپن ہی سے ہمارے دلوں میں یہ خوف بٹھا دیا گیا تھا کہ جامن کا پیڑ بڑا کچا ہوتا ہے پھر بھی ہم بندروں کی طرح ان درختوں پر چڑھ کر پھل کھاتے اور کھیل تماشے کیا کرتے۔ گرمیوں کی راتوں کو چھت پر سوتے ہوئے میری آنکھ کھل جاتی تو میں دیکھتا کہ امرتسر کے پچھلے پہر کے آسمان پر نیلے چمکیلے ستاروں کے فانوس جگمگا رہے ہیں۔ ہر طرف گہری، ٹھنڈی، شبنم آلود خاموشی ہے اور عید گاہ کی طرف سے کوئل کے بولنے کی آواز آ رہی ہے یہ قلب کو گرما دینے والی اور روح کو تڑپا دینے والی آواز میں آج بھی آدھی آدھی راتوں کو کبھی کبھی سنتا ہوں اور گھر سے باہر نکل کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتا ہوں لیکن وہ سبز پانی کا حوض اور جامن کے درختوں کے جھنڈ کہیں نظر نہیں آتے۔

پاکستان بننے کے بعد یہ مسجد بھی ویران ہو چکی تھی۔ عید گاہ میں لوگوں نے کوارٹر بنا لیے تھے اور امام صاحب کے حجرے میں ایک سکھ شرنارتھی سائیکلوں کو پنکچر لگا رہا تھا۔ حوض پر جھکے ہوئے جامن کے درخت ویران ہو گئے تھے اور حوض میں لمبی لمبی خشک گھاس اگی تھی، مسجد کے صحن

میں ایک جانب سکھوں نے گائے بھینسیں باندھ رکھی تھیں اور اناروں کے درخت کہیں بھی نہیں تھے نہ انار تھے۔ نہ اناروں والا راستہ تھا۔

مسجد قاصداں ہمارے گھر سے دور، دوسرے محلے میں تھی۔ مجھے اس محلے کا نام یاد نہیں رہا۔ کڑہ جیل سنگھ سے نکل کر ہم چمڑے کی دکانوں والے ایک بازار میں آ جاتے۔ یہاں سے نکلتے تو دائیں جانب ایک گلی مڑتی۔ آگے گوجروں کا ڈیرا آ جاتا۔ یہاں مکانوں کی دیواروں پر پاتھیاں لگی ہوتیں گوبر کی بدبو پھیلی ہوتی اسی گلی میں ایک جگہ سفید چھوٹے میناروں اور دودھیا گنبد والی چھوٹی سی مسجد قاصداں مکانوں کے درمیان میں جیسے کوزے مصری کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ جمعہ کی نماز میں اپنے چھوٹے بھائی یا کسی دوست کے ساتھ ہمیشہ اسی مسجد میں پڑھنے آتا۔ اس کی وجہ امرتسر کے آتش نوا اور شعلہ بیان مبلغ دین مولانا ترنم کا خطبہ تھا۔ پھندنے والی رومی ٹوپی بھری بھری گھنی ڈاڑھی اور چوڑے شانوں والا گٹھا ہوا جسم۔ درمیانہ قد، پاٹ دار آواز تقریر کرتے ہوئے جوش میں آتے تو گردن کو دائیں بائیں ہلاتے جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر عالی پر مولانا ترنم کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑتے۔ عموماً سفید قمیض شلوار میں ہوتے۔ چلتے وقت رومی ٹوپی کا پھندنا گردش میں ہوتا۔ امرتسر کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ جس محلے میں ان کی تقریر ہوتی وہاں لوگ شہر سے کھنچ کھنچ کر پہنچ جاتے تھے۔ ان کی تقریر کرتے کرتے اچانک پنجابی میں مکالمے شروع کر دیتے۔ جب لوگ ان کی کسی بات پر محظوظ ہوتے تو مولانا اچانک کوئی جملہ بلند آواز میں ادا کرتے اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔

جمعہ کے روز اس مسجد میں شامیانے تن جاتے چھت پر عورتوں کے لئے نماز ادا کرنے کا انتظام ہوتا مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ مسجد چھوٹی تھی اور وضو کرنے کا انتظام محدود تھا۔ میں عموماً گھر سے وضو کر کے جایا کرتا۔ خطبے کے وقت مولانا ترنم سرخ گلاب کے ہاروں سے لدے پھندے، سیاہ جبہ پہنے، رومی ٹوپی کے اوپر سفید رومال لپیٹے منبر پر تشریف لاتے تو مجھے یوں لگتا جیسے عباسی دور کا کوئی خلیفہ مسجد میں نکل آیا ہے۔ ان کی گردن سرخ گلابوں میں چھپی ہوتی۔ پھولوں کی کچھ پنکھڑیاں ان کی ڈاڑھی میں بھی پھنسی ہوتیں ان کے آتے ہی مسجد کے صحن میں ہر شخص ہمہ تن گوش ہو جاتا، وہ خدا اور اس کے رسول مقبولؐ کی حمد و ثنا کے بعد قرآن حکیم کی کوئی آیت پڑھتے اور پھر خطبے کی تقریر کے چشمے سے ندی بن کر عظیم سمندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیتی۔ وہاں کوئی مائیکروفون اور لاؤڈ سپیکر نہ تھا لیکن مولانا

کی آواز سے گلی محلے کے درودیوار گونج رہے ہوتے۔

اب نہ وہ مسجد رہی ہوگی اور نہ اس گلی محلے کے درودیوار مولانا ترنم کی تلاوت کلام پاک سے گونج رہے ہوں گے۔ پاکستان بننے کے بعد میں اس مسجد کو نہ دیکھ سکا۔ ظاہر ہے اب وہاں سب کچھ ہوگا مگر مسجد نہیں ہوگی۔ امرتسر سے ہجرت کرنے سے دو تین روز پہلے سنا تھا کہ مسجد قاصداں کے علاقے میں خوفناک آگ لگی ہوئی ہے۔

بہاولپور روڈ سے ایک سڑک قبرستان سے ہوکر من آباد کو جاتی ہے۔ اس کے موڑ پر سڑک کے کنارے مولانا ترنم محو خواب ہیں۔ میں یہاں سے گزرتے ہوئے انہیں بہت یاد کرتا ہوں اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ مسجد قاصداں میں خطبہ دیتے ہوئے ان کا مسکراتا، نورانی چہرہ یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کبھی یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ زندگی سے بھرپور چہرہ جس مرقد میں محو خواب ہوگا اس کا لوح مزار میں ہر روز آتے جاتے پڑھا کروں گا اس کا لوح مزار میں ہر روز آتے جاتے پڑھا کروں گا۔

یہ میرے امرتسر کے انمول ہیرے تھے جو لاہور میں آکر آسودۂ خاک ہوئے خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

اب میں آپ کو ایک ایسی مسجد میں لئے چلتا ہوں جو حجم میں شاید امرتسر کی سب سے چھوٹی مسجد تھی یہ کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی کے پہلو میں گویا کسی بڑی مسجد کے چھوٹے ماڈل کی طرح زمین پر رکھی ہوئی تھی۔ ساری کی ساری سبزی مائل پتھر کی تھی اور اسے شیخ صادق حسین نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کا گنبد نہیں تھا۔ چھوٹے سے دو مینار سے تھے۔ پندرہ بیس نمازیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ دیواروں میں پتھر کی جالیاں لگی تھیں۔ چھت میں بجلی کے دو سبز گلوب لگے تھے رات کو ان کی سبز روشنی جالیوں سے کرنوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر آیا کرتی۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا جیسے آسمان سے کوئی ننھا سا سبز ستارہ کمپنی باغ میں اتر آیا ہے۔

ان کی روشنی میں یہ درختوں پھولوں میں گھری ہوئی چھوٹی سی مسجد خود بھی ایک پھول لگتی۔ سبز پھول جو کسی درخت کی شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہی پتھر ہوگیا ہو۔ بہار کے موسم میں اس کی چھت پر درختوں سے پھول گرا کرتے۔ اس کے عقب میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ گرمیوں کی صبحوں کو میں منہ اندھیرے سیر کرنے آتا تو مجھے دور سے اس مسجد سے بلند ہوتی اذان کی آواز

سنائی دیتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے کمپنی باغ کے سارے درخت، سارے پھل، سارے پھول اور شگوفے ایک ہی آواز کی لہروں میں بدل گئے ہیں۔ اللہ بہت بڑا ہے! اللہ بہت بڑا ہے۔ مجھے منہ اندھیرے کی پُرنور خاموشی میں اس اذان کی آواز میں درختوں، پھولوں اور شگوفوں کی مہک آتی محسوس ہوتی اور شگفتہ گلاب کے سرخ پھولوں سے مجھے اذان کی آواز خوشبو بن کر ابھرتی سنائی دیتی ہے۔ میں پردہ کلب کے قریب سے گزر کر حوض والے درختوں کے جھنڈ میں آتا تو دور اس مسجد کی جالیوں میں سے پھوٹتی سبز روشنی دکھائی دیتی۔ معلوم ہوتا آسمان سے فرشتے صبح کی نماز پڑھنے وہاں اترے ہوئے ہیں۔ میں سیر کرتا ہوا مسجد کے پچھواڑے چھوٹی ندی پر آکر رک جاتا۔ یہاں مجھے ایک خوشبو آتی۔ موتیے کے پھولوں میں لپٹی ہوئی الائچیوں کی خوشبو۔ یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز خوشبو تھی۔ معلوم ہوتا جیسے وہ چھوٹی سی سبز مسجد سانس لے رہی ہے۔

ضرور یہ اس مسجد کے سانس کی خوشبو تھی۔ میں ندی کے چھوٹے سے پل پر بیٹھ جاتا اور مسجد کے ساتھ سانس لینے لگتا۔ افسوس! میرا سانس چھوٹا تھا اور خوشبو بہت بڑی تھی۔ بہت وسیع تھی۔ سارے کمپنی باغ، ساری دنیا، ساری کائنات پر محیط تھی۔ اس وقت دل یہی چاہتا کاش میری ساری زندگی ایک سانس میں سمٹ آئے۔ جسے میں اس خوشبو کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لوں اور پھر کبھی اسے باہر نہ نکالوں۔ میں پلیا پر بیٹھا ندی میں بہتے پانی کی آواز سنتا سرر۔ سرر ایک دھیمی، بہت دھیمی سی سرسراہٹ ایک خواب آلود سی سرگوشی —— جیسے پچھلے پہر کی خاموشی میں ندی کا پانی کچھ کہہ رہا ہو۔ کچھ سنا رہا ہو اس پر جھکے ہوئے آم اور ناشپاتی کے درختوں کی شاخیں اور زیادہ جھک جاتیں۔ گویا جھک کر ہمہ تن گوش ہوکر ندی کی سرگوشیاں سن رہی ہوں۔ پانی کچھ بولتا ہوا گزر جاتا اس کی لہروں پر تیرتے پھول بھی آگے نکل جاتے اور ان کی خوشبو ان کی دھیمی سرگوشیاں پیچھے رہ جاتیں۔

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ آج یہ دھیمی خوشبودار سرگوشیاں بھی آگے نکل گئی ہیں اور میں وقت کے پل پر اکیلا بیٹھا، بہتے دریا کو دیکھ رہا ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد میں امرتسر گیا تو کمپنی باغ کی اس خوبصورت چھوٹی سی سبز مسجد جو ننھے سے سبز پھول کو اس حالت میں دیکھا کہ وہاں سوائے دو چار ٹوٹے پھوٹے پتھروں کے کچھ

نہیں تھا نہ سبز جالیاں نہ سبز روشنیوں کے گوب اور نہ صبح کی شبنمی فضاؤں میں ابھرتی اذان کی آواز اور نہ اس مسجد کے سانس کی مقدس خوشبو۔ سبز پھول آخری سانس لے کر مرجھا گیا تھا۔ اور ہوا اسے اڑا کر لے گئی تھی۔

لیکن امرتسر کی میری مسجدیں ان کی اذانیں ان کے سارے پھول ان پھولوں سے اٹھتی خوشبوئیں میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ میں پانچوں وقت ان مسجدوں سے بلند ہوتی اذانوں کی آواز سنتا ہوں۔ مجھے ہر سانس کے ساتھ ان اذانوں کی جھلک آتی ہے اور میں گلاب کے ہر پھول میں محرابوں سے پھوٹتی روشنیوں کی کرنیں دیکھتا ہوں۔ اندلس نہ رہا، قرطبہ نہ رہا۔ لیکن مسجد قرطبہ کی اذانیں تو ہمارے ساتھ ہیں ہمارے لئے تو ساری دنیا ایک مسجد ہے۔ سارا وطن پاک، ایک مسجد ہے اور اس مسجد کا صحن کس قدر کشادہ ہے۔ کتنے حسین ہیں وہ باغ جو اس مسجد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں! کس قدر خوب صورت ہیں یہ ٹھنڈی چھاؤں والے درخت جن کی شاخوں کے پھول فانوس بن کر اس مسجد کی دیواروں پر جھول رہے ہیں اور کتنی سحر خیز ہیں یہ اذانیں جو اس مسجد کے میناروں سے صبح و شام بلند ہوتی ہیں۔!

وطن پاک خدا کا گھر ہے۔ خدا مجھے دنیا کی جنت سے نکال دے لیکن اپنے گھر سے کبھی نہ نکالے۔

امرتسر کا رمضان المبارک

(میری والدہ محترمہ) کے چلنے اور برتن اٹھانے رکھنے کی آواز آرہی ہے۔ سامنے والی مسجد میں ماشکی ٹونٹی کھول کر وضو کر رہا ہے اور زور زور سے کھانس کر گلا صاف کر رہا ہے۔ کہیں کہیں مسلمانوں کے مکانوں سے پانی بہنے کی آوازیں آنے لگی ہیں۔

آپو جی نے باورچی خانے سے میری بڑی بہن سرور کو آواز دی ہے۔

"آج اٹھنا نہیں بانو؟"

میری بڑی بہن کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھتی ہے اور سر پہ دوپٹہ لے کر باہر نکل گئی ہے۔ کیواڑ کھلنے سے برف کی مانند ٹھنڈی ہوا میری ناک کو لگی ہے۔ میں آنکھوں پر سے لحاف ذرا سا اٹھائے طاق پر جلتے ہوئے کڑوے تیل کے دیئے کو دیکھ رہا تھا۔ دیئے کی لو سرد ہوا میں ذرا سی کپکپا کر پھر سیدھی الف ہو گئی ہے۔ مجھے اس لو میں روشنی و نور کی ننھی منی پریاں ناچتی نظر آرہی ہیں۔

"وے حمید! وے اُٹھ وے دیکھی لیا!"

اب آپو جی نے مجھے آواز دی ہے۔ میری ڈیوٹی یہ ہے کہ میں دکان پر سے جا کر دہی لاؤں۔ دور گونگے بگل والے کے بگل کی بے سُری آواز گونجی ہے۔ ساتھ ہی اُس نے اپنی گونگی زبان میں زور سے آواز لگائی ہے۔ گلی کے کونے میں غلام رسول حلوائی کی دکان کے پاس حافظ جی نے اپنی نوبت بجائی ہے۔ اُن کے نوبت بجانے کا انداز یہ ہے کہ پہلے دو ہاتھ کھلے بجا کر ایک لے لیتے ہیں اور پھر ایک منٹ تک دھڑا دھڑ بجاتے چلے جاتے ہیں یہ نوبت ان کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے۔ گھنی سیاہ داڑھی، گٹھا ہوا بدن پچاس برس کی عمر میں جوان لگتے ہیں۔ بینائی سے محروم ہیں لیکن رزقِ حلال کی دولت سے مالا مال ہیں سارا دن غلام محمد ہٹوانیے کی دکان پر بیٹھے رہتے

کی بوریاں ڈھوتے ہیں۔ انہیں گلی محلّے کے ایک ایک گھر کا پتہ ہے۔ کشمیری ہیں۔ دو ڈھائی من کی بوری کمر پر لاد کر قرآن شریف کی آیات کا وِرد کرتے گلی میں چل پڑتے ہیں اور سیدھے اُسی گھر کا جا کر دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں جہاں انہیں جانا ہوتا ہے۔ لاٹھی اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پسینے میں شرابور حافظ جی بوری کے ساتھ ٹیک لگا کر ڈیوڑھی میں بیٹھ جاتے اور لاٹھی دروازے پر مار کر آواز لگاتے۔

"خلیفہ جی! آٹے کا بوری آیا۔"

رمضان شریف میں وہ محلے میں نوبت لٹکا کر محلّے کے روزہ داروں کو سحری کے وقت جگایا کرتے انہیں سب معلوم تھا کہ کس مکان میں کون رہتا ہے، چنانچہ ہر گھر کے آگے جا کر نوبت بجاتے اور پھر لاٹھی مکان کے بند کیواڑوں پر مار کر اُس مکان میں رہنے والے کا نام لے کر اُسے جگاتے۔ ہمارے دروازے پر نوبت بجا کر وہ ہمیشہ کہا کرتے۔

"خلیفہ عبدالعزیز! اُٹھو میاں اُٹھو!"

ہماری گلی میں شفیع سنار کے مکان کے بالکل سامنے دو بھائی جلال دین اور کمال دین رہا کرتے تھے۔ انہیں فوت ہوئے مدت ہو چکی تھی، لیکن حافظ جی سحری کے وقت اُن کے مکان پر جا کر ہمیشہ یہی آواز لگایا کرتے۔

"جلال دین کمال دین مرحوم! اُٹھو میاں اُٹھو!"

حافظ جی کی نوبت اب ہمارے مکان تک پہنچ گئی ہے۔ آپو جی نے مجھے پھر آواز دی ہے میرا بڑا بھائی لحاف کے اندر ہی اندر مجھے ٹھوکے دے رہا ہے۔

"چل بھئی اُٹھ۔"

مجھے نیند بھی آ رہی ہے، مگر سحری کے وقت گلی میں نکلنے کا شوق بھی ہے۔ اُن لوگوں کو دیکھنے کا شوق جو ڈھول تاشے بجاتے روزہ داروں کو جگاتے ہیں۔ بچی گلی کی طرف سے نعتیں گانے والوں کی ٹولی کی آواز آ رہی ہے۔

جلوہ گر جلوہ گر جلوہ گر ہو گیا
شاہِ جن و بشر جلوہ گر ہو گیا

سامنے والی مسجد عیدالون کے بانگی نے سحری کے شروع ہونے کی نوبت بجا دی ہے۔ دھمادم

دھمادم دھمادم ــــ اب میں لحاف سے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھا ہوں اور باہر صحن میں آ گیا ہوں۔ برف ایسی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے میرے ماتھے کو چوم لیا ہے۔ باورچی خانے کے دروازے پر ٹاٹ پڑا ہے میں ٹاٹ اُٹھا کر اندر جاتا ہوں۔ باورچی خانے کی فضا گرم ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے گرم شال اوڑھا دی ہو۔ آپو جی نے دونوں چولہے جلا رکھے ہیں۔ دیواروں پر لکڑیوں کے شعلوں کی چمک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک چولہے پر رات کا پکا ہوا گرم پالک کا ساگ گرم ہو رہا ہے اور دوسرے چولہے پر سبز چائے دم ہو رہی ہے۔ چائے کی خوشبو اُڑ رہی ہے۔ آپو جی کا سُرخ و سفید گول کشمیری چہرہ چائے کی خوشبو اور آگ کی روشنی میں دمک رہا ہے۔ میں دہی کا برتن اُٹھا کر باہر جانے لگتا ہوں کہ آپو جی ڈانٹ کر کہتی ہیں۔

"فرد لے کے جاویں وے!"

فرد یعنی گرم کشمیری شال اوڑھ کر جاتا۔ میں فرد سے بڑا گھبراتا تھا۔ میں چھوٹا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کی عمر ہو گی اور فرد بڑی تھی۔ وہ گلی میں مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ ویسے بھی اس عمر میں سردی کم ہی لگا کرتی ہے اور پھر ہم غریب محنتی ماں باپ کی اولاد تھے۔ سردیوں میں ننگے پیر ہی گلیوں میں بھاگتے پھرا کرتے تھے۔ کبھی زکام تک نہیں ہوا تھا۔ میں ٹھنڈا کٹورہ ہاتھ میں لیے گلی میں آ گیا ہوں۔ آسمان پر چمکیلے ستارے بڑے بڑے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ گلی دور تک سنسان ہے۔ مسجد کے کنوئیں میں سے برکت ماشکی بوکے نکال نکال کر مشک بھر رہا ہے۔ کنوئیں کی چرخی کی چوں چوں کی آواز گلی کی خاموش فضا میں گونج رہی ہے۔ برکت ماشکی بچپن سے لوگوں کے گھروں میں پانی بھر رہا ہے۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ کمر جھک گئی ہے۔ ہاتھوں اور پنڈلیوں کی سبز رگیں پھول گئی ہیں۔ وہ کنوئیں میں سے پانی نکالتے ہوئے ساتھ ساتھ گا بھی رہا ہے۔

کدی میں وی مدینے جاواں۔

سیدہ کے گھر کی کھڑکی بند ہے۔ روشندان میں سے ہلکی ہلکی روشنی گلی کی کہر آلود فضا میں چھن رہی ہے۔ وہ سحری کے لیے اُٹھی ہو گی۔ اُس نے لمبے سنہری بالوں کو پیچھے سے تھام کر سر پہ جوڑا سا بنا لیا ہو گا اور پرات میں آٹا گوندھ رہی ہو گی۔ چودھری نور دین کے مکان میں سے پراٹھوں کی خوشبو آ رہی ہے۔

مَیں گلی کے سرے پر پہنچا تو ڈھول والا بازار میں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے بڑے زوردار انداز میں ڈھول کو خوب پیٹا۔ پھر آواز لگائی :-

جاگو اللہ کے پیارو! جلال دین آگیا!
سوتوں کو جگا گیا!

مَیں بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دکان پر بیٹھے ہوئے میرے والد صاحب سے پوچھا :

"خلیفہ جی کیہ وج گیا اے ؟"

اور پھر ڈھول بجاتا تیز تیز قدموں سے آگے نکل گیا۔ ڈاک خانے کے پاس گونگے کا تیز اور تیز بگل گونج اُٹھا۔ پھر وہ نارزن کی طرح اپنی گونگی آواز میں چیخ اُٹھا۔ میں دہی برتن میں ڈلوا کر واپس گلی کی طرف مُڑ رہا تھا کہ گونگے کے بگل کی آواز بہت قریب ہی گونجی۔ اب وہ بھاگتا ہوا ہاتھ میں بگل تھامے بازار میں نمودار ہوا۔ گلی کی طرف منہ کر کے اُس نے زور سے بگل بجایا۔ نارزن کی آواز میں ایک وحشی چیخ ماری اور آگے کو نکل گیا۔ مَیں اپنے مکان کے پاس پہنچا تھا کہ سامنے سے نعت خوانوں کی ٹولی کے گیس کی روشنیاں گلی میں جھلائیں۔ میں اپنے مکان کے سامنے مسجد کے تھڑے پر کھڑا ہو گیا۔ ٹولی سبز رنگ کے گوٹا کناری لگے جھلاتے جھنڈے اُٹھائے نعت پڑھتی آرہی تھی۔ وہ مسجد کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ نعت خوانوں نے سروں پر سبز صافے باندھ رکھے تھے۔ ایک آدمی نے گیس اُٹھا رکھا تھا۔ گیس کی روشنی میں نعت خوانوں کے چہرے چمک رہے تھے اور سردی میں گاتے وقت منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ میں فرد میں لپٹا۔ دہی کا کٹورہ ہاتھ میں مسجد کے تھڑے پر کھڑا۔ گردن ایک طرف ڈھلکائے آنکھیں سُکیڑے اُس ٹولی کو نعت پڑھتے دیکھتا رہا۔ مجھے ان ٹولیوں کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر وہ میرے سوتے ہی گلی میں سے نعتیں پڑھتی نکل جایا کرتی تھیں۔ لیکن اگر میری آنکھ کھُل جاتی تو میں بھاگ کر کھڑکی میں آن کھڑا ہوتا یا گلی میں نکل آتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے نعت خوانوں کی یہ ٹولیاں خیال کی دُنیا سے آتی ہیں اور خوابوں کی سرزمین کو چلی جاتی ہیں۔

ٹولی نعت کا پورا بند وہاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا اور پھر نعت پڑھتی ہوئی وہاں

سے نکل گئی۔ میں نے کنکھیوں سے سعیدہ کے مکان کی طرف دیکھا۔ سعیدہ چق ذرا سی اوپر اُٹھائے نعت خوانوں کو گلی میں سے گزرتے دیکھ رہی تھی۔ گیس کی روشنی میں سعیدہ کی ناک کا سُرخ کیل چمکا اور پھر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

بانگی مسجد کے رونٹ پر بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے تھڑے پر کھڑے دیکھ کر کہا۔

"اوے! دہی لے کے گھر جا"

عمدو کا کا نانبائی کے تنور میں سے نارنجی رنگ کے شعلے نکل کر چھت کو چھو رہے ہیں۔ کامی سینڈو دونوں ہاتھوں سے میدے کے پیڑے بنا بنا کر تختے پر ساتھ ساتھ جوڑتے جا رہا ہے۔ عمدو کا کا کٹورے میں دودھ اور کھجوریں بھگو رہا ہے۔

بودی چوکیدار منہ سر لپیٹے گرم فوجی برانڈی میں لپٹا بنچ پر ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھا سگرٹ پی رہا ہے اور اس کا بادامی رنگ کا کتا اُس کے پاؤں میں سکڑا بیٹھا ہے۔ بودی اپنی طرز کا واحد پہرے دار ہے۔ وہ ساری رات بوٹ پہنے کمبے منہ سر لپیٹے بنچ پر دراز رہتا ہے۔ اِدھر اُدھر کہیں کوئی کھٹکا ہو تو کتا جا کر خبر لاتا ہے۔ بودی اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہلتا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ غزنی گلی کی جانب کسی شے کے گرنے کی آواز آئی۔ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ بودی نے کتے کو اشارہ کیا۔ کتا لپک کر دوڑا اور کوئی ایک منٹ بعد کتے کے بھونکنے اور چور کے شور مچانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کوتوالی کے پاس جا کر کتے نے چور کو گرا لیا۔ پھر بودی بڑے آرام سے اُٹھا۔ برانڈی کی پیٹی کسی، ہاتھ میں ڈنڈا تھاما، سگرٹ سلگایا اور کوتوالی کے پاس جا کر چور کو اس حالت میں پکڑا کہ وہ نیچے سڑک پر گرا ہوا تھا اور کتا اس کی چھاتی پر چڑھا بھونک رہا تھا۔ بودی ہر فن مولا بھی ہے۔ محلے میں کسی کا پنکھا، گراموفون مشین، بجلی کی استری، تالا چاہے کچھ خراب ہو بودی اُسے ایک دم سارا کھول کر دوبارہ ٹھیک کر دیگا۔

اب گلی کے ہر گھر کے باورچی خانے میں لیمپ روشن ہیں اور کہیں کہیں پر نالوں سے پانی گرنے کی آواز آرہی ہے۔ میر صاحب بھی جاگ اُٹھے ہیں اور بڑی اونچی آواز میں کسی آیت شریفہ کا بار بار ورد کر رہے ہیں۔ بوڑھا جھکی ہوئی کمر والا گاما ماشکی کمر پر پانی سے بھری ہوئی مشک لیے میرے قریب سے گزر گیا ہے۔ چمڑے کی گیلی مشک میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ اتنی سردی میں وہ صبح صبح لوگوں کے ہاں پانی بھرتا ہے خدا جانے اُسے سردی کیوں نہیں لگتی۔

میں دہی لے کر اپنے گھر آ گیا ہوں۔ گھر میں سبھی بیدار ہو چکے ہیں۔ ایک اور نعت خوان ٹولی نعت گاتی ہوئی گلی میں سے گزر گئی ہے۔

تیڈی سواری یا نبی عرش بریں اتے گئی اے ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھ کے جلوہ طور تے موسیٰ نوں ہوش نہ رہیا اے

میں کھڑکی کی طرف بھاگتا ہوں۔ ٹولی گیس کی روشنی میں سبز جھنڈے لہراتی گلی کا موڑ گھوم رہی ہے

اُن دِنوں ہمیں روزہ رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ہم بڑے اشتیاق سے سحری کے وقت اٹھ کر سحری کھاتے لیکن دوپہر کے بعد جب بھوک برداشت سے باہر ہو جاتی تو ہم پانی پی کر روزہ توڑ دیتے۔ مگر گھر میں کسی کو نہ بتاتے۔ افطاری کے وقت گھر پہنچ جاتے اور پھل وغیرہ رکابی میں رکھ کر یوں نوبت بجنے کا انتظار کرنے لگتے جیسے بڑے روزہ دار ہوں۔ کسی روز روزہ رکھ بھی لیتے تھے۔ اس روز تو گھر کے علاوہ سامنے والی مسجد میں جا کر بھی افطاری کی مٹھائی اور پھل وغیرہ اڑاتے۔

میرے ہم جولیوں نے ڈیوڑھی میں آ کر مجھے آواز دی ہے۔ میں نے جلدی جلدی سحری کھائی ہے اور آدھے پراٹھے میں ایک بوٹی رکھ کر اپنے ساتھ لے کر نیچے آ گیا ہوں۔ ہم بچے خیر دین گڈی والے کی بند دکان کے پھٹے پر ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں اور باتیں کرنے لگے ہیں۔ اب گلی میں سے نہ تو کوئی نعت خوانوں کی ٹولی آ رہی ہے اور نہ ڈھول تاشے بجا کر جگانے والے آ رہے ہیں۔ یہ لوگ بھی اب سحری کھانے میں مصروف ہوں گے۔ اب گلی میں اکا دکا فقیروں کی صدائیں لگنے لگی ہیں۔ گلی کی نکڑ پر اکتارے والا سائیں نمودار ہوا ہے۔ لمبی جٹائیں، سُرخ آنکھیں، پرسوز آواز اور کندھے پر پیوند لگا کمبل ـــــ وہ اکتارے پر گاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔

تیرا ہو جائے گا باغ ویران
تے مالی نے ٹُر جاناں

مجھے یاد ہے میں اس کی آواز پر بڑا اداس ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں لگتا جیسے مالی چلا گیا ہے اور باغ ویران ہو گیا ہے۔ درخت سوکھ گئے ہیں۔ ندی نالے خشک ہو گئے ہیں۔ گھاس پر زرد زرد پتے بکھرے پڑے ہیں۔ ابراہیم عطار کے گھر کی جانب اس بوڑھے فقیر کی آواز گونجی ہے جو ہر مکان کے پاس کھڑا ہو کر حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا یہ شعر پڑھتا ہے اور پھر آگے چل دیتا ہے۔

اٹھ جاگ فریدا ستیا تیری ڈاڑھی آیا بور ‏ ‏ • ‏ ‏ اگا نیڑے گیا تے پچھا رہ گیا دور

اُن دنوں میں اس شعر کے مفہوم سے بے خبر تھا۔ میں بوڑھے فقیر کی زبان سے اسے سنتا تو مجھے یوں لگتا جیسے ایک بوڑھا آدمی ہے جس کی داڑھی پر آم کا بُور گر رہا ہے۔ مجھے اس بوڑھے کا چہرہ بڑا نورانی لگتا اور میری آنکھوں میں ٹھنڈے نُور کی روشنی سی سما جاتی۔

سحری کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ گلی میں چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ مکانوں کے دروازے کھل رہے ہیں۔ کوئی دودھ لے کر جا رہا ہے۔ کوئی دہی لے کر جا رہا ہے۔ گرم بچھونوں سے زبردستی اٹھوائی گئی بچیاں سردی میں ٹھٹھرتی، نیند بھری آنکھیں لیے تنور کے پاس رومال بچھائے بیٹھی ہیں اور اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں۔ کسی کے مکان کا دریچہ کھلتا ہے اور کسی عورت کی آواز بلند ہوتی ہے۔

"کاکا جی! بڑی دیر ہو گئی۔ اذان ہونے کو ہے۔ لالی کو کلچے دے دیں اب"

کاکا محمد ادھر سے اُدھر جھولتے ہوئے تنور میں کلچے لگا بھی رہا ہے اور لوہے کی لمبی سلاخوں سے انہیں نکال بھی رہا ہے۔ گرم گرم بادامی اور سُرخ رنگ کے خستہ کلچے، گُردے تافتانے تنور سے نکلتے ہی رومالوں اور ٹوکریوں میں سمٹ کر گلی محلے کے مکانوں کو جا رہے ہیں۔ سینڈو نے دہی کا پیالہ اپنے پاس ہی تختے پر رکھا ہے۔ وہ میدے کے پیڑے بھی گھڑ رہا ہے اور ساتھ دہی کلچہ بھی کھا رہا ہے یہ اس کی سحری ہے ـــــ میدے کی بوریوں کے پاس چوکی پر رکھے ہوئے سماوار میں سبز چائے جوش کھانے لگی ہے۔ کاکا محمد اپنے کاریگر کو آواز دیتا ہے۔

"جیوے اوئے ـــــ چائے نوں ویکھ"

سحری کا وقت ختم ہو گیا۔ گلی والی مسجد کی نوبت دھما دھم بجنے لگی۔ ہم بھاگ کر مسجد میں گھس گئے اور بانگی کو نوبت بجاتے دیکھنے لگے۔ دل میں ہمیشہ یہ آرزو رہتی کہ ہمیں بھی نوبت بجانے کا موقع ملے۔ بانگی اونچا لمبا پورا کشمیری ہاتو تھا۔ وہ دھڑا دھڑ نوبت کو کوٹ رہا ہوتا۔ جب وہ تھک جاتا تو ہم باری باری نوبت بجاتے اور بڑے خوش ہوتے۔ بانگی پانی پی کر گلا صاف کرتا اور اذان دینی شروع کر دیتا۔ اُن دنوں مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر نہیں لگے ہوتے تھے۔ مگر مؤذنوں کی آوازیں بڑی صاف، روشن اور پاٹ دار ہوتی تھیں۔ ہمارے محلے کی اذان بکر واناں بازار میں جاتی اور وہاں کی اذان کی آواز ہماری گلی میں آیا کرتی تھیں۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی ہم سارے بچے دھنو کریل کی ٹونٹیوں کی طرف لپکتے۔ مؤذن جب اذان کے آخر میں اللہ اکبر کہتا تو ہم ٹونٹیوں سے منہ لگا دیتے

اور پیٹ بھر کر پانی پی لیتے۔ اس خیال سے کہ ہم نے روزہ رکھا ہے اور اب افطاری تک پانی نہیں پینا، یہ دوسری بات ہے کہ ہم اسکول کے نلکے پر چھپ چھپ کر پانی پی لیا کرتے تھے۔

مسجد کے محرابی دروازوں پر پردے گرے ہوتے۔ باہر ٹھنڈے فرش والے صحن میں سخت سردی ہوتی۔ لیکن مسجد کے اندر کی فضا نیم گرم ہوتی اور نمازی بڑے سکون سے عبادت کرتے۔ ہمیں نماز پڑھنی نہیں آتی تھی۔ کچھ نماز پڑھنے کا شوق اور کچھ دسمبر کی ٹھٹھرتی رات میں مسجد کے اندر کی گرم فضا کا تصور ہمیں کھینچ کر مسجد کے اندر لے جاتا۔ سب سے پچھلی قطار میں ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کیے کھڑے ہو جاتے اور کبھی کبھی آنکھ کھول کر دیکھ لیتے کہ نمازی کب رکوع میں جا رہے ہیں اور کب سجدے میں

—— مجھے یاد ہے ایک بار مسجد میں شاید ستائیسویں کی رات تھی۔ تراویح کے بعد ختم شریف تھا۔ تمام نمازی مسجد کے اندر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ بیچ میں رکابیوں اور خوانوں میں قسم قسم کی مٹھائیاں، کھجوریں، گلاب کے عرق سے بھری ہوئی گلاب دانیاں اور پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ اگر دانوں میں اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ فضا پھلوں، پھولوں، مٹھائیوں اور اگربتیوں کی خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ بانگی ہر دو منٹ کے بعد گلاب دانی اٹھا کر لوگوں پر گلاب کا عرق چھڑک دیتا۔ ہم عرق کے ٹھنڈے چھینٹوں سے بچنے کے لیے بازوؤں میں منہ چھپا لیتے۔ آخر ایک نمازی نے اسے منع کر دیا کہ وہ بار بار عرق نہ چھڑکے۔

ایک مقام ایسا آیا کہ بتیاں گل کر دی گئیں اور اندھیرے میں نمازی بلند آواز سے بڑے ذوق شوق کے ساتھ "یا حی و یا قیوم" کا ورد کرنے لگے۔ اندھیرے میں خدا جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ بیچ میں رکھی ہوئی شکر پاروں کی پلیٹ کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ جونہی میرے ہاتھ نے پلیٹ میں رکھے ہوئے شکر پاروں کو چھوا، میں نے ڈر کر ایک دم ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ مجھ سے پہلے کسی کا ہاتھ شکر پاروں کی پلیٹ تک پہنچ چکا تھا اور ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے نے بھی اپنا ہاتھ ڈر کر کھینچ لیا ہو گا۔ اتنے میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک باریش بزرگ کو بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ مجھ سے پہلے شکر پاروں کی پلیٹ تک پہنچا ہوا ہاتھ ان بزرگ کا نہیں تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد تراویح کا وقت ہوتا تو محلے بھر میں بڑی رونق ہو جاتی۔ کوئی اس مسجد میں تراویح پڑھنے جا رہا ہے تو کوئی اُس مسجد میں۔ اُن دنوں میں خوب نمازیں پڑھا کرتا اور تراویح تو بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ آخری تراویح کے قریب پہنچ کر تھک جاتا۔ مگر جماعت نہ چھوڑتا تھا۔ خاص طور پر جب نمازی دو تراویح کے درمیانی وقفے میں "یا ارحم الراحمین" کا ورد کرتے تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں آنکھیں بند کر لیتا اور پھر تصور میں خوبصورت باغ، گھنے درخت، درختوں پر کھلے ہوئے پھول، سنہری دھوپ میں نیلے آسمان پر اڑتے سفید کبوتر اور آلوچوں کے باغ میں سے ہو کر گزرنے والی سبک رفتار ندیاں دیکھتا —— آج بھی رمضان المبارک کے مہینے میں میں جب کسی مسجد سے یہ آواز سنتا ہوں تو بعینہٖ بچپن کی اُسی کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں۔

شبینہ یعنی ستائیسویں کی رات کو شہر میں اور خاص طور پر ہمارے محلے میں بڑی رونق ہوتی۔ اُس رات میرا خیال ہے شاید ہی کوئی شخص سوتا ہو گا۔ گلی گلی، محلے محلے لوگوں کی چہل قدمی رات بھر جاری رہتی۔ مسجدوں میں جھاڑ فانوس روشن ہوتے۔ میناروں اور گنبدوں پر لال پیلی بتیاں روشن ہوتیں۔ مسجدوں کے دروازوں کو کیلے کے پتوں اور گیندے کے کیسری پھولوں سے سجایا جاتا۔ ان دنوں گیندے کے کیسری اور زرد پھولوں میں ایک عجیب قسم کی مہک ہوا کرتی تھی۔ اور یہ پھول امرتسر میں بڑا عام تھا۔ ویسے تو امرتسر کے باغوں اور کھیتوں میں سچا پہاڑی رنگ کا گلاب بھی بڑی کثرت سے پایا جاتا تھا، لیکن گیندے کا رواج زیادہ تھا۔ بیاہ شادیوں پر گیندے کے ہار پہنے جاتے تھے۔ میں سردیوں کی ٹھٹھرتی صبح کو سیر کے لیے باہر کھیتوں میں جاتا تو چالیس کنوؤں کی جانب ٹیوب ویل کے پچھواڑے بٹالہ گورداسپور کو جاتی ہوئی ریلوے لائن کے پاس کھیتوں میں گیندے کے پھول ٹھنڈی یخ شبنم میں بھیگے ہوتے۔ میں ذرا ہاتھ لگاتا اور میرا ہاتھ ٹھنڈی شبنم سے بھر جاتا۔ میں وہ ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیتا۔ آج لاہور کی گرد آلود سڑکوں پر چلتے چلتے گیندے کے ان پھولوں کی یاد آتی ہے تو اپنا خالی ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیتا ہوں اور میرا ہاتھ آنسوؤں کی گرم شبنم سے بھر جاتا ہے۔ الوداع! گیندے کی مہک! الوداع گلاب کی مہک! الوداع! سبز چائے اور لونگ کی خوشبو! الوداع رمضان المبارک کی خوشبو!

شبینے کا ہم بڑی بے تابی سے انتظار کیا کرتے تھے اور ساری رات جاگ کر گزارتے تھے۔ ابھی مسجد ٹیلیاں میں ہیں تو ابھی مسجد جان محمد میں —— وہاں سے اٹھتے ہیں تو ہال بازار والی مسجد خیر الدین میں تبرک

کھاتے ہیں۔ ایک مسجد کے رُونٹ پر بیٹھ کر نان اور حلوہ کھاتے۔ دوسری مسجد میں جا کر پیالوں میں تیز نمک والی سبز چائے پیتے۔ سبز چائے کے بڑے بڑے پتیلے ہر مسجد کی ڈیوڑھی میں آگ پر چڑھے ہوتے اور دو ایک بوڑھے اُن کے پاس بیٹھے آگ تاپ رہے ہوتے اور ساتھ ساتھ پتیلے میں پانی کے ڈونگے بھی انڈیلتے جاتے۔ مسجد کے صحن سردی میں منتظر رہے ہوتے۔ مسجد کے محرابی دروازوں پر ٹمبے گرے ہوتے اور اندر سے حافظ کے تیز تیز قرآن شریف پڑھنے کی آواز آ رہی ہوتی۔ سردیوں کی رات کے نکھرے ہوئے آسمان پر ستارے بڑی آب و تاب سے جھلملا رہے ہوتے۔ لوگ ٹونٹیوں کے ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور جلدی جلدی یخ بستہ صحن عبور کر کے منڈا اٹھا مسجد کے اندر چلے جاتے۔

افطاری کے وقت یوں تو محلے کی دوسری دکانیں بھی خوب اہتمام سے سجائی جاتیں، مگر کاکا عمدو کی دکان کی سج دھج نرالی ہوتی تھی۔ پہلے روزے ہی کو وہ دکان کے آگے فرش سے لے کر دکان کی پیشانی تک لکڑی کے لمبے لمبے تختے جوڑ کر سیڑھیاں سی بنا دیتا۔ ان سیڑھیوں پر سفید چادریں ڈال دی جاتیں اور ان پر ورق لگی باقرخانیاں، بڑے بڑے اندرسے، شیرمال، کھنڈ کھچوں کے تھال نمکین کچوں کی سینیاں، خشخاش لگے گردے تافتانے اور کلچے اس طرح سجا دیئے جاتے کہ کہیں کوئی جگہ نہ بچتی۔ کاکا عمدو بوسکی کی قمیض، ریشمی تہمد اور کالا پمپ شو پہنے خوشی سے جھوم جھوم کر دکان کے اندر باہر پھر رہا ہوتا۔ وہ اپنا سماوار تختے پر لا رکھتا۔ افطاری کی نوبت بجتی تو وہ سبز چائے کا خوشبودار گھونٹ پی کر روزہ افطار کرتا۔ اُس کا کاریگر سینڈو گاہکوں کو سودا دینے میں مصروف ہوتا اور ساتھ ساتھ چائے بھی پیتا اور کاکا عمدو کی آنکھ بچا کر ایک آدھ کھنڈ کچہ اٹھا کر اپنی جھولی میں بھی گرا لیتا۔ حنایتی حلوائی کی دکان پر بھی بجلی کے قمقمے روشن ہوتے اور تختوں پر انواع و اقسام کی ورق لگی مٹھائیاں بجلی کی روشنی میں چمک رہی ہوتیں۔ اُس کا کاریگر بھی مٹھائی کے سرخ گلاب بنانے میں بڑا ماہر تھا۔ یہ گلاب بالکل سرخ گلاب کے پھولوں کی طرح مٹھائی کے ہر تھال میں ہاروں کی طرح سجے ہوتے۔ دُور سے وہ اصلی گلاب کے ہار معلوم ہوتے۔ مٹھائی کے یہ سرخ گلاب بڑے پیارے لگتے۔ میں حیران ہوتا کہ لوگ اسے کس طرح کھا جاتے ہیں۔ گھر میں مٹھائی کی ٹوکری آتی تو میں گلاب کا پھول اٹھا کر اپنی الماری میں چھپا لیتا۔ دوسرے روز اُس پر چیونٹیاں چڑھی ہوتیں۔ میں پھونکیں مار مار کر چیونٹیوں کو جھاڑتا، مگر وہ دو ایک روز ہی میں مٹھائی کا آدھا گلاب کھا جاتیں۔ اب مٹھائی کے وہ گلاب نہیں بنتے

اب گلاب ویسے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سرخ گلاب سے اب بیاہ شادی یا جنازے ہی پر ملاقات ہوتی ہے بیاہ شادی پر وہ موٹر کے تپتے بونٹ پر جل رہا ہوتا ہے اور جنازے پر لوگوں کے پاؤں تلے کچلا جا رہا ہوتا ہے۔

امرتسر کے رمضان المبارک کی سحری میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ سحری کا انتظار میں اس شوق سے کرتا گویا صبح عید ہے۔ تراویح کے بعد گھر کے سب لوگ سو جاتے، مگر میں جاگ رہا ہوتا۔ کان سحری کے وقت جگانے والی نعت خوانوں کی آوازوں یا ڈھول تاشوں کی دُور سے آتی صداؤں پر لگے ہوتے۔ اسی انتظار میں، میری پلکیں بوجھل ہو جاتیں اور میں سو جاتا۔ آدھی رات کو کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو چپکے سے لحاف سے نکل سخت سردی میں باہر صحن میں آ جاتا۔ آسمان پر ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے ہوتے۔ میں نے چند ستاروں کا حساب لگا رکھا تھا کہ جب یہ آسمان کے ایک خاص حصے میں آ جائیں تو سحری کا وقت ہو جاتا ہے۔ میں بغلوں میں ہاتھ دیئے، سردی میں ٹھٹھرتا۔ آدھی رات کو مکان کے ٹھنڈے صحن میں اکیلا کھڑا آسمان کی طرف منہ اٹھائے اپنے مطلب کے ستارے تلاش کرنے لگتا، مگر وہ ستاروں کے عظیم جھرمٹ میں گڈمڈ ہو گئے ہوتے اور مجھے کہیں نظر نہ آتے۔ پھر میں کھڑکی میں سے نیچے گلی میں جھانکتا۔ گلی کمیٹی کے لیمپوں کی دھیمی روشنی میں سنسان ہوتی۔ پھر میں سانس روک کر ہمہ تن گوش ہو کر دُور سے آنے والی کسی ڈھول کی آواز سننے کی کوشش کرتا۔ پھر سلامات کے ایک بجے کون جگانے آتا ہے! اب مجھے سردی لگنے لگتی اور میں ناامید ہو کر واپس اپنے لحاف میں گھس جاتا اور گرم گرم لحاف بہت جلد مجھے ایک بار پھر نیند کی دنیا میں لے جاتا۔ اور جب ڈھول تاشوں اور ٹولیوں کے نعتیں پڑھنے کی آواز پر آنکھ کھلتی تو یوں خوش ہوتا گویا کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔

رمضان شریف کی آخری سحری بڑی دل گداز اور اداس ہوتی۔ تراویح پڑھنے کے بعد روزہ دار ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے۔ حافظ اور سامع کو نذرانہ دیا جاتا۔ سر پر پٹکا باندھا جاتا۔ سحری کے وقت بہت کم ڈھول بجانے والے آتے۔ جوں جوں رمضان شریف کی آخری تاریخیں قریب آتی جاتیں، ایک ایک کر کے سب بچھڑتے جاتے۔ صرف گونگا بگل والا، حافظ نوبت والا اور نعت خواں ٹولیاں باقی رہ جاتیں۔ نعت خواں ٹولیاں رمضان المبارک کی رخصتی کے گیت گاتے ہوئے آتیں۔

آخر:

ہُن ہوون جدائیاں لگیاں نے

پچھلے پہر گلی کی ٹھٹھرتی ہوئی سنسان فضا غمگین لبادہ سا اوڑھ لیتی۔ میں گلی میں آ کر ایک ایک نعت خوان کی صورت کو تکتا رہ جاتا۔ اب یہ شکلیں ایک برس تک دیکھنے کو نہ ملیں گی۔ کون پچھلی رات کو ستاروں کی چھاؤں میں اٹھتا ہے اور گلی گلی نعتیں پڑھتے ہوئے روزہ داروں کو جگاتا پھرتا ہے بھلا! میں ان کے غم زدہ الوداعی گیت سُن کر اداس ہو جاتا۔ بعض نعت خوانوں کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں۔ مجھے یوں لگتا جیسے گلی میں سے کوئی دُلہن ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہو رہی ہے بابل کے پیارے گھر کو چھوڑ کر سسرال جا رہی ہے۔ مجھے سحری ایک دُلہن کے رُوپ میں دکھائی دیتی۔ نرگسی آنکھوں اور تاروں جڑے آنچل والی دُلہن! پچھلے پہر کی دلہن! آنکھوں میں آنسو ہیں۔ بابل کی دہلیز سے قدم نہیں اٹھ رہے، مگر جانا بھی ضرور ہے۔ جدائی! جدائی! جدائی مقدر ہو چکی ہے۔ بوجھل دل لے کر ڈولی میں بیٹھ چکی ہے۔ سسکیاں ہیں۔ سکھیوں کی آہیں ہیں۔ محبت کرنے والوں کی نگاہیں دُور تک تعاقب کر رہی ہیں۔ ڈولی گلی میں سے ہولے ہولے رخصت ہو رہی ہے۔ الوداع! اے عروسِ رمضان! الوداع! تو نے گجردم اٹھ کر ہمارے منہ شبنم سے دھلائے۔ ہمیں ستاروں کی چھاؤں میں گیندے اور گلاب کے باغوں کی سیر کرائی۔ ہم نے تیرے دامن کو تھام کر صبح کی شبنمی ہواؤں میں پرواز کی۔ ہم تیرا خیال دل میں لے کر سوئے اور تیری یاد کو گلے لگا کر تجھ سے رخصت ہوئے۔ الوداع! الوداع! گلاب کے پھول! قہوے کی خوشبو! دار چینی اور لونگ کی خوشبو! سبز چائے اور گیندے کی خوشبو!

کل میں نے گیندے کو ہاتھ لگایا تھا تو میرا ہاتھ پاکیزہ شبنم کے موتیوں سے چمک اٹھا تھا اور آج میں جب پھول کو ہاتھ لگاتا ہوں مجھے کسی مُردہ جسم کو چھونے کا احساس ہوتا ہے۔ آہ! خوشبو، میرے بازوؤں میں پھول کی لاش چھوڑ کر اڑ گئی!

امرتسر کی عید

امرتسر کی عید کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ایک بھولی بھالی معصوم بچی کی تصویر آ جاتی ہے۔ اس کے ریشمی کپڑوں پر گوٹا لگا ہے۔ سر پہ جھلمل کرتی چُنی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہے۔ پیروں میں لال گرگابی ہے۔ لال ہری چوڑیاں کھنک رہی ہیں۔ ایک ہاتھ میں غبارہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں ورق لگی سویوں سے بھری ہوئی تھال ہے جس پر کروشیے سے کاڑھا ہوا سفید رومال پڑا ہے اور وہ گلی میں سے گزر رہی ہے۔ گلی عید کی خوشیوں بھری صبح کے ساتھ بیدار ہو گئی ہے۔ غباروں کے ساتھ لگے باجوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ گھروں میں مائیں بچوں کو نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنا رہی ہیں۔ گرم گرم سویوں سے بھرے ہوئے طشتوں پر چاندی کے ورق لگا رہی ہیں۔ ہر گھر سے اصلی گھی میں پکی سویوں کی مہک کے ساتھ حنا کے عطر، افغان سنو اور پاؤڈر کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ بچے لال گلابی واسکٹیں، نیلی پیلی ٹوپیاں اور نئے جوتے پہن گھروں سے نکل کر اپنے بہن بھائیوں اور ہم جولیوں کے ساتھ گلی میں عنایتی مٹھائی والے، گاما گنڈیریوں والے، جان کھلونوں والے اور عیدو دہی بھلے والے کی دکانوں کے باہر موڑھوں پر بیٹھ کر کھا پی رہے ہیں اور بے دھڑک عیدی کے پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ سویوں کی تھالیاں سجی سجائی بچیوں کے ہاتھوں ایک گھر سے دوسرے گھر کو جا رہی ہیں۔ گلی والی مسجد میں محلے کے ہر گھر سے سویاں پہنچ رہی ہیں۔ بانگی بھری ہوئی تھال حجرے میں لے جاتا ہے اور خالی تھال لے کر باہر آ جاتا ہے۔ سویوں کے گھی سے اس کے ہونٹ چمک رہے ہیں۔ آج اس کی شلوار قمیض بھی دھلی دھلائی ہے اور ڈاڑھی میں تیل لگا ہے۔

سحری کے وقت ڈھول تاشے بجا کر جگانے والے گلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ ہر مکان کے آگے جا کر ڈھول بجاتے ہیں اور وہی آواز لگاتے ہیں جو رمضان المبارک میں سحری کے وقت لگایا کرتے

تھے۔ ایک بڑے سے جھولے میں وہ سریاں، پلاؤ، چاول، آٹا، گڑ کی ریوڑی جو کچھ ملتا ہے ڈالتے جاتے ہیں اور پھر اگلے مکان پر جا کر آواز لگاتے ہیں۔

"خیر دین آگیا، سوتوں کو جگا گیا۔"

ہم انہیں بڑے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ اچھا تو یہ وہ پُراسرار ڈھول والے تھے جو روزوں میں پچھلے پہر کے اندھیروں میں ڈھول بجاتے گلی میں سے گزر جایا کرتے تھے۔ ایک طرف سے گونگا بگل والا نمودار ہوتا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں بگل بجا کر ٹارزن کی طرح چیخ مار کر گلی میں سے گزر جاتا ہے۔

بازار میں سے سینما والوں کا جلوس گزر رہا ہے۔ دو آدمی دھڑا دھڑ ڈھول بجا رہے ہیں۔ ان کے چہرے سردیوں میں بھی پسینے سے تر ہیں۔ پرل ٹاکیز والا مشہور سکھ سُرمئی اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ جوتے پہنے ساتھ ساتھ ٹلی بجا رہا ہے۔ ٹلی بجاتے ہوئے ڈھول کی لے پر اس کا سر بھی ہل رہا ہے۔ پرل ٹاکیز میں بھی عید کی خوشی میں نئی فلم لگی ہے۔ گلی کے بچے جلوس کے ساتھ ساتھ ہو لیتے ہیں اور جلوس کو اگلے محلے تک چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں۔ محلے کی دکانیں دُلہنوں کی طرح سجی ہوئی ہیں۔ کاکا محمد کی دکان کی تو آج سج دھج ہی نرالی ہے۔ تخت پوش سے لے کر چھت تک ورق لگے اراروٹ، باقر خانیوں، کھنڈ قلچوں اور شیرمالوں کے تھال سجے ہوئے ہیں۔ عنایتی حلوائی نے قسم قسم کی مٹھائیاں بنا رکھی ہیں۔ لوگ پاس کے سرکنڈوں سے بنی ٹوکریوں میں سیر سیر دو دو سیر مٹھائی لیے اپنے رشتے داروں کے گھروں کو عید کی مبارک دینے جا رہے ہیں۔ عنایتی نے آج گلگلے نہیں بنائے۔ گلگلے ٹوڑ کے دن بنائے جاتے ہیں۔ کوئی دکاندار ایسا نہیں جس نے تخت بچھا کر دکان آدھی سڑک تک نہ بڑھا لی ہو۔ کیسر سنگھ اور میر حسن منیاری والے کی دکان پر بڑی گاہکی ہے۔ بچیاں ابھی تک کلپ، کانٹے، کلپوئے، گوٹا اور رنگ برنگے ربن خرید رہی ہیں۔ نوجوان اپنی پسند کی جرابیں دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی جھک کر اپنے بچے کی نیکر میں نئی پیٹی ڈال رہا ہے۔ دوسرا اپنے ننھے بچے کو دکان کے تھڑے پر کھڑا کیے اس کے نئے بوٹ کے تسمے کس رہا ہے۔ دوست محمد قصائی کی دکان پر بھیڑ لگی ہے۔ وہ خود گوشت کاٹ رہا ہے۔ دوست محمد کا نورانی سفید ڈاڑھی والا سرخ و سپید چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں چھری اٹکا کر وہ بڑے انہماک سے گوشت بنا رہا ہوتا تو

اُس کے ہونٹ بائیں طرف کو اپنے آپ لٹک جاتے اور زبان کا پتلا سرا باہر جھلکنے لگتا۔ اُس کا بڑا بیٹا حسین مشین چلا کر قیمہ تیار کر رہا ہے اور چھوٹا بیٹا نذیر عرف جیرا سری پائے بنا رہا ہے۔ جیرا میرا دوست تھا۔ منہ اندھیرے وہ اپنی دکان کھولتا تو ہم رات کا بچا ہوا گوشت اور چربی آگ جلا کر پکاتے اور مزے لے لے کر کھا جاتے۔ ایک بار وہ محلہ بھبے والے کھوہ میں سری پائے بھنوانے گیا تو میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ تنور میں سے آگ کے سرخ و زرد شعلے باہر لپک رہے تھے۔ ایک کالا بھجنگ آدمی سامنے بھیے پر بیٹھا تھا۔ وہ بکرے کی سری کو سلاخ میں گاڑ کر تنور میں لے جاتا۔ گوشت اور بالوں کے جلنے کی بُو کے بھبکے اٹھتے۔ وہ جلدی سے بھنی ہوئی سیاہ کالی سری کو [illegible] باہر نکال کر دوسری طرف پھینک دیتا۔ میں اور جیرا اپنے سری پائے ٹوکری میں ڈال کر ایک طرف نلکے کے پاس بیٹھ گئے اور جانوروں سے انہیں مل مل کر دھونے لگے۔ میں جیرے کو منع کیا کرتا۔

"یار، ان کی آنکھوں پر جھانواں مت پھیرو۔"

اور جیرا ہنس کر کہتا۔

"او نے، یہ تو مری ہوئی سریاں ہیں۔"

جیرا اور میں بڑے دوست تھے۔ ہم ایک ساتھ مل کر ہندو سکھوں کے محلے کے بجلی کے بلب توڑتے۔ اپنے محلے کی مرغیاں اٹھا کر قبرستان میں لے جاتے۔ وہیں ذبح کر کے انہیں خشک جھاڑیاں جلا کر پکاتے اور کھا جاتے تھے۔ سنتا ہے جیرا آج کل کراچی کی لی مارکیٹ میں دکان کرتا ہے اور مجھے بہت یاد کرتا ہے۔

ابراہیم عطار اور بند سنگھ پنساری کی دکانوں سے لوگ چاندی کے ورق، چینی، شہد، چھوہارے، کھوپے گری اور بادام خرید رہے ہیں۔ بھاری بھرکم بدن، ناٹا قد، سرخ رنگ اور عینک کے شیشوں کے پیچھے جھلملاتی آنکھیں۔ یہ ہے ابراہیم عطار۔ دکانداری سے زیادہ طب کی پرانی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوقین۔ ایک روز صبح صبح آکر دکان کھولی۔ شربت کی بوتلوں پر پانی چھڑک کر تانبے کی ٹوپیاں ان پر ڈالیں۔ پھر جا گدی پر بیٹھ گیا اور عینک صاف کر کے طب کی پرانی کتاب کے مطالعے میں ڈوب گیا۔ اتنے میں ایک بچہ گلاس ہاتھ میں لیے آیا اور بولا:

"حکیم جی! اماں کہتی ہے ایک آنے کا بزوری شربت دے دیں۔"

ابراہیم عطار نے بڑے غصے سے بچے کو دیکھا۔ کتاب بند کر کے گدی پر رکھی اور یہ کہہ کر شربت کی بوتل اٹھائی۔

"عجیب مصیبت ہے۔ ادھر دکان کھولو، اُدھر گاہک آنا شروع ہو جاتے ہیں۔"

گلی میں طرح طرح کے فقیروں کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ ہٹے کٹے گُرز مار ہاتھوں میں کانٹے دار لوہے کے گُرز اور شانے لیے ہر مکان کے آگے آواز لگا کر خیرات مانگ رہے ہیں۔ کوئی خیرات دینے سے انکار کرے تو گُرز اپنے سر پر مار کر لہولہان ہو جاتے ہیں۔ ایک فقیر ہمیشہ ہماری گلی میں آیا کرتا۔ اُس کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہوتی۔ اونچا لمبا ادھیڑ عمر کا یہ فقیر ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس ہوتا سر پر سُرمئی رنگ کی سمور کی ٹوپی ہوتی۔ وہ پان کھا رہا ہوتا اور بڑی بڑی مونچھوں میں کہیں کہیں سفید بالوں کے تار چمک رہے ہوتے۔ وہ میرٹھ ضلع کا رہنے والا تھا اس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ اس کا مجھے یہ مصرع یاد رہ گیا ہے:

"بلا ہے گیسوؤں والے۔"

اُسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ میکسم گورکی کے قازق کردار یاد آ جاتے تھے۔ اب گلی میں کمیاں یعنی کنول کے پھول بیچنے والی لڑکیاں نمودار ہو گئی ہیں۔ ان لڑکیوں نے سیاہ لمبی قمیضیں اور سیاہ تہبند باندھ رکھے ہیں۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں۔ کندھوں پر کنول کے لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے پھول ڈالے ہیں اور گلی گلی میں آوازیں لگاتی پھرتی ہیں۔

"کمیاں لے لو کمیاں۔"

عورتیں کنول کے پھول خرید کر اُن کے گہنے بنایا کرتیں۔ عید کے روز یہ جس گھر میں پھول بیچنے جاتیں، وہاں سے سویاں ضرور اپنے جھولے میں بھر کر لاتیں۔

بھنگنیں سروں پر تھال اٹھائے ہر گھر میں جا رہی ہیں اور عید کی سویاں اور عیدی وصول کر رہی ہیں۔

امرتسر میں عید کی تیاریاں ایک رات پہلے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ اُس رات کو حرفے کی رات کہا جاتا۔ حرفے کی رات ہمیں خوشی سے نیند نہیں آتی تھی۔ تقریباً ساری رات جاگتے رہتے۔ حرفے کی رات کی خوشی ہمیں عید سے زیادہ ہوتی۔ یہ عید کی آمد کا اعلان تھا جس طرح دلہن کی زندگی میں شادی سے ایک روز پہلے کی رات، سہاگ رات سے زیادہ پُراسرار اور امنگوں بھری ہوتی ہے۔ اس

رات کو حسین خوابوں کا محل تیار کیا جاتا ہے۔ سہاگ رات کو تو خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور تعبیر کا سفر شروع ہوتا ہے یا زندگی کے دریا کے سرسبز کناروں پر خوشیوں بھری پک نک کا آغاز اور یا عبور

ـــــ عبور دریائے شور۔

حرفے کی رات کو ہمارے محلے میں منہاری، پنساری، سبزی والے، گوشت والے اور درزی کی دکانیں نصف شب کے بعد تک کھلی رہتیں۔ امرتسر کے کشمیری گھرانوں میں خاص طور پر یہ دستور تھا کہ حرفے کی رات کو شب دیگ اور ساگ مچھلی ضرور پکتی۔ شب دیگ کے لیے لال لال شلجم دوپہر ہی کو گھر میں آ جاتے۔ گوشت خاص طور پر گھر کا کوئی بڑا بوڑھا جا کر لاتا۔ عشاء کی نماز کے بعد شب دیگ کو لکڑیاں جلا کر چولہے پر چڑھا دیا جاتا۔ دوسرے چولہوں پر ساگ مچھلی اور سفید چاول یعنی بھتہ پکنا شروع ہو جاتا اور گھر میں گرم مسالوں کی تیز خوشبوئیں پھیل جاتیں۔ رت جگے کے لیے قہوہ تیار ہو جاتا اور ان مسالوں میں دار چینی اور بادیان خطائی کی خوشبوئیں بھی شامل ہو جاتیں۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی جھٹ بازار سے منگوائی جاتی۔ مجھے یاد ہے میں دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ آدھی آدھی رات باورچی خانے میں بیٹھا رہتا اور آپو جی اور بڑی بہنوں کو مختلف ہانڈیوں اور پتیلیوں میں کفگیر چلاتے دیکھتا رہتا۔ دل میں اس خیال سے پھول کھل رہے ہوتے کہ بس ابھی کوئی دم میں عید کی صبح طلوع ہو جائے گی اور ہم نئے نئے کپڑے پہن کر گلی میں دوستوں کے ساتھ نکل جائیں گے۔ غبارے خریدیں گے۔ دہی بھلے کھائیں گے۔ سویاں اڑائیں گے۔ خواہ مخواہ رشتے داروں کے ہاں جا دھمکیں گے اور عیدیاں وصول کرتے پھریں گے۔ ویسے اُن دنوں رشتے دار بھی آپس میں بڑا پیار کیا کرتے تھے۔ اب تو سوائے اپنے بچوں کے دوسروں کے بچوں سے کوئی پیار ہی نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دور ہی محبت کا تھا، برکت کا تھا۔ اب ہر شے سے محبت اُڑ گئی ہے۔ برکت جاتی رہی ہے۔ ہم خوب بنے ٹھنے خالاؤں، پھوپھیوں کے ہاں جاتے۔ ہماری بڑی آؤ بھگت ہوتی۔ منہ سر چومے جاتے۔ زبردستی سویاں کھلائی جاتیں اور پھر عیدی دی جاتی۔ اُس روز ہم بڑے شاہ خرچ ہوتے۔ ہر دکان پر جا کر کچھ نہ کچھ ضرور کھاتے۔ اب تو عید کے دن میں وہ رونق نہیں رہی۔ حرفے کی رات تو بالکل ہی ختم ہو گئی۔

اُس رات ہر دکان پر گیس یا بڑے بڑے بلب جل رہے ہوتے۔ لوگ خرید و فروخت کرتے

ہوتے۔ گھروں میں مشینوں سے سویاں نکل رہی ہوتیں۔ سردی کے باعث درزیوں کی دکانوں کے کواڑ نیم وا ہوتے۔ اندر روشنی میں ماسٹر صاحب اپنے کاریگروں کے ساتھ بیٹھے عید کے کپڑے تیار کر رہے ہوتے۔ ہماری گلی کے ماسٹر شفیع بڑے وضع دار ٹیلر ماسٹر تھے۔ کیا مجال جو کبھی وعدے پر کسی کو قمیص یا شلوار دے دیں۔ ایک بار میں اُن کی دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور بولے۔

"لائیے ماسٹر صاحب قمیص۔"

ماسٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے حقّے کا کش لگایا اور کہنے لگے

"بس ذرا بٹن لگنے والے رہ گئے ہیں۔ آپ ایسا کریں گول ہٹی سے جاکر بٹن لے آئیں۔"

وہ صاحب بولے۔

"مگر ماسٹر صاحب میں تو میلے پر جا رہا ہوں۔ آپ نے تو صبح کا وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے خواجہ صاحب! آپ بٹن لائیں اور قمیص لے جائیں۔"

وہ صاحب سر جھکا کر بٹن لینے چل دیئے۔ اُن کے جاتے ہی ماسٹر صاحب نے حقّے کی نے پرے کی اور کاریگر کو چیخ کر کہا۔

"ادھے لیا اوئے خواجہ کی قمیص۔"

معلوم ہوا کہ قمیص صرف کٹی ہوئی ہے، سلائی ابھی نہیں ہوئی۔ لیکن آفرین ہے ماسٹر شفیع پر کہ جب تک خواجہ صاحب گول ہٹی سے بٹن لے کر آئے، قمیص سل کر تیار ہو چکی تھی۔

عنایت حلوائی عید پر مٹھائی بنانے کے لیے دُکان کے آگے سڑک کے کنارے نئی بھٹی بناتا۔ عرفے کی ساری رات بھٹی کو لیپنے پوتنے اور دکان کے اوپر شامیانے تاننے میں گزر جاتی۔ شامیانہ ہمارے محلے میں قریباً ہر تیسرا دکاندار ضرور اپنی دُکان کے اوپر تان دیتا۔ اس کی وجہ سے محلّے میں چھاؤں سی ہو جاتی جس کے نیچے سے گزرتے وقت ہمیں بڑی خوشی ہوتی۔ دوست محمد کی دکان میں گردن کٹے بکرے اور دنبے اُلٹے لٹکے ہوتے اور گھروں میں دھڑا دھڑ گوشت جا رہا ہوتا۔ چراغ سبزی والے کو سر کھجانے کی فرصت نہ ہوتی میر حسن پنساری والا کبھی کوئی پیکٹ کھولتا، کبھی الماری کھولتا، کبھی کسی گاہک کی فرمائش پر دیوار کے ساتھ چھت تک بنے گئے خانوں پر سیڑھی لگا کر چڑھتا جاتا اور کبھی کسی بچی کو گز سے ربن ناپ کر دیتا۔ اسد جو نے شاد سنار کی دکان کے تختے پر اپنا سامان جم

کر رکھا ہوتا۔ قدیم روسی جہاز رانوں ایسی بڑی بڑی مونچھوں کے اندر اُس کے دانت چمک رہے ہوتے اور وہ سموری کوٹ میں لپٹا لپٹایا چائے کی چسکیاں لے رہا ہوتا۔ بوڑھا چوکیدار بجلی کے کھمبے کے نیچے اپنے بنچ پر براؤن کمبل اوڑھے بیٹھا پنڈلیوں پر گرم خاکی پٹیاں لپیٹ رہا ہوتا۔

اب عرفے کی رات آدھی کے قریب گزر گئی ہے۔

بچے عید کی مسرتوں کے خواب آنکھوں میں سمائے بچھونوں میں دبک گئے ہیں۔ ایک بجے کے بعد محلے کی دکانیں بند ہو گئی ہیں صرف ماسٹر شفیع کی دکان کے بند کواڑوں کے پیچھے سے سنگر مشین چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ کسی وقت ماسٹر صاحب اقبال کا کوئی شعر گنگنانے لگتے ہیں۔ وہ عام طور پر کپڑے پر بخیہ مارتے ہوئے یہ شعر گایا کرتا ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

مستری عبداللہ حقے کا کش لے کر اُسے ضرور ٹوکا کرتا۔

"ماسٹر! گھوڑے تو ہم نے ضرور دوڑائے تھے پر اب ہم مسلمان کیا کر رہے ہیں؟"

ادھیڑ عمر کا خشخشی ڈاڑھی والا مستری عبداللہ معمار تھا۔ لیکن وہ ہر فن میں ٹانگ اڑا دیا کرتا۔ سنکھیے کا کشتہ بنانے کی بات ہو رہی ہو تو مستری عبداللہ ضرور بیچ میں بول پڑتا۔

"جب تک اُپلوں کی آگ میں دھرن بوٹی کا بُرادہ نہ چھڑکا جائے سنکھیا کبھی نہیں مرتا۔"

ایک بار ماسٹر شفیع نے کہا۔

"سنا ہے جرمن کی فوجیں لندن کے آس پاس پہنچ گئی ہیں۔"

مستری عبداللہ جھٹ بولا۔

"جرمنی والوں نے ایک ایسا لوہے کا چھلا ایجاد کر لیا ہے جسے وہ جرمنی میں مکانوں کے اوپر پھیلا دیتے ہیں۔ اُوپر سے جو بم آتا ہے وہ چھلّے میں ہی گر کر رہ جاتا ہے اور پھٹتا نہیں۔"

مستری عبداللہ ہمیشہ گائے کا دودھ پیتا۔ دکان پر اگر وہ ایک پیسے کا دودھ بھی لیتا تو دودھ کے برابر پانی ڈلواتا اور ایک ہی گھونٹ میں چڑھا جاتا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔

"گوگے دودھ میں ماں کے دودھ کی تاثیر ہوتی ہے۔"

ایک بار وہ دلّی گیا۔ واپس آیا تو دلّی کے علاوہ بمبئی کے فرضی سفر کی داستان بھی سنا ڈالی۔ معمار وہ بڑا زیرک اور پائے کا تھا۔ یونہی چلتے چلتے کسی مکان کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ دو قدم اِدھر، دو قدم اُدھر جا کر، گردن ٹیڑھی کر کے اس مکان کو اوپر سے نیچے دیکھتا اور پھر اپنے ساتھی سے اتنا کہہ کر آگے چل پڑتا۔

"مکان کی کرسی ٹیڑھی رہ گئی ہے۔"

نرفے کی رات ڈھل رہی ہے اور عید کی صبح طلوع ہونے والی ہے۔

امرتسر میں عید کی صبح کو اذان کے وقت لوگ قبرستان میں اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کو جایا کرتے تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد کی قبریں بھی امرتسر کے گھی منڈی والے قبرستان میں تھیں۔ میں اپنے اباجی کے ساتھ منہ اندھیرے قبروں پر جاتا۔ امرتسر کا یہ قبرستان ہمارے محلے سے دو ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ دروازہ مہاں سنگھ سے باہر نکلو تو داہنے ہاتھ کو باغ کے ساتھ ساتھ پکی سڑک کمپنی باغ کو جاتی تھی۔ بائیں ہاتھ کو دھوبی گھاٹ اور برج جھولا سنگھ آجاتا۔ یہاں سے ایک کچا راستہ قبرستان کو جاتا تھا۔ یہ قبرستان لاہور کے قبرستانوں کی طرح ویران اور خاک آلود نہیں تھا۔ یہاں امرود، لوکاٹ اور آلوچے کے باغ تھے، بلکہ قبرستان ان سرسبز باغوں کے بیچ میں آگیا تھا۔ ان باغوں میں ٹھنڈے اور شفاف پانی کے نالے بہتے تھے جن کے کناروں کی ہری گھاس میں نیلے پھول کھلے رہتے۔ بڑی نہر سے نکل کر دربار صاحب کو جانے والی ہنسلی اسی قبرستان سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہاں گیندے کے کیسری پھولوں کے کھیت بھی تھے۔ ری دسمبر کی نیم گرم چمکیلی دھوپ میں ان پھولوں پر تتلیاں منڈلایا کرتیں اور سنہری فضا میں گیندے کے پھولوں کا کیسری رنگ اُڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ اسی قبرستان میں حسین شاہ صاحب کا دربارِ غوثیہ بھی تھا جس کے سبز گنبد کے عقب میں چھوٹا سا چڑیا گھر تھا اور داہنے ہاتھ کو پیچھے گلاب کی کھیتی تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں کو اس کھیتی کی طرف سے گلاب کی گرم خوشبو آیا کرتی۔

قبرستان کے باہر پھیلے سے بڑی بڑی چنگیروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے ڈھیر لگائے بیٹھے ہوتے۔ صبح کی ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی میں ان ٹھنڈے پھولوں پر شبنم کے موتی

چمک رہے ہوتے۔ اباجی پھول خرید کر رومال میں باندھ لیتے۔ میں یہ رومال اُن سے لے لیتا اور قبروں پر جاتے جاتے ان پھولوں کی ٹھنڈی گہری خوشبو کئی بار سونگھتا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر سے قرآن مجید کی تلاوت کی آوازیں آنی شروع ہو جاتیں۔ قبروں پر جگہ جگہ موم بتیاں اور کڑوے تیل کے دیئے ٹمٹما رہے ہوتے۔ فضا میں اگربتیوں اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوتی۔ کہیں کہیں دیوں اور موم بتیوں کی روشنی میں قرآن پڑھتی عورتوں اور مردوں کی شکلیں نظر آجاتیں۔ پچھلے پہر کے آسمان پر سردیوں کے ٹھٹھرتے ستارے چمک چمک کر ماند پڑ رہے ہوتے۔ رومال بندھے ہونے گلاب کے پھول ٹھنڈے ہو جاتے۔ امرودوں کے جھنڈوں کے عقب میں ہمارے اجداد کی قبریں تھیں۔ ہم ان پر چاول بکھیرتے قبروں کے سرہانے پڑے مٹی کے پیالوں میں تازہ پانی بھرتے، اگربتیاں سلگاتے اباجی قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہتے اور میں درختوں پر سے اوس گرتی دیکھتا رہتا۔ مشرق کی طرف آسمان پر نیلی روشنی کا غبار سا بلند ہونا شروع ہو جاتا اور میرا دل اس خیال سے لبریز ہو جاتا کہ ابھی گھر جا کر نئے کپڑے پہنوں گا، عیدی ملے گی اور دوستوں کے ساتھ خوب مزے اڑائیں گے۔

جب ہم واپس ہوتے تو دن نکل آیا ہوتا۔ عید کا دن۔ عید کی صبح —— حسین اور خوبصورت صبح —— محلے میں داخل ہوتے ہی ننھی ننھی بچیاں گوٹے کناری والے کپڑے پہنے سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی دکھائی دیتیں۔ گامار و گر کمپنی باغ کی طرف آتا نظر آتا۔ اُس نے سرخ رنگ کی شال اوڑھ رکھی ہوتی اور ہاتھ میں گلاب کے دو ایک پھول ہوتے۔ گلی میں آتے تو جان اپنی چھوٹی سی دکان سجا رہا ہوتا۔ اُس نے مکان کے باہر تخت بچھا کر اوپر سفید چادر ڈالی ہوتی۔ سدعنی پیالوں کے بیچ میں گلدان میں پھول مسکرا رہے ہوتے۔ دیوار کے ساتھ کھلونوں کی قطار لگی ہوتی۔ وہ نہا دھو، نئے کپڑے پہن گدی پر بیٹھا ایک ایک پیسے دو دو پیسے میں مٹی کے کھلونے بیچ رہا ہوتا۔

مسجد کے سامنے گاما گنگنیاں والا بیٹھا تھا۔ تانبے کے نیچے والا حقہ قریب ہے۔ بانٹی میں مٹی کی پیالیاں رکھی ہیں۔ اونچا لمبا، ادھیڑ عمر، دبلا پتلا گاما گنگنیاں والا ہر روز صبح کو چارپائی سی سجا کر حقہ ہاتھ میں لیے گھر سے نکلتا اور اتنا کہہ کر گلی گلی سودا بیچنے چل پڑتا۔

"چل اوئے گامیا بل وگی ڈبے جتھے لگن اوں۔"

اُس کا لباس ہمیشہ یہ ہوتا۔ سر پر بغیر کلاہ کے پگڑی، لمبی قمیص، دھوتی۔ پاؤں میں تبریں

اور تسمے والے بادامی بوٹ۔ ہم بڑے شوق سے اس کی چھابڑی کے آگے بیٹھ جاتے۔ وہ مٹی کی پیالی میں اُبلی ہوئی گھنگنیاں ڈالتا۔ اس میں بارہ مسالے ملاتا۔ کھٹا ڈالتا اور پھر ٹین کی پتلی سی چمچ رکھ کر پیالی تھما دیتا۔ گرمیوں سردیوں صبح کے وقت ہر روز گلی میں اس کی یہ صدا گونجا کرتی۔

"گھنگنیاں وی کھاؤ جی گھنگنیاں بھی کھاؤ"

گامے کا ایک بھائی فیروز اپنے گھر پر قالینوں کا رفو کیا کرتا۔ کام کا مندا پڑا تو اس نے اپنے مکان میں ایک کھڈی لگائی اور کھیس بُن کر بیچنے لگا۔ وہ کام بھی نہ چل سکا تو فیروز نے نعت خوانی شروع کر دی۔ اب ہر عید میلاد اور جمعے کو گلی والی مسجد میں اس کی کانپتی ہوئی آواز لرزا کرتی۔

عید کی صبح کو گامے کی سج دھج نرالی ہوتی۔ لال صافہ باندھ رکھا ہے۔ حقّے کی نے پر گیندے کا ہار پڑا ہے۔ چھابڑی میں جگہ جگہ گلاب اور گیندے کے پھول سج رہے ہیں۔ بچوں کو سودا دے رہا ہے۔ سر کھجانے فرصت نہیں۔ برکت پنساری نے دکان کے تختے بچھا کر عیدی سجا رکھی ہے۔ کھٹی میٹھی گولیاں ہیں۔ بادام کی گولیاں ہیں۔ دل بہار ہیں۔ کانچ کے ڈبے ہیں جن کے اندر سرخ پانی بھرا ہے اور شیشے کی ننھی سی مچھلی تیر رہی ہے۔ لاٹری کی پڑیاں ہیں۔ ایک پیسے کی چاہے جو کسی پڑیا لے لو۔ اگر خوش قسمت ہیں تو ایک آنے کی چیز نکل آئے گی۔ نہیں تو دھیلے والی میٹھی یا امچور کی پڑیا۔ کوکونٹ کے بسکٹ ہیں اور انڈے کی خطائیاں ہیں۔

گو سینڈو نے اپنے مکان کے آگے تختے پر ڈانس لگا رکھا ہے۔ ایک آنہ دے کر سنہری انگلی سے گھماؤ۔ سوئی کسی نمبر پر رُکے تو اتنے پیسوں کا کوئی کھلونا۔ کوئی فاؤنٹین پن۔ کوئی نقلی گھڑی یا زنجیر والی سیٹی لے لو۔ اگر صفر نمبر پر رُکے تو سمجھیں ختم آنہ ہضم۔ گو سینڈو نے [illegible] مشین میں سے کوئی پرزہ نکال رکھا تھا۔ سوئی ہمیشہ صفر پر ہی رکتی۔ حاجی احمد شاہ سامنے مسجد کے زینے پر بیٹھا سویاں کھاتے ہوئے سینڈو کو سرزنش کر رہا ہے۔

"گو! یہ جوا ہے۔ اس سے باز آجا۔"

اس کے جواب میں گو سینڈو صرف ہنس دیتا ہے۔ کیا مجال جو حاجی صاحب کے سامنے گستاخی سے پیش آئے۔ دراصل وہ زمانہ ہی بڑے ادب آداب کا تھا۔ گولیاں کھیلتے بچے بڑوں کو دیکھ کر ادھر اُدھر ہو جاتے۔ اب تو سینہ تان کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ بزرگوں کو بھی گولیاں کھیلنے کی دعوت دیتے

ہیں۔

عید کی نماز پڑھنے میں گھر والوں کے ساتھ رام باغ والی عید گاہ میں جاتا۔ عید گاہ کی مسجد کا صحن جلد ہی بھر جاتا۔ لوگ مسجد کی چار دیواری کے باہر والی گراؤنڈ میں اپنی اپنی دریاں اور قالین کے ٹکڑے بچھا کر نماز پڑھتے۔ املتاس کے درختوں کے نیچے چبوتروں پر ادھر اُدھر مکبر کھڑے ہو جاتے۔ لاؤڈ سپیکر کا ان دنوں رواج نہیں تھا۔ مسجد کے اندر سے اللہ اکبر کی آواز آتی تو چبوتروں پر کھڑے مکبر یکے بعد دیگرے اس آواز کو دہراتے چلے جاتے۔ نماز کے بعد عید گاہ سے باہر نکلتے تو گرزمار، نقلی کنگلے، فقیر اور فقیرنیاں چمٹ جاتیں۔ خیراتی اداروں کے کارکن چندہ مانگ رہے ہوتے۔ غبارے اور بھنبیریاں بک رہی ہوتیں۔ ہر طرف سجے سجائے خوش و خرم چہکتے بچے بچیاں اپنے بزرگوں کی انگلیاں تھامے، ہنستے مسکراتے، باجے بجاتے، غبارے اچھالتے نظر آتیں۔ عید گاہ سے واپسی پر گلی محلوں میں عید کی رونقیں اپنا رنگین آنچل پھیلا دیتیں۔ میں نئے چرچر کرتے جوتے نئی قمیص، نئے کوٹ اور نئی جرابیں پہنے کوٹ کی جیب میں ریشمی رومال سجائے اپنے دوستوں کے ساتھ گلی گلی سیر کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ جس محلے میں جاؤ عید کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ گھروں میں عورتیں پہلے بچوں کو تیار کرتیں اور سب سے آخر میں خود تیار ہوتیں۔ گھر میں ہر آنے جانے والوں کو سویاں، شب دیگ، پلاؤ اور ساگ مچھلی سے تواضع ہوتی۔ ریچھ اور بندر کا تماشا دکھانے والوں نے محلے محلے سجا رکھی ہوتی۔ ڈگ ڈگی بج رہی ہے بندر ناچ رہا ہے۔ بچے تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ بڑے بوڑھے بھی بندر کی مضحکہ خیز حرکتوں پر ہنس رہے ہیں۔

عید کے روز سینما گھروں کو بھی رنگ برنگ جھنڈیوں سے خوب سجایا جاتا۔ ہر سینما گھر میں عید کی خوشی میں چار شو ہوتے۔ پہلا شو صبح دس بجے شروع ہو جاتا۔ امرت ٹاکیز، ریالٹو، رتن ٹاکیز، نشاط سینما اور پرل ٹاکیز میں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ سینما گھروں کے باہر تنبو قناتیں لگی ہوتیں اور مٹھائی، پان سگرٹ کی دکانیں بھی ہوتیں۔ دوپہر کو ہم کمپنی باغ میں سیر کو نکل جاتے۔ گھاس کے تختوں میں پھول کھلے ہوتے۔ حوض میں سرخ مچھلیاں تیر رہی ہوتیں۔ سیر کرنے والی ٹولیاں باجے بجاتیں، ہنسی مذاق کرتیں روشوں پر گھوم رہی ہوتیں۔ پردہ کلب کے باغ میں لڑکیاں جھولے جھول رہی ہوتیں۔ باغ میں ان کے مسرور قہقہے گونج رہے ہوتے۔ وہ پینگ اوپر چڑھاتیں تو جھاڑیوں کی دیوار کے اوپر ان کے ریشمی اڑتے آنچلوں کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی۔

گول باغ میں سرکس اور کھیل تماشے دکھانے والوں نے ڈیرے جما رکھے ہوتے۔ پردے کی چار دیواری کے اندر سٹیج پر عورتیں سُرخی پوڈر تھوپے ناچ رہی ہوتیں۔ زمین کھود کر دریاں بچھادی گئی ہیں۔ اُن کے پیچھے بنچ رکھے ہیں۔ باہر بانس کی مچان پر مسخرہ چارلی چپلن ایسا حلیہ بنائے اچھل کود رہا ہے اور لوگوں کو تھیٹر دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ ایک پل کے لیے سامنے کا پردہ اٹھا دیا جاتا۔ سامنے سٹیج پر لمبے لمبے بالوں والی عورتیں ناچتی نظر آتیں۔ لوگوں کا اشتیاق دیکھ کر فوراً پردہ گرا دیا جاتا۔ سرکس تمبوؤں کے اندر سے شیر کے گرجنے کی آواز آرہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی آدمی گھڑے میں منہ ڈال کر شیر کی بولی بول رہا ہے بھونپو والے گراموفون چیخ رہے ہیں۔

ہال بازار میں سکھوں نے بھی پھولوں کی دُکانوں کو عید کے لیے سجا رکھا ہے۔ فانو دے والا سکھ دھلے دھلائے کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ کٹورے چمک رہے ہیں۔ پیتل کی طشتریوں میں رتن جو کے پھول پڑے ہیں۔ امرتسر میں رتن جو کا پھول عام طور پر مندروں اور گردواروں میں چڑھایا جاتا تھا۔ مسلمان گلاب اور گیندے کو پسند کرتے تھے۔ صبح صبح ہندو والے دُکان کھولتے تو اندر پتوں میں لپٹا ہوا رتن جو کا پتلا سا ہار پھول والا پھینک گیا ہوتا۔ وہ سب سے پہلے رتن جو کا ہار دُکان میں لگی کرشن جی کی تصویر کو پہناتے اور پھر کاروبار کو شروع کرتے۔ مسلمانوں کے ہاں تہواروں، عید میلاد کی محفلوں اور بیاہ شادیوں پر گیندے اور گلاب کے پھول استعمال کرنے کا رواج تھا۔

جوں جوں عید کا دن گزرتا جاتا، میں اداس ہونا شروع ہو جاتا۔ کاش! عید کا دن کبھی نہ گزرے! تیسرے پہر جب سائے لمبے ہو جاتے تو اس خیال سے دل کو حوصلہ ہوتا کہ چلو کل ٹرو کا میلہ دیکھیں گے۔ ٹرو کا میلہ امرتسر میں عید کا لازمی جزو تھا۔ ٹرو کے میلے کے بغیر آپ امرتسر کی عید کا تصور نہیں کر سکتے۔ امرتسر کی عید گزر جاتی، مگر اس کی خوشبو ٹرو کے میلے میں موجود رہتی۔ عید کی رات کو ہم ٹرو کے میلے کے خواب آنکھوں میں لے کر سو جاتے اور ٹرو کی صبح میلے کی خوشیاں اپنے دامن میں لے کر طلوع ہوتی۔

یہ میلہ امرتسر کے سکتری باغ میں لگا کرتا۔ یہاں اونچے لمبے درخت ہوا میں جھوما کرتے۔ ایک جگہ نیم دائرے کی شکل میں لکڑی کی جالیوں سے جافری سی بنی تھی۔ اس جافری کو عشق پیچاں کی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اندر دو چار میزیں رکھی تھیں۔ یہ سکتری باغ کی لائبریری تھی۔

باغ کے لاؤڈ سپیکر پر شام کو ریکارڈنگ ہوا کرتی۔ "مکتی" فلم اُن دنوں امرتسر میں بڑا رش لے رہی تھی۔ میں اور میرا دوست شانتی سروپ اس باغ میں بیٹھ کر کانن بالا کا یہ گیت بڑے وجد کے عالم میں سنا کرتے۔

سپنوں میں کوئی آتا ہے
کچھ چپکے سے کہہ جاتا ہے

شانتی سروپ منہ سے ستار بجانے میں بڑا ماہر تھا۔ وہ شعر و ادب اور موسیقی کا دل دادہ تھا۔ اور میرا بڑا پکا یار تھا۔ فسادات کے دنوں میں وہ ایک روز اچانک ہماری گلی میں آنکلا۔ ہر طرف قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"شانتی! تم کیوں آ گئے ادھر؟"

"تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔"

حالات کی سنگینی کا شانتی سروپ کو بھی احساس نہ تھا۔ میں اُسے بڑی مشکل سے اپنے محلے سے نکال کر باہر کوتوالی کی طرف لے گیا اور ملکہ کے بُت کے پاس پہنچ کر کہا۔

"شانتی یار! تم نے تو کمال کر دیا۔ خدا کے لیے ابھی ادھر نہ آیا کرو۔"

شانتی اپنے مخصوص انداز میں سر کو جھٹک کر ہنس دیا۔

"یار حمید! کیا اب ہم اپنے دوستوں سے بھی نہیں مل سکتے؟"

اس کے بعد شانتی سروپ سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے وہاں سے باغ رامانند کی طرف نکل گیا۔ پھر اُس سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ سکتری باغ کے ساتھ ہی ایک گراؤنڈ تھی۔ اس گراؤنڈ میں ٹرو کا میلہ لگتا تھا۔ ایک روز پہلے ہی دکانیں لگا دی جاتیں۔ قناتیں تن جاتیں۔ میلے کے روز یہاں بڑا ہجوم ہوتا۔ باغ کی بڑی روش پر دونوں طرف کھلونوں بیچنے والوں کی قطاریں لگی ہوتیں۔ فضا میں رنگ برنگے غبارے لہرا رہے ہوتے۔ لکڑی کے رنگدار پنگوڑوں کی چیں چیں گونج رہی ہوتی۔ قتلے تلے جا رہے ہوتے لوگ قتلے خرید کر گھاس پر دری بچھا کر وہیں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ جاتے اور کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے۔ مٹھائی کی عارضی دکانوں پر لوگوں کا رش ہوتا۔ ایک طرف چند منچلے نوجوان پینگ بڑھا رہے ہیں، دوسری طرف ایک ٹولی تنگاریوں پر گیت گوتی

گذرتا ہے۔ شہر سے میلہ دیکھنے والوں سے لدے ہوئے تانگے آآ کر باغ کے باہر رُکتے اور میلے کی رونق میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔

سورج ڈھلنے کے ساتھ ساتھ میلے کی رونقیں ماند پڑنے لگتیں ہم بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر ٹکناریاں بجاتے مٹی کے کبوتر، کوتے اور طوطے اور ہلتے سر والا سفید ریش مٹی کا باوا تھامے گھر کو چل پڑتے۔ واپسی پر میلے سے قتلمہ اور حلوہ ضرور لاتے۔ میلے میں بڑا خاص قتلمہ بنتا تھا۔ اس لیے کہ یہاں حلوائی دیہاتوں سے نہیں آتے تھے، بلکہ شہر کے نامور اور مشہور حلوائی اپنے کاریگروں سے میلے میں دکانیں کھلوا لیتے تھے۔ گلی میں آتے تو وہاں میلے سے واپس آنے والے بچے ایک دوسرے کو اپنے اپنے کھلونے شوق سے دکھا رہے ہوتے۔ جگہ جگہ ٹکناریاں بج رہی ہوتیں۔ عنایت حلوائی کی دکان پر تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ لوگ قتلمے اور مٹھائیوں سے ٹوکریاں بھر بھر کر اپنے گھروں اور رشتے داروں کے گھروں کو لے جا رہے ہیں۔ جسے دیکھو چہرے پر خوشی کی چمک ہے۔ ہونٹ حلوے کے گھی سے تر ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہے۔ بالوں میں تیل چمک رہا ہے۔ لڑکیوں کی مانگ میں مقیش بھری ہے جو بجلی اور گیس کی روشنی میں دمک رہی ہے۔ حنا کے عطر کی گرم خوشبو ہر سمت اڑ رہی ہے۔ ہاتھوں میں گیندے کے کیسری پھولوں کے گجرے ہیں۔ ہتھیلیوں میں مہندی لگی ہے مہندی میں امرتسر کے باغوں کی مہک ہے۔ گیندے، گلاب اور مولسری کی مہک ہے اور عید کا سورج، میلے کا سورج غروب ہو رہا ہے۔ اندھیرے کی چادر پھیل رہی ہے ہجر کی دیوار کھڑی ہو رہی ہے۔ ہجرت کا سفر شروع ہو رہا ہے، قطرہ سمندر سے، کرن سورج سے خوشبو پھول سے اور گوشت ناخن سے جدا ہو رہا ہے۔

اتنے برسوں بعد آج امرتسر کی عید کو یاد کرتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی عمر رسیدہ بیوہ اپنے جہیز کا پُرانا صندوق کھولے اپنے سہاگ کا خستہ حال عروسی جوڑا دیکھ رہی ہو۔ کہاں چلے گئے؟ کہاں چلے گئے وہ حنا کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے ریشمی رومال، ریشم کی ڈوری میں پروئے ہوئے سچے موتی اور پھولوں بھری پنکھی پر سوئے ہوئے چھلکے، دمکتے، روشن اور پُر مسرت دن۔ میرے امرتسر! میرے یروشلم! میرے قرطبہ! تیرے معبدوں کی رونقیں ویران ہو گئیں۔ تیری سُرخ فصیلوں کے بُرج کھنڈر بن گئے تیرے الحمراؤں کے شہ نشین خون سے بھر گئے اور تیرے جالی دار مرمریں جھروکوں کے سینے چھلنی ہو گئے

اُمرتسر کی ایک درگاہ

دروازہ مہان سنگھ سے باہر نکلیں تو سیدھی سڑک آرٹ سکول کے پہلو سے گزرتی دائیں جانب بُدّھی شاہ کے تکیے کو اور بائیں طرف ہاکی گراؤنڈ کو پیچھے چھوڑتی سامنے تحصیل پورے کی طرف نکل جاتی ہے۔ تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتے ہی دو طرفہ لوکاٹ کے گہری سبز چھاؤں والے باغوں کے بیچوں بیچ ایک تنگ سا کچا راستہ جالندھر بٹالہ ریلوے لائن کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کچے راستے پر کھٹے کے پودوں نے چھت بنا رکھی تھی۔ مارچ اپریل کے دنوں میں جب کھٹے کے جھاڑوں میں سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ مہک جاتا۔ میں صبح کی سیر کو جاتے یہاں سے لمبے لمبے سانس لیتا۔ آہستہ آہستہ گزرا کرتا تھا۔ اور سفید پھولوں کو ـــــ لیکن یہ میں کہاں نکل آیا؟ کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو مجھے ایک پل میں کہاں سے کہاں لے کر نکل گئی۔ میں واپس دروازہ مہان سنگھ میں آتا ہوں۔

دروازہ مہان سنگھ ہمارے محلے کا دروازہ تھا۔ اُن دنوں مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ بھید ہندو مسلم فسادات کے بعد کھُلا۔ اس دروازے سے باہر نکل کر آپ دائیں طرف سڑک گھوم جائیے۔ ایک طرف شیشم کے سایہ دار درختوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے اور دوسری طرف گلاب، ڈیلیا اور چنبیلی کے پھولوں سے مہکتا باغ سڑک کے ساتھ ساتھ دروازہ گھی منڈی تک چلا گیا ہے۔ اس باغ میں یوکلپٹس کے نوعمر چھریرے درخت ہوا کرتے تھے۔ جن کی لمبوتری پتیوں والی ٹہنیاں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوا میں جھوما کرتی تھیں۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی خون آلود، دھواں دھواں، دہشت زدہ دوپہر کو جب ہم قتلِ عام میں دروازہ مہان سنگھ سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کی طرف بھاگے تو دور سے ریلوے لائن کے بادلوں میں آگ کی سُرخ زبانیں لپک رہی تھیں اور اس باغ کے نوعمر یوکلپٹس کے

درختوں کی لمبی نازک ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ساکت و جامد تھیں۔ جیسے وہ پتھر ہو گئی ہوں۔

قیام پاکستان کے پانچ سال بعد جب میں امرتسر گیا تو ان درختوں نے مجھے دور سے آتا دیکھ کر اپنی شاخیں ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ مجھے اپنی بے زبانی میں خاموش آوازیں دیں۔ اپنی سوندھی خوشبو کی آواز میں میرا نام لے لے کر پکارا۔ اور جب میں اُن کے پاس گیا تو وہ چپ ہو گئے۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ درخت کی ایک ٹہنی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ ہم دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ یہ محبت کی تال تھی۔ ہمہ گیر، ہمہ اوست، ہمراز اوست، ہمہ تن ساز، ہمہ تن گوش کبھی نہ بھلائی جانیوالی، کبھی نہ یاد آنے والی محبت کی تال ـــــ کبھی نہ چڑھنے والی کبھی نہ اترنے والی شراب کا نشہ۔ کبھی نہ طلوع ہونے والے، کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کی روشنی! میں اور درخت کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے۔ اُس نے کہا۔

۔ تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے؟

میں نے کہا۔

۔ سبھی چلے گئے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں! امرتسر تو مسلمانوں کے لئے جہنم بنا دیا گیا تھا اور مسلمان جہنم میں نہیں رہا کرتا۔ لاہور کے چیرنگ کراس اور سمن آباد میں کچھ یوکلپٹس کے درخت ہیں۔ میں اُن سے تمہارا حال پوچھ لیا کرتا ہوں۔ ویسے بھی صبحدم جب سمن آباد کی مسجدیں اذان کی صداؤں سے گونجتی ہیں اور میں نیم روشن صحن میں ٹمٹماتے تاروں بھرے آسمان تلے اگر گہرے سانس لیتا ہوں تو مجھے تمہاری خوشبو آیا کرتی ہے۔ تمہارے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دیا کرتی ہیں یہ

یوکلپٹس کی ٹہنیاں خوشی سے لہرانے لگیں اور ......

معاف کیجئے گا۔ میں پھر اپنے موضوع سے ہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ ہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ سلسلہ تو موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہاں ــ تو میں کہہ رہا تھا کہ جہاں یہ باغ ختم ہوتا ہے وہاں اکالی سکھوں یعنی نہنگوں کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے برج پھولا سنگھ کہتے ہیں۔ سکندر حیات کی وزارت میں سکھوں

نے اپنے گوردوارے کے پاس اس کی تعمیر شروع کی تو امرتسر کے مسلمانوں نے حکومت پنجاب سے شدید احتجاج کیا۔ جلسے ہوئے۔ سر سکندر کے پاس مسلمانوں کے وفد گئے۔ لیکن کچھ نہ بنا اور قلعے کی تعمیر شروع رہی۔ قلعہ بن گیا۔ اس قلعے میں سکھوں نے اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ ۴ اپریل سنہ ۱۹۴۷ء کو سکھوں نے اسی قلعے کے سوراخوں سے گھی منڈی اور جہان سنگھ دروازے کے مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ہمارے محلے کا جوان جید اماں والا انہی سکھوں کی گولی لگنے سے شہید ہوا۔

اس قلعے کے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ سڑک نیچے کو اترتی ہے۔ کونے پر ایک مسجد ہے کنواں اور اکھاڑہ ہے۔ ذرا آگے جا کر بستی آجاتی ہے اور پھر قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ جس درگاہ کے بارے میں، میں لکھنے والا ہوں وہ اسی قبرستان میں واقع تھی۔ ہم سب نے ایسی بہت سی درگاہیں دیکھی ہوں گی جو صدیوں سے آباد ہیں اور جن کی رونقوں اور جگمگاہٹوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن امرتسر کے قبرستان والی یہ پہلی درگاہ تھی جو میری آنکھوں کے سامنے عالم وجود میں آئی۔ برقی قمقموں سے بقعہ نور بنی۔ اس کی فضائیں بیدم وارثی کے عارفانہ کلام سے گونجیں، وہاں دودھ کی نہریں بہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ اُجڑ گئی۔ لوگ اس کے برقی قمقمے اور ٹونٹیاں اتار کر لے گئے اور دودھ کی نہروں میں مکڑیوں نے جالے بن لئے۔ یہ درگاہ امرتسر کی ہماری کشمیری برادری کے ایک قریبی عزیز خواجہ صاحب نے اپنے نانا کی قبر پر بنائی تھی۔ میں اُن دنوں ایم اے او ہائی سکول میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب کے پاس اچانک کہیں سے بہت سی دولت آگئی۔ انہوں نے فوراً قبرستان میں اپنے نانا کی قبر پر (جیسا کہ والدہ مرحومہ اور خالہ جان ہمیں بتایا کرتی تھیں۔) ایک عظیم الشان درگاہ کی بنیاد رکھ دی۔ درگاہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ دور دراز سے کاریگر معماروں کی خدمات حاصل کیں۔ میرے خالہ زاد بھائی رشید لے نے وہاں بجلی کی ساری فٹنگ خود کی۔ میں آج بھی چشم تصور میں اُسے پیچ کس دانتوں میں دبائے سیڑھی پر جھک کر تاروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا دیکھ رہا ہوں۔ درگاہ کے گنبد کے اندر جو روشنیاں لگیں وہ سبز انگوروں کے گچھوں کی شکل میں لٹک رہی تھیں۔ آگرہ دلّی اور لکھنؤ سے نہایت قیمتی اور حسین جھاڑ فانوس منگوا کر اندر لٹکائے گئے۔ گنبد کے اندر تین قبروں کے تعویذ تھے۔ ایک خواجہ صاحب کے نانا کی قبر کا تعویذ تھا۔ دوسرا غالباً اُن کی نانی صاحبہ کی قبر کا تعویذ تھا

اور تعویذ اُن کی اپنی قبر کا تھا جو تعویذ کے نیچے تہہ خانے میں مکمل پڑی تھی۔ انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں وہیں تہہ خانے میں دفن کیا جائے۔ ایک دفعہ میں تہہ خانے میں اُتر گیا۔ چھوٹا سا لحد نما تہہ خانہ تھا۔ چھت اور دیواروں پر سیمنٹ کیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ چمکتی بریکٹوں والے دودھیا غبارہ نما بلب لگے تھے۔ وہاں مرنے کے بعد خواجہ صاحب کی قبر تعمیر ہونی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ امرتسر کا یہ قبرستان بڑا خوبصورت تھا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ لاہور میں مسلمانوں کے ننگے قبرستانوں پر گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ پڑتی ہے اور سردیوں میں کُہرا گرتا ہے۔ جب کہ لاہور ہی میں عیسائیوں کے قبرستانوں میں سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں اور قبروں کے کتبے پھولوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ امرتسر کا ہمارے محلے کے باہر والا قبرستان لاہور کے گورا قبرستان سے بھی زیادہ شاداب اور پُرسکون تھا۔ دراصل یہ قبرستان آم، لوکاٹ اور امرود کے باغوں کے بیچ بیچ اُگ بن گیا تھا۔ یہاں کوئی قبر ایسی نہ تھی جس پر کسی نہ کسی درخت کا سایہ نہ ہو۔ اور پہلو میں گلاب یا گیندے کے پھول نہ کھلے ہوں۔ ہم رات کو بھی قبرستان میں بے دھڑک چلے جاتے۔ ہمیں کبھی کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ ہوتی۔ بلکہ یوں لگتا کہ واقعی ان قبروں کے اندر بڑے ہی نیک لوگ محوِ خواب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بچے ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی چھوٹی سے چھوٹی قبر پر بھی پاؤں نہ رکھا تھا۔ یہاں پھلدار باغوں میں ندی کے مٹیالے ٹھنڈے پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے بہتے تھے۔ برسات میں ان نالوں میں درختوں سے ٹپکے ہوئے آم اور امرود بہا کرتے جنہیں ہم وہیں کسی پُلیا پر بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے۔ برسات میں گھنگھور گھٹائیں برستیں اور ہم یہاں امرود کے درختوں پر چڑھے اِدھر اُدھر پاؤں پھیلائے امرود توڑ توڑ کر نیکر کی جیبیں بھرا کرتے۔

عید کی صبح کو منہ اندھیرے لوگ قبرستان جا کر فاتحہ اور قرآن خوانی کرتے میں بھی اپنے چھوٹے ارنسٹ بھائی کے ساتھ ضرور جاتا۔ ہم لوگ گھی منڈی والے دروازے سے نکل کر کونے والی مسجد کے پاس آتے تو ہمیں تیکھے گلاب کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی۔ سڑک کنارے گلاب کے پھول بیچنے والے بیٹھے ہوتے۔ بڑی بڑی چنگیریں سرخ گلابوں اور ان کی پتیوں سے بھری ہوتیں۔ دو پیسے میں وہ ڈھیر سارے پھول جھولی یا رومال میں ڈال دیتے۔ ہم بھی دو پیسے کے پھول لے کر رومال میں باندھ لیتے اور گرم کشمیری شالوں میں دبکے ٹھٹھرتی سردی میں قبرستان

میں داخل ہو جاتے۔ اُن دنوں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ ہمارے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور بات کرتے وقت منہ سے بھاپ نکلا کرتی۔ اوپر نیلے آسمان پر طلوعِ آفتاب سے پہلے کی روشنی میں ٹمٹماتے تارے زرد ہو رہے ہوتے۔ چھوٹی سی سڑک کی دونوں جانب خانہ بدوش قسم کے فقیر جھولیاں پھیلائے بیٹھے اپنی اپنی بولیوں میں خیرات مانگ رہے ہوتے۔ ان کے پیچھے امرودوں اور اناروں کے باغوں میں گھپ اندھیرا چھایا ہوتا۔ اب اِدھر اُدھر سے دھیمی اثر انگیز آواز میں قرآن شریف کی تلاوت کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر مٹی کے دیئے اور موم بتیاں جلا رہے ہوتے پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ کہیں کہیں اُن کے اُداس چہرے چراغوں کی پھڑپھڑاتی روشنی میں ابھرتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ مئی جون کی تپتی سنسان دوپہروں میں یہاں سے گزرتے ہوئے گلاب کے پھولوں اور کیکر کے پیلے پھولوں کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ ذرا پرے ایک نہر بہتی تھی اُدھر سے جو ہوا آتی اس میں بھنگ کی جھاڑیوں کی مرطوب بُو ہوتی۔

اس قبرستان کا جو حصہ جالندھر کی طرف جاتی جی ٹی روڈ کو لگتا تھا اُدھر یہ درگاہ تھی۔ اس درگاہ پر پہلا عرس ہوا تو امرتسر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر قدِ آدم اشتہار چسپاں ہو گئے۔ ان اشتہاروں پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا۔ "امرتسر میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں" اس کے بعد درگاہ کے بارے میں تفصیل درج تھی اور اس بات کا اعلان تھا کہ عرس شریف تین روز تک جاری رہے گا۔ پہلے روز کی محفل سماع کی صدارت حضرت سیدم وارثی فرمائیں گے۔ دکانداروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ میلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں آ کر اپنی اپنی دکانیں سنبھالیں۔ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتانا پڑے۔ قوالوں میں تایا قوال اینڈ پارٹی کے علاوہ محمد علی فریدی قوال اینڈ پارٹی کا نام بھی درج تھا۔ میرے خالو جان مرحوم یہ اشتہار جھولے میں ڈال کر ہمارے گھر لائے اور سب کو پوسٹر کا پورا پڑھ کر سنایا۔ پھر بولے۔

"میں اس درگاہ کے عرس کے خلاف ہوں۔ یہ سب جھوٹ کا کھیل ہے۔"

خالو جان ساٹھ پینسٹھ برس کے دیو قامت بھاری بھرکم اونچے لمبے بزرگ تھے۔ لمبی داڑھی کھلتا گندمی رنگ۔ لمبا کھدر کا کرتہ کھدر کی دھوتی۔ لال چمڑے کی جوتی ہاتھ میں موٹا عصا۔ بازار بکروانا کی روڑاں والی مسجد کے پیش امام تھے۔ تحریک خلافت میں میری والدہ سمیت اپنے سب

گھر بار والوں کو دے کر کابل چلے گئے جہاں سے انتہائی کس پرسی کے عالم میں واپس امرتسر آئے۔ کابل میں مہاجر مسلمانوں کی خالت زار کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا کرتے۔ انہیں ایک بات کی بڑی خوشی تھی کہ انہیں کابل میں شہنشاہ بابر کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ بابر کے سنگِ مزار پر لکھی ہوئی فارسی رباعی بڑے جوش و خروش سے پڑھ کر سنایا کرتے۔ کشمیری بزرگوں کی طرح ڈٹ کر کھاتے۔ میلوں پیدل چلتے۔ جمعے کے جمعے ہر عزیز اور رشتے دار کے گھر خیر خیریت معلوم کرنے جاتے۔ ڈیوڑھی میں ذرا کھنکار کر گھر کے کسی فرد کا نام لے کر پکارتے۔ جن دنوں میں فلیمنگ روڈ پر رہا کرتا تھا خالو جان کی پاٹ دار آواز ہر جمعے کی صبح کو مکان کی ڈیوڑھی میں گونجتی۔

"بابو عبدالحمید — ؟"

خالو جان کی سب سے بڑی خصوصیت میرے نزدیک یہ تھی کہ ان میں ظرافت کی حس بڑی تیز تھی۔ بڑے لطیفے سناتے۔ بات کو خوب مرچ مسالہ لگا کر پیش کرتے ذرا سی بات پر خوب کھل کھلا کر بچوں کی طرح ہنستے۔ ایک روز میں خالہ کے ہاں گیا ہوا تھا۔ ہم نوعمر لڑکوں کو ایک جگہ اکٹھے دیکھ کر ہمارے پاس آئے اور عصا دیوار سے لگا کر تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"لو بھئی آج تمہیں عبدالرحمان جن کا قصہ سناتا ہوں"

وہ مجھے خود بھی کبھی کبھی جن لگتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا قد۔ بھاری جسم۔ رعب دار آواز اور قدیم یونانی فلاسفروں ایسا بھرپور چہرہ۔ لیکن اُس روز انہوں نے ہمیں جس جن کے بارے میں سنایا وہ ان کی مسجد کے حجرے میں رہتا تھا۔ کہنے لگے۔

"لو بھئی دوستو اگرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز میں نے اُن بچوں کو جو میرے پاس قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں کہا کہ میرا بدن دابو۔ میں پہلو بدل کر لیٹ گیا اور سارے بچے میرے بدن پر ہلکی ہلکی مکیاں مارنے لگے۔ مجھے کچھ ایسا مزا آیا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سارے بچے جا چکے تھے صرف عبدالرحمان نامی لڑکا میری پنڈلیوں پر مکیاں مار رہا تھا۔ حجرے میں کافی پرے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے عبدالرحمان سے کہا کہ بیٹا دیا گل کر دو اور تم بھی جا کر آرام کرو۔ عبدالرحمن نے وہیں بیٹھے بیٹھے پھونک مار کر دیا بجھا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں وہیں اللہ کر فوراً عبدالرحمان کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔ سچ بتا تو کون ہے؟ عبدالرحمان گھبرا گیا۔ جب میں نے کلائی نہ چھوڑی تو

بولا۔ میں عبدالرحمان جن ہوں اور کابل سے یہاں آپ کے پاس قرآن شریف پڑھنے آیا ہوں۔ لو بھئی دوستو! اب وہ جن میرا یار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری انار لا کر کھلاتا ہے۔ بس چٹکی بجاتا ہے اور سرخ قندھاری انار اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔۔۔۔" درگاہ کے بارے میں

بھی دوستو! اب وہ جن میرا یار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری انار لا کر کھلاتا ہے۔

بھی خالو جان نے میرے والد صاحب کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا۔

"مجھے عبدالرحمان جن نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ عبدالعزیز! خواجہ نے وہاں درگاہ کی عمارت تعمیر کر کے اچھا کام نہیں کیا۔ عمارت کے نیچے کئی نیک آدمیوں کی قبریں آ گئی ہیں۔ ہمیں شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

لیکن درگاہ کے پہلے عرس میں خالو جان پیش پیش تھے۔ درگاہ کے پچھواڑے اپنی نگرانی میں زردے بریانی کی دیگیں دم کروا رہے تھے۔ مہتی نائی کو کام کرتے ہوئے بار بار ٹوکتے۔

"زردے میں سنگترے کے ترنج ڈال دیجیے؟"

"مہتی! چولہے کی آگ تیز لگتی ہے مجھے۔"

"بریانی تیار ہو گئی ہو تو ایک بوٹی چکھانا مجھے۔۔۔۔"

پہلے عرس پر درگاہ کے اندر باہر بڑی رونق تھی۔ شہر سے زیادہ تر لوگ دودھ کی نہروں کا سن کر آئے تھے۔ دودھ کی نہر درگاہ میں ایسے چلائی گئی تھی کہ سیمنٹ کے پختہ ایک میو تر سے ٹینک کو کچے دودھ کی لسی سے بھر دیا گیا۔ تانبے کا ایک پائپ گنبد کے گرداگرد چاروں طرف لگا تھا جس میں ٹونٹیاں تھیں۔ لوگ ٹونٹی کھول کر گلاس، پیالے اور ڈول بھر بھر کر دودھ کی لسی پیتے اور حیران ہوتے کہ واقعی خواجہ صاحب نے دودھ کی نہریں چلا دیں۔ درگاہ کے سامنے سرسوں کے کٹے ہوئے کھیتوں میں تمبو قناتیں لگا کر لوگوں نے دکانیں کھول رکھی تھیں۔ پکوڑے تلے جا رہے تھے۔ جھولے لگے تھے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل گرج رہی تھی۔ درگاہ رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی تھی۔ شہر کے علاوہ دیہات سے بھی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان بھاری تعداد میں عرس میں شرکت کو آئے تھے۔ گنبد کی مرمریں جالیوں سے لگی عورتیں، بچے بوڑھے اور جوان دعا مانگ رہے تھے۔ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ جالیوں میں دھاگے باندھ کر منتیں مانگ رہے تھے۔ میں نے

ایک جالی کی ٹھنڈی آنکھ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تینوں قبروں پر پھولوں کے ڈھیر لگے تھے اس قبر پر بھی جس کی خبر میں، بھی خواجہ صاحب، دفن نہیں ہوئے تھے۔ لوگ اُن کی خالی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ہماری امرتسر کی ساری کشمیری برادری، سارے رشتے دار عرس پر جمع تھے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کسی نے بھی درگاہ کے تقدس کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مقبرے میں کون دفن ہے۔ چنانچہ اپنے رشتہ داروں میں میں نے کسی کو مقبرے کی جالیوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتے نہیں دیکھا۔ ان بھنڈارا کھانے میں وہ سب سے آگے تھے۔ پلاؤ سے لبالب بھرے ہوئے قابوں پر وہ چن چن کر قورمے کی بوٹیاں رکھوا رہے تھے۔ پھولدار قناتوں کے پاس دریوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے وہ جن بھوتوں کی طرح خود بھی کھا رہے تھے اور اپنے بال بچوں کو بھی مار مار کر کھلا رہے تھے۔ رات کو گیس کے ہنڈوں کی تیز روشنی میں قوالی شروع ہوئی تو ہمارے ایک رشتے دار کو حال آ گیا۔ وہ لوگوں کو ٹکریں مارنے لگا۔ وہ کسی کے قابو میں ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے چھ آدمیوں نے پکڑ کر اُسے رسیوں سے باندھا اور گھر چھوڑ کر آئے۔ اگلی صبح اُس کی رسیاں کھولی گئیں تو وہ پھر حال کھیلنے لگا۔

قوالی کی انہی محفلوں میں، میں نے پہلی بار مشہور شاعر حضرت بیدم وارثی کو دیکھا۔ پُرسکون زرد چہرہ۔ دھیمی مدھم پلک والی آنکھیں۔ زرد رنگ کی چادر اوڑھے، الگ قطار میں خاموش بیٹھے تھے قوال اُن ہی کا عارفانہ کلام گا رہے تھے۔ محمد علی فریدی قوال اُن دنوں جوبن پر تھے۔ درگاہ کے کونے کونے میں اُن کی پُرسوز آواز گونج رہی تھی۔ میں اپنے خاندان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ تنبوؤں کے نیچے اُس حصے میں بیٹھا تھا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ دری کے نیچے تازہ بنا ہوا اینٹوں کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ قوالی میں میرا بالکل جی نہ لگا۔ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مقبرے کے گنبد کے پاس آ گیا۔ یہاں دالان کے کونوں کھدروں میں لوگ کمبل اوڑھے سو رہے تھے۔ گنبد کے اندر جھاڑ فانوس روشن تھے۔ بے شمار اگربتیاں سُلگ رہی تھیں جن کی بھاری خوشبو سے ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ درگاہ کے اپنے چڑیا گھر سے موروں کے کوکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت مقبرے کی جالی سے منہ لگائے، آنکھیں بند کئے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

نی کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دالان کے مغربی حصے میں سجادہ نشین نائب سجادہ نشین متولی، خزانچی اور سیکرٹری سجادہ نشین کے کمرے تھے جن کے باہر اردو میں اُن کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں گھومتے گھامتے اُدھر کو نکل گئے ہم نے جالیوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ خواجہ صاحب گاؤ تکیئے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ بلب کی روشنی میں بڑی بڑی مونچھوں والا اُن کا سرخ و سپید بارُعب چہرہ چمک رہا تھا۔ کچھ لوگ بڑے ادب سے اُن کے سامنے بیٹھے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے کی جالیوں سے اندر جھانکا تو ایک پھولی ہوئی توند والا موٹا تازہ آدمی گرم کشمیری شال کی بُکل مارے قالین پر اکیلا آلتی پالتی مارے بیٹھا زردہ اُڑا رہا تھا۔ ہم یہاں سے نکل کر درگاہ کے پچھواڑے چڑیا گھر کی طرف آ گئے۔ دس بارہ مرلے زمین کے گرد باڑھ لگا کر اندر مختلف خانوں میں مور، تیتر لٹے، کبوتر اور دو تین ہرن چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہاں بھی اوپر وسط میں ایک بڑا سا بلب روشن تھا۔ روشنی میں جانور کچھ بے چین سی دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں جنگلے کے پاس آتا دیکھ کر ہرن آہستہ آہستہ چلتے ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی بڑی بڑی چمکتی آنکھیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ہم بڑی دیر تک اُن سے کھیلتے رہے۔ قوالی کی آواز یہاں بھی آ رہی تھی۔ اچانک پیچھے آہٹ سی ہوئی ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے امرود کے جھکے ہوئے درختوں کے گہرے سایوں میں قریب ہی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ڈر گئے۔ اور وہاں سے بھاگ کر دالان کی رونق اور روشنیوں میں آ گئے۔

رات ۲ بجے کے بعد محفلِ سماع ختم ہوئی۔ خالو جان اپنا عصا لے کر ہمارے خاندان کی عورتوں اور بچوں کی ٹولی پیچھے لگائے گھر کی طرف چل پڑے۔ سارا رستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ مجھے بڑا ڈر رہا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لگا چل رہا تھا۔ اور دل کو اس خیال سے طاقت دے رہا تھا کہ خالو جان ساتھ ہیں اور جن بھوت چڑیلیں اُن کی مطیع ہیں۔ درختوں پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ کسی وقت کوئی اُلو بولنے لگتا اور فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہو جاتی۔ عورتیں اونچی آوازیں باتیں کر کے اپنے خوف کو دور کر رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے خالو جان موٹا عصا زمین پر بار بار مارتے۔ بار بار کھنکارتے کوئی بیس قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ کسی وقت بلند آواز سے وہ کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ خدا خدا کر کے قبرستان کا رستہ ختم ہوا ہم دروازہ گھی منڈی سے نکل کر بازار بکرواناں میں آ گئے۔ اگلے روز خالو جان نے ایک من گھڑت [illegible] مشہور کر دی۔ کہنے لگے۔

"رات اگر میں تم لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ تم لوگوں کو قبرستان سے لے کر گزر رہا تھا کہ کھائی کے پاس پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چڑیل پُل پر بیٹھی ہے۔ اس کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ پیر اُلٹے ہیں۔ دانت باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر جھٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ السلام علیکم پیر جی!"

یہاں پہنچ کر خالو جان باقاعدہ اٹھ کر چڑیل کی نقل اتارتے۔ ہاتھ اٹھا کر، سر جھکا کر، چہرے پر لجاجت بھری مسکراہٹ لا کر چڑیل کے سلام کرنے کا انداز بتاتے۔

"میں نے عصا اٹھا کر چڑیل سے کہا۔ او نامراد! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ تجھے خبر نہیں کہ پیچھے میرے بچے آ رہے ہیں! چل دفع ہو جا میری آنکھوں سے۔ اٹھ! بھاگ! ـــــ اور چڑیل ہی ہی ہی ہی سلام پیر جی، سلام پیر جی! کہتی اُلٹے پاؤں بھاگ کر امرودوں کے درختوں میں غائب ہو گئی۔"

رشتے دار عورتوں نے سنا تو انہیں قبرستان والی رات یاد کر کے پسینے آ گئے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد میں دوپہر کے وقت بھی قبرستان جاتے گھبرانے لگا۔

عرس کے علاوہ بھی ہم دن میں اکثر کھیلنے اور پتنگ اڑانے درگاہ پر جایا کرتے تھے۔ باغوں میں گھس کر کچے پکے امرود توڑتے۔ کھیتوں میں جا کر مولیاں اکھاڑتے اور انہیں درگاہ کے حوض پر لا کر دھوتے اور نمک مرچ لگا کر کھاتے۔ میرے دادا جان سردیوں کی دوپہریں عام طور پر درگاہ پر ہی گزارتے۔ وہ مقبرے کے پاس فرش پر دری بچھا کر بیٹھ جاتے روٹی کے بھورے کر کے چڑیوں کو ڈالتے۔ پانی سے لبالب بھرا ہوا کٹورا پاس رکھ لیتے۔ چڑیاں وہاں آ کر بڑی آزادی سے دانہ دُنکا چنتیں اور کٹورے پر بیٹھ کر چونچ ڈبا ڈبا کر مزے سے پانی پیتیں۔ وہ دادا جان سے ذرا بھی نہ گھبراتیں۔ دادا جان بھی اُن سے بڑا پیار کرتے تھے۔ انہیں پانی پیتا دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کسی وقت اُن سے باتیں کرنے لگتے۔ ہم دونوں بھائی گُڈی اور ڈھیلے کراتے تو وہ انہیں سیدھا کرتے۔ گُڈی میں ڈور ڈالتے۔ جب ہماری گُڈی یا پتنگ سرسوں کے کھیتوں کے اوپر نیلے آسمان کی ٹھنڈی ہواؤں میں لہرانے لگتی تو دادا جان ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اُسے دیکھتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

"شاباش! ڈھیل مت دینا۔ ہوا تیز ہے۔ ڈور کس کر رکھنا۔ میرا خیال ہے اپنی طرف کنی کھاتی ہے ـــــ۔۔"

درگاہ پر دو یا تین عرس ہی ہوئے تھے کہ اس کا زوال شروع ہو گیا۔ ایک روز میں سکول سے بستہ لے کر گھر میں داخل ہوا تو خالہ جان میری والدہ کے ساتھ رازداری میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے بستہ ایک طرف پھینکا چنگیر میں سے روٹی نکالی ہانڈی میں سے ایک آلو ایک بوٹی نکال کر اس پر رکھی اور وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ خالہ جان اور والدہ محترمہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ درگاہ شریف والے خواجہ صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امرتسر سے اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی، مگر چونکہ والدہ فکرمند تھیں اس لئے میں بھی فکرمند ہو گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ خواجہ صاحب کے ساتھ ضرور کوئی افسوسناک حادثہ ہوا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے بہت جلد مل گیا، کیونکہ درگاہ اُجڑنا شروع ہو گئی۔ چوکیداروں کو تنخواہ نہ ملی تو وہ درگاہ چھوڑ کر چلے گئے۔ خواجہ صاحب کے بڑے لڑکے خود پریشان تھے وہ درگاہ کی حفاظت پوری توجہ سے نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ حوض کی ٹونٹیاں اور دودھ کی نہروں والے تانبے کے پائپ اکھاڑ کر لے گئے۔ رشید لالہ اگر مقبرے میں سے جھاڑ فانوس اتار کر خواجہ صاحب کے گھر نہ پہنچاتے تو لوگ وہ بھی اُتار کر لے جاتے۔ سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، خزانچی اور متولی کے کمروں سے جالی دار دروازے بھی راتوں رات چوری ہو گئے۔ چڑیا گھر کے کبوتر، طوطے اڑ گئے۔ موروں کو قبرستان کے جنگلی بِلّے کھا گئے، کیونکہ اب رات کو اُن کی چوکیداری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا ایک روز دونوں ہرن کھول کر گھر لے گیا، ورنہ اُن کا بچنا بھی محال تھا۔ خواجہ صاحب کی درگاہ اور اُن کے خاندان پر زوال آ گیا۔ میں کبھی کبھی اُن کے گھر جاتا تو وہاں دالان میں سناٹا چھایا ہوتا۔ دو منزلہ بڑا اونچا لمبا جالی دار دروازوں اور نیم روشن ٹھنڈے کمروں، پرانے ڈیکوریشن صوفوں اور مسہریوں، قدِ آدم آئینوں اور پرانی طرز کی روغنی تصویروں والا گھر تھا۔ کبھی وہاں کشمیری عورتوں اور لڑکیوں کی مسرور آوازیں گونجا کرتی تھیں اور اب وہاں خاموشی طاری ہوتی۔

ایک روز دوپہر کو میں ڈور پتنگ لے کر درگاہ پر گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سامنے کھیتوں میں پیلی پیلی سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ درگاہ کے صحن میں ویران مقبرے کے پاس دری کا ٹکڑا بچھائے دادا جان اسی طرح بیٹھے چڑیوں کو روٹی کے بھورے ڈال رہے تھے۔ چڑیاں شور مچاتی ان کے کندھوں، سر اور زانو پر آ کر بیٹھ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ سے بھورے چھین کر لے جا رہی تھیں۔ اور دادا جان ہنس ہنس کر اُن سے اُن کی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کی طرف سجادہ نشین اور نائب سجادہ نشین کے اُجڑے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں کے باہر دھوپ میں خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا چنگیر میں تنور کی روٹی رکھے بیٹھا تھا۔ ایک

ہاتھ میں موجود تھی۔ وہ خشک مولی سے تھوڑی روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ اس بات کو جانے کتنے برس بیت گئے ہیں۔ لیکن یہ عبرت انگیز منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ وہ نائب سجادہ نشین تھا جو عرس کے موقعوں پر اپنے ہاتھ سے پلاؤ اور بریانی کے طشت بھر بھر کر رشتے داروں کے گھر پہنچایا کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھرا گول مٹول ہوتا تھا۔ اب وہ چہرہ اتر گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا۔ میں ڈور اور پتنگ ہاتھ میں لئے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز بڑی مشکل سے روٹی کے خشک نوالے نگل رہا تھا۔ ایک چڑیا چوں چوں کرتی میرے سر پر سے اڑتی ہوئی دادا جان کے کندھے پر جا کر بیٹھ گئی۔ دادا جان کی یہ عادت تھی کہ جب چڑیا اُن کے کندھے یا سر پر آکر بیٹھتی تو وہ ساکت ہو جاتے اور زیادہ نہیں ہلا جلا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا دادا جان بُت بنے بیٹھے ہیں۔ اور بوڑھی نگاہوں سے چڑیا کو دیکھ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔

آج پچیس برس بعد مجھے اُس چڑیا کی یاد آئی ہے۔ کیا وہ گندمی چونچ اور بھولے بھالے چہرے والی معصوم چڑیا زندہ ہوگی؟ وہ تو مجھے بھول گئی ہوگی، لیکن میں نے اُسے نہیں بھلایا۔ شاید وہ بھی مجھے نہیں بھولی ہوگی۔ پرندے کبھی محبت کرنے والوں کو نہیں بھولتے۔ وہ انہیں زندگی میں بھی یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کا انتظار کرتے ہیں۔ کسی حیرت انگیز باغ میں ـــــ اُس باغ کے حسین ترین درختوں میں۔ شفاف پانی والی نہروں کے کنارے۔ ان دیکھے سفید پھولوں کی وادیوں میں اور ـــــ تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ درگاہ کے عرس، عرس کی رونقیں، اُس کی روشنیاں بجھ گئیں۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں کو اُس کے صحن میں گلہریاں دوڑتی پھرتیں اور اُس کے سجادہ نشینوں کے تاریک ویران خانوں میں لٹکتے جالوں والی چھتوں کے نیچے ملنگ چرس، بھنگ پی کر پڑے رہتے۔ وقت اس درگاہ کے ایوانوں میں زوال کے جالے بُنتا گزرتا چلا گیا۔

پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ امرتسر کو بھڑکتے شعلوں کے سپرد کر کے اپنے نئے شہر، نئے وطن میں آگئے۔ چھ یا شاید پانچ برس بعد یوم اقبال کے موقع پر جالندھر میں پاکستانی ہائی کمیشن کی جانب سے ایک زبردست مشاعرہ ہوا جس میں لاہور کے معروف شعرا کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ لوگ میرے دوست تھے پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ جالندھر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ چلو اسی بہانے امرتسر کے کمپنی باغ، ریالٹو سینما، مینگو پارک اور دروازہ مہان سنگھ کے باہر والے باغ کے یوکلپٹس کے درخت سے ملاقات ہو جائے گی۔ جاتی دفعہ ہم لاہور سے سیدھا جالندھر چلے گئے۔ واپسی پر جالندھر سے امرتسر آتے ہوئے بس

تحصیل پورے کے پاس پہنچی تو میں وہیں اتر گیا۔ جانے کس شاعر نے کہا۔

"اے حمید! تمہیں راستہ معلوم ہے ناں؟"

میں سڑک پر کھڑا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ قیوم نظر کی آواز آئی۔

"یہ اُس کا اپنا شہر ہے۔ وہ راستے کیسے بھول سکتا ہے!"

میں جانے کتنی دیر سگریٹ پر سگریٹ پیتا، ویران، اور اجنبی امرتسر کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مہان سنگھ دروازے والے یوکلپٹس کے درخت سے ملا۔ اس تاریخی ملاقات کا حال میں اس مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں۔ تیسرے پہر میں برج پھولا سنگھ کے قریب سے ہو کر قبرستان کی سڑک پر اتر گیا۔ قبروں پر ہل پھیر دیا گیا تھا۔ جہاں کل قبروں پر اگربتیاں سلگتی تھیں۔ چراغ جلتے تھے، آج وہاں مکئی کے کھیت تھے اور بعض جگہوں پر نئے مکانوں کی بنیادیں کھڑی تھیں۔ لوکاٹ اور امرود کے باغ اجڑ گئے تھے۔ کیونکہ امرتسر میں باغبانی مسلمانوں کے پاس تھی۔ میں نے کسی ہندو اور کسی سکھ کو باغبانی کرتے نہ دیکھا تھا۔ اب میں درگاہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس کھائی کے پاس سے گزرا جہاں خالو جان مرحوم کے بیان کے مطابق انہیں اُلٹے ہاتھ پاؤں والی چڑیل ملی تھی۔ اس کھائی کا پُل آدھا ڈھے گیا تھا۔ اُن ندی نالوں کا نام نشان تک باقی نہ تھا جو ناشپاتی اور امرود کے باغوں کی آبیاری کیا کرتے تھے۔ اسی قبرستان میں ایک عورت کی قبر تھی جس پر سنگ مرمر کی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ یہ خوبصورت قبر مرحومہ کے خاوند نے بڑی محبت سے بنوائی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محبت کرنے والے خاوند نے سنگ مزار پر اپنی بیوی کی یاد میں بڑے ہی درد انگیز شعر کندہ کرائے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُجڑے ہوئے قبرستان میں یہ سنگ مرمر کی بارہ دری والی قبر جوں کی توں موجود تھی۔ اب میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ اب میں درگاہ کے سامنے تھا، لیکن وہاں درگاہ نہیں تھی۔ نہ دالان۔ نہ چبوترہ۔ نہ کمرے نہ سجادہ نشینوں کے دیوان خانے اور نہ مقبرہ ـــــ میری آنکھوں کے سامنے گیند کی آدھی دیوار تھی جس پر تھاپیاں نیچے سے اوپر تک لگی ہوئی تھیں۔ جہاں سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک گائے بندھی تھی۔ جہاں نائب سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک جٹا دھاری سادھو بیٹھا، انگ بھبھوت رمائے چرس کے سُوٹے لگا رہا تھا۔ اور جہاں کبھی دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں وہاں آک اور تھوہر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ دیکھا گیا۔

ہاں ـــــ چلتے ہوئے میں نے ایک نظر اُس طرف دیکھا جہاں دادا جان دری پر آلتی پالتی مارے

بیٹھے چڑیوں کو بھورے ڈالا کرتے تھے۔ چڑیوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ اور جب کوئی چڑیا اُن کے کندھے پر بیٹھ جاتی تو اُس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ وہاں کوئی چڑیا نہیں تھی۔ کوئی دوا جان نہیں تھے، لیکن ایک بڑی ہی پیاری آنکھوں والی گلہری، شیشم کے پتوں پر بیٹھی، سورج کی تابناک روشنی میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

الوداع! میری پیاری گلہری! میری پیاری چڑیو! میری پیاری بہنو!

اَمر تسر اَور سیب کا درخت

میں بی آر بی نہر کے کنارے گنجان ٹاہلیوں کے سائے میں کھڑا ہوں۔ میری بائیں جانب ڈھلان پر اینٹوں کا وہ چبوترہ ہے جہاں میجر عزیز بھٹی ٹینک کا گولہ لگنے سے شہید ہوا تھا۔ میں اس نہر پر پہلی بار آیا ہوں۔ آج سے اُنیس بیس برس پہلے میں نے پاکستان ٹائمز میں اس نہر کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں لاہور کے طلبا، دیہات کے لوگ اور شہری کدالیں اور پھاوڑے چلاتے اس نہر کی کھدائی کر رہے تھے۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے دوستوں نے اس نہر پر معمولی سا تبصرہ کیا اور پھر ڈورس ڈے کی سحر انگیز آواز اور ولیم فاکنر کے تازہ ترین ناول پر باتیں شروع ہو گئیں۔ دوسری دفعہ میں نے اس نہر کو اس وقت دیکھا جب میں پاسپورٹ جیب میں رکھے امرتسر جاتے ہوئے اس کے پل پر سے گزر رہا تھا۔ چوڑی چکلی لبالب، سست رفتاری سے بہتی ہوئی ایک پُر وقار نہر —— میں اس سے بڑا متاثر ہوا اور مجھے امرتسر کی بڑی نہر یاد آ گئی۔ آم کے گنجان درختوں کی دو رویہ قطاروں کے بیچ میں سے گزرتی ٹھنڈے پہاڑی چشموں کے پانی سے بھری ہوئی نہر —— جہاں پر مئی جون کی چلچلاتی دوپہروں میں نہانے جایا کرتے تھے۔ ویسے بھی امرتسر نہروں سے بھرا پڑا تھا اور ہمارا بچپن نہروں میں چھلانگیں لگاتے گزرا تھا۔ بڑی نہریں، چھوٹی نہریں اور پھر ان سے نکلے ہوئے نالے جو کوچے، تاج اور لوکوٹ کے ٹھنڈی چھاؤں والے باغوں میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ میں امرتسر کی بڑی نہر یاد کرتا بی آر بی کے پل سے گزر گیا اور بی آر بی کو بھول گیا تھا۔ میرا دل امرتسر کی یاد سے لبریز تھا۔ وطن سے ہجرت کرنے کے بعد پہلی بار امرتسر جا رہا تھا۔ امرتسر جو کبھی میرا وطن تھا۔ جس کے گلی کوچوں کی خاک میں ابھی تک میرے پاؤں کے نشان تھے اور جس کی خاموش فضاؤں میں کھنڈر بنی مسجدوں کی اذانوں کی آوازیں محوِ خواب تھیں۔ جس کے مکانوں کی نیم تاریک ڈیوڑھیوں میں پرانی یادوں کے سائے

پکار رہے تھے۔ جس کے باغوں کے درخت اپنی شاخیں ہلاتے ہوئے آج بھی ہماری یاد میں بے قرار ہیں
اور ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ امرتسر۔ جہاں کبھی سورج ہمارے ساتھ طلوع ہوتا تھا۔ سچے گلاب
کے پھول بھی کبھی باغ میں داخل ہوتے دیکھ کر کھل اٹھا کرتے تھے کہ ہم چھلانگیں لگا کر انہیں پکڑ سکیں۔
میری بس واہگہ چیک پوسٹ کی طرف آگے نکل گئی اور بی آر بی پیچھے رہ گئی۔ امرتسر سے
واپسی پر میں ایک بار پھر بی آر بی کے پل پر سے گزرا اور بس کی کھڑکی میں سے سگریٹ سلگاتے میں نے
یونہی ایک سرسری نظر سے نہر کے چوڑے پاٹ کو دیکھا۔ جس طرح ریل میں بیٹھا مسافر اس چھوٹے
سے سٹیشن کی عمارت کو دیکھتا ہے جہاں ریل رکے بغیر تیزی سے نکل جاتی ہے۔ لیکن آج بی آر بی
نہر ایک زندہ پُرنور اور برگزیدہ ہستی کی طرح میرے سامنے سے گزر بھی رہی ہے اور کھڑی بھی ہے
مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ایک عظیم ماں کے حضور میں کھڑا ہوں جس کی موجوں نے ماماتا
بھری باہیں پھیلا کر اپنے بیشتر بچوں کی خون آلود مقدس لاشوں کو اپنے سینے سے لگایا ہے۔ ماں کی
آنکھیں اداس ہیں، مگر چہرے پر ایک جلال ہے، پُرشکوہ عظمت ہے۔ گویا ایک روشن ترین سورج
ہے جرات کو طلوع ہو رہا ہے۔ میں بی آر بی نہر کے کنارے، عظیم ماں کے حضور میں سر جھکائے کھڑا
ہوں اور ــــ اور نہر کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا میں ماں کے پیار کا لمس محسوس کر رہا ہوں
ہر طرف گہری خاموشی ہے اور اس خاموشی میں نہر کا پانی ایک دھیمی سی سرسراہٹ کے ساتھ بہتا
چلا جا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے گویا پُرجلال نورانی چہرے والی ماں مجھ سے خاموشی کی زبان میں باتیں کر رہی
ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو ’بیٹے! تم میرے کنارے چپ چاپ کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟ کیا دیکھ رہے
ہو؟ کیا تم نے اس روز مجھے دیکھا تھا جب بھارتی ٹینکوں اور توپوں کے گولے آگ برساتے
میرے اوپر سے گزر رہے تھے۔ جب میرے بچے اپنی ماں کے ناموس کو بچانے کے لیے حملہ آور
دشمن کے ٹینکوں سے ٹکرا گئے تھے۔ ہاں! میں نے اپنے بچوں، پاک فوج کے غازیوں کے جگمگاتے
نورانی چہرے دیکھے ہیں۔ میں نے دشمن کے آگ و آہن کے طوفان میں چھلانگیں لگاتے ہوئے
ان کے اللہ اکبر اور یا علیؓ کے نعرے سنے ہیں۔ میں نے موت کو ان کے آگے آگے بھاگتے
دیکھا ہے اور آسمان سے ان پر پھولوں کی بارش برستے دیکھی ہے۔ وہ ماؤں کے لعل تھے۔ بہنوں
کے ہیرے موتی تھے۔ بیویوں کے سہاگ تھے اور اپنے بچوں کے پیارے ابو تھے۔ ان کے سرخ

کے سائے تھے، لیکن اس وقت وہ اللہ کے شیر تھے۔ کاش، تم نے دشمنوں کے جنگل میں ان شیروں
کی دل ہلا دینے والی دھاڑیں سنی ہوتیں۔ وہ اللہ کے سپاہی تھے۔ کاش، تم نے ان اللہ کے ہی
سپاہیوں کو اللہ کے دین کی عزت، غیرت اور حرمت پر شہید ہوتے دیکھا ہوتا کہ بندہ مومن کا ہاتھ
اللہ کا ہاتھ کیسے بنتا ہے اور پھر اس کی ضرب کار گشتا، غالب و کار آفریں کیسے ہوتی ہے۔ مگر تم تو محض
نہر کو دیکھ رہے ہو۔ اس روز اگر تم یہاں ہوتے تو مجھے بھی دیکھتے۔ اس پاک جبیں مقدس ماں کو دیکھتے
جس کی حرمت کے لیے پاک فوج کے نمرود کی آگ میں بے خوف و خطر ہنستے مسکراتے۔ اللہ اکبر اور
یا علیؓ کے فلک شگاف نعرے لگاتے کود رہے تھے۔ اس روز تم اس عالم فانی کا سب سے بڑا
معجزہ دیکھتے۔ تم آگ کو گلزار میں بدلتے اور موت کو زندگی کا روپ دھارتے دیکھتے۔ تم دیکھتے کہ
قرآن کے اوراق میں جب بندہ مومن کا خون گردش کرنے لگتا ہے تو دشت و جبل اس کی للکار سے
کس طرح تھرتھرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی عجیب گھڑی تھی۔ وہ بڑی عظیم گھڑی تھی تاریخ
کے چودہ سو سال سمٹ کر میدان بدر اور میدان کربلا میں چمکتی تلواروں کے سایوں میں آ گئے تھے
ایک جانب وہی جبر و استبداد کی یلغار تھی اور دوسری جانب وہی ایک خدا، ایک رسول اور ایک
قرآن کی عظمت کی للکار ــــ ایک طرف شرارِ بولہبی کا جہنم تھا اور دوسری طرف چراغِ مصطفویؐ کی
ظلم و استبداد کے اندھیروں کو پھاڑ دینے والی ضیا پاشیاں۔ کفار کی عبرت انگیز ہلاکت تھی اور
بندۂ مومن کی ایمان افروز شہادت مشین گنوں اور رائفلوں پر جمے ہوئے ہاتھوں نے اللہ کی
راہ میں جہاد کرنے والی تلوار اپنے چودہ سو سالہ نیام میں سے کوندے کی طرح لپک کر باہر نکل
آئی تھی اور کفر و الحاد کی گھٹاؤں کو پاش پاش کر رہی تھی۔ قرآن کی تلاوت کی باجبروت آوازیں تھیں
اللہ اکبر اور یا علیؓ حیدر کے نعرے تھے مجھے اپنے آپ پر نہر فرات کا گمان ہونے لگا تھا جس کے
کنارے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے دین کا پرچم سربلند کرنے کے لیے کفر کی طاقتوں
سے ٹکرا رہی تھی۔ یا اللہ مجھے معاف کر دینا۔ میں نہر فرات کی ریگ کے ایک ذرے کا بھی
مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نہر فرات جیسی نہیں تھی۔ مگر میں نے تیرے مومنوں کو تیرے نام کی عظمت
کی خاطر پُرسکون، پُرجلال، پُرنور چہروں کے ساتھ شہید ہوتے خود دیکھا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

لیکن میرے بیٹے اُس روز تم کہاں تھے؟

اور میں نے سوچا کہ میں چھ ستمبر کو کہاں تھا! چھ ستمبر کی صبح کا سورج میں نے کوہ مری کی پہاڑیوں میں طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ہی اپنے سنی بینک والے کاٹیج سے نکل کر جھکا ترقی اشجار کے ذخیرے کی طرف آ گیا تھا۔ اس جھکے نے پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ ہسپانوی، ملائی اور فرانسیسی سیب کے درخت لگا رکھے ہیں۔ میں نے نیچے کلڈنہ روڈ پر سے گزرتے ہوئے اکثر ان درختوں کو ڈھلان کے ساتھ ساتھ دیکھا تھا۔ شاخوں میں لال لال سیب دھوپ میں چمکتے نظر آیا کرتے تھے اور مجھے بے اختیار گالز وردی کا ناول "سیب کا درخت" یاد آ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نرم شرمیلی آواز اور پُرسکون باحیا آنکھوں والی میگن کا خیال بھی، جس نے ایشرسٹ سے محبت کی۔ ایشرسٹ اور میگن چشمے کے پاس سیب کے درخت کے نیچے چاندنی راتوں میں ملا کرتے تھے۔ میگن کے ننھے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور ایشرسٹ انہیں چوم کر گرم کیا کرتا اور پھر ایشرسٹ اُسے چھوڑ کر شہر چلا گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ــــ میگن اُسے نہ بھلا سکی۔ وہ چاندنی راتوں میں سیب کے درخت تلے جا کر کھڑی ہو جاتی اور چشمے کے پانی میں چاند کو طلوع ہوتے دیکھتی رہتی اور پھر ایک روز گاؤں والوں کو اسی سیب کے درخت کے نیچے میگن کی لاش ملی۔ وہ چشمے کے سرد پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے سنہری ریشمی گیلے بال کائی زدہ پتھروں میں اُلجھے ہوئے تھے۔

کلڈنہ روڈ پر سے گزرتے ہوئے میں جب بھی اُوپر ڈھلان کی طرف نگاہیں اٹھا کر سیب کے درختوں کو دیکھتا تو مجھے یوں لگتا جیسے بھولے بھالے چہرے والی پاک دل میگن سیب کے درخت کے ساتھ لگی اُداس نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

چھ ستمبر کی صبح کے لیے میں نے پنڈی جانے والی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس میں سیٹ بُک کروا رکھی تھی۔ میں ستمبر میں مری ضرور جاتا ہوں۔ یہی وہ دن ہوتے ہیں جب مری کے خوشبودار میٹھے سیب چلتے ہیں۔ ٹماٹر سرخ ہو جاتے ہیں نکڑوں میں بے دھڑک پانی اُمڈتا ہے اور مری کی سڑکیں زرد رو عبرت انگیز چہروں والے لوگوں سے خالی ہو جاتی ہیں۔

یہ چھ ستمبر کی صبح تھی۔

پو پھٹنے والی تھی۔ موسم سرد تھا۔ میں جانے سے پہلے سیب کے درختوں سے مل لینا

چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے پُل اوور پہنا اور کمرے کے دروازے سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتا چیڑ کے درختوں میں گھری ہوئی پہاڑی پگ ڈنڈی پر چل پڑا۔ مکئی کے کھیتوں کے گرد باڑھ لگی تھی اور مکئی کے بند بھٹوں پر سے اوس کی بوندیں گھاس پر گر رہی تھیں۔ مشرق کی جانب کچھ دیر بعد طلوع ہونے والے سورج کی ہلکی نیلی جھلکیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ آسمان پر ستارے چاندی کے پھولوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک بے حد روشن سنہری بڑا سا ستارہ چیڑ کے جھنڈ کے بالکل اوپر دمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ درختوں کے اوپر جھک کر نیچے کچھ دیکھ رہا ہے۔

اُس وقت بھارت کی فوجوں نے پاکستان کی سرحد پر پانچ گنا بڑی طاقت کے ساتھ حملہ کر دیا تھا اور اُس کی بکتربند گاڑیاں نہتے دیہاتیوں پر گولیاں چلاتی پاکستان کے سرحدی گاؤں میں گھس آئی تھیں۔

ذخیرے والے سیب کے درختوں میں اندھیرا تھا۔ اس ذخیرے کی طرف سے شبنم آلود ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے جن میں سیب کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی تھی۔

میں اُس درخت کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا جہاں میں نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے کئی بار خوبصورت میگن کو دیکھا تھا۔ یہ درخت دوسرے درختوں سے پھیلاؤ میں بڑا تھا اور اُس کی گھنی شاخیں سرخ سرخ سیبوں سے لدی تھیں۔ تنے پر انگریزی میں لکھی ہوئی ایک تختی لگی تھی جو اندھیرے میں پڑھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے میگن کو یاد کر کے آنکھیں بند کر لیں اور گہرا سانس لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں میٹھے سیب کی مرطوب خوشبو پی رہا ہوں۔ مجھے اپنے اوپر سیب کے درخت کا گمان ہونے لگا اور پھر میں نے اپنے تنے پر میگن کے پاکیزہ جسم کا گرم لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یقین تھا اگر میں چند لمحے اور آنکھیں نہ کھولتا تو میرے جسم سے ہری ہری شاخیں پھوٹ پڑتیں اور سیبوں کے گلابی شگوفے کھل اُٹھتے۔ میں نے درخت کے تنے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ میگن نے اپنے ننھے ننھے ٹھنڈے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اُس کی ہتھیلی چوم کر سرگوشی میں کہا۔

"ہالو ڈارلنگ میگن!"

اُس وقت پاک فوج کے جیالے سپاہی وطنِ پاک کی حفاظت کے لیے دشمن کی ٹڈی دل

توپوں اور ٹینکوں کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"الوداع میگن، میرے پیارے سیب کے درخت! میرے سرخ سرخ سیبوں کے لدے ہوئے درخت تو نے میرے وطن کی مٹی سے نمو حاصل کی ہے۔ میرے وطن کے سورج سے رنگ لیا ہے اور میرے وطن کی راتوں سے شبنم کی شیرینی لی ہے۔ تو سدا پھلا پھولا رہے ——! اگلی بہار تک کے لیے الوداع! میں پھر آؤں گا۔ جب تیری ٹہنیاں گلابی شگوفوں سے لدی ہوں گی اور سیاہ بھنورے اپنا میٹھا راگ الاپ رہے ہوں گے"۔

مشرق کی جانب سورج کی اولین سنہری روشنی نمودار ہو رہی تھی اور پھر ایک بے حد روشن کرن شعاعِ نور بن کر آسمان پر پھیل گئی اور سیب، بینگ کے درختوں، مکئی کے لہلہاتے پودوں کے ہرے ڈنٹھل اور ڈھلانوں پر اگی ہوئی گھاس اور گھاس میں کھلے ہوئے بنفشہ کے پھول تصویر بن کر سامنے آ گئے۔ میں پہاڑ کی شفاف، سبزے اور پھولوں کی مہک سے لبریز پاکیزہ ہوا میں سانس لیتا واپس اپنے کاٹج کی طرف چل پڑا۔ صبح ہو چکی تھی اور مری کے پہاڑی کاٹج سفید دھوپ میں چمک رہے تھے کہ میں بس کے انتظار میں سینی بینک پوسٹ آفس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں بس آ گئی اور میں پنڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت لاہور توپوں اور بموں کے دھماکوں سے ہل رہا تھا، لیکن مری کے قرب و جوار میں مکئی کے کھیت صبح کی دھوپ میں لہلہا رہے تھے۔ یہاں کسی کو ابھی تک کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی اس سے پہلے آزاد کشمیر کی مجاہد فورس کی فتوحات کی خبریں لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ لیکن بھارت لاہور پر حملہ کر دے گا، یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس راولپنڈی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ بس ہولے ہولے گرم ہونا شروع ہو گئی۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی شاندار ہوٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں سکون سے بیٹھے ہوں کہ اس کا ایئر کنڈیشنر خراب ہو کر بند ہو جائے اور کمرے کی ٹھنڈی فضا آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہو گئی ہو۔ کمپنی باغ اور ٹریٹ سے نیچے اتر کر بس میدانوں میں آئی تو گرمی اپنے پورے جوبن پر آ گئی۔ میں نے اپنے بیگ کے اندر پرانے کپڑوں میں ہاتھ ڈالا تو وہ ابھی تک ٹھنڈے تھے۔

بس راولپنڈی پہنچ گئی۔ یہاں بھی ابھی تک کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ میں اپنے دوست کی تلاش

میں وودگی ٹی ہاؤس پہنچا۔ ہم نے چائے پی۔ مری اور لاہور کی باتیں کیں اور پھر ریلوے سٹیشن پر آ گئے میں دوپہر کو پنڈی سے لاہور جانے والی ریل کار میں سیٹ بک کرانا چاہتا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ لاہور سے ابھی تک وہ ریل کار بھی نہیں آئی جسے صبح آنا تھا۔ بکنگ کلرک نے بتایا کہ دھونکل شریف کے سٹیشن پر بھارت کے ہوائی جہاز نے ریل گاڑی پر بم گرایا ہے جس کی وجہ سے گاڑیوں کی آمد و رفت رک گئی ہے۔

اب بھی کچھ تشویش ہوئی۔ جس وقت ہم واپس صدر پہنچے تو سارے راولپنڈی شہر میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور صدرِ پاکستان ابھی چند لمحوں میں قوم سے خطاب کرنے والے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے فلمی گانے بند کر دیئے گئے تھے اور ملی ترانے بجائے جا رہے تھے۔ ہم چوک میں ایک پنواڑی کی دکان کے آگے کھڑے ہو گئے لوگوں کا بے پناہ ہجوم جگہ جگہ ریڈیو کے گرد جمع تھا۔ پھر صدرِ پاکستان نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کے بعد قوم کو بتایا کہ بھارت نے رات کے اندھیرے میں بزدلوں کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ ہم کلمۂ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے دشمن کی یلغار کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر بڑھیں گے اور اس وقت تک بڑھتے چلے جائیں گے جب تک کہ دشمن کی توپوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا نہیں کر دیتے۔

صدرِ پاکستان کی تقریر کے بعد پنڈی کی فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ میں نے دیکھا کہ پنڈی کے لوگوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر جوش اور دشمن کو ملیامیٹ کر دینے کا عزم تھا۔ اب میرا لاہور پہنچنا بڑا ضروری ہو گیا تھا۔ ریڈیو پاکستان کو میری ضرورت تھی۔ لاہور کو میری ضرورت تھی۔ وطنِ پاک کو میری ضرورت تھی۔ بڑی مشکل سے مجھے لاہور جانے والی ایک بس میں سیٹ مل گئی۔ بس ساڑھے پانچ بجے پنڈی سے روانہ ہوئی۔ پانچ بجے کی خبروں میں شکیل احمد نے گرجدار آواز میں بتایا تھا کہ حملہ آور دشمن کا لاہور پر حملہ پسپا کر دیا گیا ہے اور وہ لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ میرا دل ایک عجیب پُرجوش جذبے سے لبریز ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں اپنے لیے ایک علیحدہ وطن پاکستان حاصل کیا تھا۔ برہمن کے سینے پر اس وقت سے سانپ لوٹ رہا تھا۔ سترہ سال کے بعد اس نے

اپنے زعم میں پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے لیے حملہ کر دیا تھا اور پاکستانی قوم کی آزمائش کا وقت آگیا تھا۔

"خدا ہمیں اس آزمائش میں سُرخ رُو کرے۔ آمین!"

میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی ـــــ پھر مجھے یقین ہوگیا کہ ہم انشاءاللہ اس آزمائش میں پورے اُتریں گے ہم نے پاکستان لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا ہے ہمارے بچھڑے ہوئے شہروں کے گلی کوچوں اور مکانوں کی دہلیزوں اور کھیتوں اور میدانوں میں ابھی تک ہمارے عزیزوں بھائیوں اور ماؤں بہنوں کا خون جما ہوا ہے ہمارے کانوں میں ابھی تک ہندو سکھوں کی تلواروں سے شہید ہوتے ہوئے معصوم بچوں کی چیخوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ ہم ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کے مکانوں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ اور ان شعلوں میں ہمارے بچوں کی لاشیں جل رہی ہیں۔ ہم نے اپنے بچے قربان کر کے پاکستان حاصل کیا ہے۔ ہم اپنی جانیں، قربان کر دیں گے مگر پاکستان پر حرف نہ آنے دیں گے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اللہ کے نام پر، اس کے دین کی بقا کے نام پر بنا ہے۔ ہم اسلام اور اللہ کے دین کی حفاظت کریں گے۔ زندہ رہے تو غازی، مر گئے تو شہید۔

بس لاہور کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔

گوجر خان سے آگے نکلے تو اندھیرا بڑھنے لگا۔ شام غروب ہوگئی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہر طرف بلیک آؤٹ تھا۔ گوجر خان سے کوئی سات میل آگے گئے ہوں گے پولیس نے بس روک لی اور راولپنڈی جانے کو کہا، کیونکہ پوری جی ٹی روڈ پر نہ صرف بلیک آؤٹ تھا بلکہ کرفیو بھی لگا تھا۔ مسافروں کے چہرے لٹک گئے۔ ایک کاروباری آدمی اپنی بیوی کیساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ لائل پور روڈ کی طرف سے لاہور چلے، پیٹرول کا سارا خرچہ وہ خود ادا کرے گا۔ مگر ڈرائیور رضامند نہ ہوا۔ بس واپس گوجر خان کے اڈے پر آکر کھڑی ہوگئی ڈرائیور نے گوجر خان تک کے پیسے کاٹ کر باقی پیسے سواریوں کو واپس کر دیئے۔ میں نے سوچا کہ گوجر خان ریلوے سٹیشن سے کوئی ٹرین پکڑ کر لاہور پہنچ جاؤں گا۔ چنانچہ میں ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں کسی جگہ بھی کوئی لالٹین یا بجلی کا بلب نہیں جل

رہا تھا۔ ایک پُراسرار، خفیف سی دہشت چاروں طرف اندھیرے میں منڈلا رہی تھی۔ لوگوں کے حوصلے بلند تھے، لیکن بہرحال دشمن نے ملک پر حملہ کر دیا تھا۔ قوم پر امتحان کا وقت آن پڑا تھا۔ شہادت کا وقت آگیا تھا۔ میں شہادت دیتا ہوں، کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

بُکنگ کلرک اوٹ میں ننھی سی موم بتی جلا کر کھڑکی میں بیٹھا۔ اس نے مجھے لاہور کا ٹکٹ دیا۔ کونسی گاڑی کب لاہور کو جا رہی تھی؛ کچھ خبر نہ تھی۔ میں پلیٹ فارم پر آکر ٹہلنے لگا۔ تمام بنچ رُکے ہوئے تھے۔ آسمان پر تارے چمکنے لگے تھے جن کی دھیمی روشنی میں ریلوے لائن دُور تک اندھیرے کے غار میں گم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ایک ملٹری ایکسپریس آئی اور بغیر رُکے لاہور کی طرف تیزی سے نکل گئی۔ اب اندھیرے میں کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں اِدھر اُدھر بیٹھے جنگ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ٹی سٹال پر میں نے چائے کے ساتھ دو سلائیس کھائے اور سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگا۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ میں تھک گیا اور ایک کھمبے کے ساتھ لگ کر پلیٹ فارم پر جا بیٹھا مجھے نیند آنے لگی اور میں پلیٹ فارم ہی پر نیم دراز ہوگیا۔ مجھے ۱۹۴۷ کے وہ دن یاد آگئے جب ہم مہاجرین کر امرتسر سے لاہور آئے تھے اور میں نے ایک رات وزیر آباد کے ریلوے پلیٹ فارم پر سو کر گزاری تھی۔ میرا حوصلہ اُس وقت بھی بلند تھا۔ مجھے اپنی بہادری پر کامل یقین تھا اور اپنی فوج کی شجاعت سے بھی میں بے خبر نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ برِصغیر کی مسلمان قوم ایک جری اور بہادر قوم ہے، کیونکہ وہ سوائے خدا کے اور کسی سے نہ ڈرتی ہے اور نہ محبت کرتی ہے۔ میں نے اپنی بہادر فوج کے جوانوں کو برما، العالمین اور طبروق کے فرنٹ پر بہادری کے جوہر دکھاتے دیکھا تھا اور آج تو وہ دشمن کے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کا عزم لے کر دیگر فرنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آج تو قوم کا بچہ بچہ سپاہی تھا اور محاذ پر جا کر اپنی آن پر مر مٹنا چاہتا تھا۔

پونے بارہ بجے کے قریب راولپنڈی کی جانب سے ایک ٹرین آرکی۔ میں اس میں سوار ہوگیا۔ ڈبے میں کافی رش اور اندھیرا تھا۔ گاڑی تھوڑی دیر رُکنے کے بعد لاہور کی طرف روانہ ہوگئی۔ چند بنگالی سپاہی بھی ہمارے ڈبے میں سوار تھے۔ وہ ہنس ہنس کر ایک دوسرے

سے بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر ایک بنگالی جوان نے اونچی آواز میں نعت پڑھنی شروع کر دی۔ نعت کا بھید یوں کھلا کہ وہ ہر بار گاتے گاتے شعر کے آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ضرور کرتا۔ جہلم پہنچتے پہنچتے ہماری گاڑی کئی بار رکی اور فوجی گاڑیوں کو راستہ دینا پڑا۔ اب دن نکل آیا تھا اور ہر طرف روشنی پھیل گئی تھی۔ میں نے بنگالی جوانوں کو دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس ہنس کر لطیفہ بازی کر رہے تھے۔ اب جو میں نے جی ٹی روڈ کی طرف نگاہ کی، کاروں، ٹیکسی کاروں، سکوٹروں اور بسوں کا ایک ہجوم پنڈی پشاور کی طرف رواں تھا۔ میں سمجھ گیا لاہور کے سرمایہ دار اپنی کوٹھیاں اور عالی شان بلڈنگیں چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔

گاڑی دھونکل سٹیشن پر سے گزری ہم نے وہ جگہ دیکھی جہاں بھارت کے ہوائی جہاز نے مسافر گاڑی پر بم گرایا تھا۔ اور جس میں مس طوسی شہید ہو گئی تھی۔ وہاں لائن ٹیڑھی ہو گئی تھی اور زمین میں سیاہ گڑھا پڑ گیا تھا۔ گوجرانوالہ کے قریب میں نے دیکھا کہ ایک مسافر گاڑی لاہور سے چلی آ رہی ہے جس میں اس قدر رش ہے کہ اس کی چھت پر بھی لوگ سوار ہیں۔ یہ سرحد کے ان دیہات کے لوگ تھے جنہیں بھارتی حملہ آوروں نے تباہ کر دیا تھا۔ گاڑی ہمارے قریب سے گزری تو میں نے ڈبوں میں ایک دوسری کے اوپر بیٹھی ہوئی دیہاتی عورتوں کے پسینے بھرے زرد چہرے دیکھے اور گرمی اور حبس کے مارے روتے بچوں کو دیکھا۔ مجھے وہ مہاجرین ٹرینیں یاد آ گئیں جو ۱۹۴۷ء میں امرتسر جالندھر لدھیانہ، روہتک اور حصار سے لاہور آیا کرتی تھیں۔ جن پر راستے میں سکھ اور ہندو غنڈے حملہ کر دیتے تھے اور لاہور سٹیشن پر عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور نہتے جوانوں کی خون میں نہائی ہوئی کٹی پھٹی لاشیں ڈبوں میں سے نکالی جاتی تھیں۔

مجھے آج بھی وہ منظر یاد ہے۔ میں لاہور سٹیشن کے اندر پلیٹ فارم نمبر چار اور پانچ کے پل پر کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا۔ فیروز پور سے مسلمان مہاجرین کی ایک گاڑی ابھی ابھی آ کر رکی تھی اور اس میں سے مسلم لیگ کے رضاکار عورتوں اور بچوں کی لاشیں باہر نکال رہے تھے۔ میں نے ایک مسلمان عورت کو دیکھا جس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو تلوار سے کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ نیم جان تھی اور بار بار اپنا زرد ہاتھ اٹھا کر ڈبے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد خون میں تر بتر ڈبے میں سے اس کے شیر خوار بچے کی لاش بھی باہر نکالی گئی۔ اس معصوم بچے کی لاش کا حال میں

بیان نہیں کر سکتا۔ یہ دلگداز، دل خراش منظر جب بھی آنکھوں کے سامنے آتا ہے میرا یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے لیے ہم نے جو بے بہا قربانیاں دی تھیں، وہ ہرگز ہرگز رائیگاں نہیں جائیں گی۔

لاہور سٹیشن میں گاڑی داخل ہوئی تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ باڈر ایریا کے دیہات سے آئے ہوئے بے سروسامان لوگ پلیٹ فارموں پر جگہ جگہ ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ ڈبوں میں مسافر ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ گاڑیوں کی چھتوں پر بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اب میرے دل میں سن سینتالیس کی تلخ یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہی مناظر اپنی تمام اندوہناکیوں کے ساتھ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔ لاہور کے انہی پلیٹ فارموں پر میں نے مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مہاجرین کو خستہ حالی اور بے سروسامانی کے عالم میں پڑے دیکھا تھا۔ پھر زبردست بارشوں اور سیلابوں کے بعد بیماریاں پھوٹ پڑی تھیں۔ میں نے پلیٹ فارم نمبر ایک پر مسلمان مہاجروں کو دم توڑتے دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے، ایک جگہ زمین پر پڑا ہوا کسان دم توڑ رہا تھا اور ایک ڈاکٹر اور پولیس والا جھک کر اس کا نام اور گاؤں کا نام پوچھ رہے تھے۔ اس کا گاؤں ... ہوشیار پور، گورداسپور، پٹھانکوٹ یا جموں کی کسی پرسکون ندی کے کنارے آم اور نیم کی گھنی چھاؤں میں گھرا ہوا اس کا پیارا گاؤں .... جہاں وہ کھیل کود کر جوان ہوا۔ جہاں اس نے شادی کی، بچوں کا باپ بنا اور پھر اسی گاؤں میں اپنے بچوں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کی لاشیں چھوڑ کر دم توڑنے کے لیے لاہور کے ٹھنڈے سنگین پلیٹ فارم پر آ گیا۔

میں جلدی جلدی لاہور ریلوے سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اب مجھے دھماکوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دے رہی تھی جو واہگہ کی جانب سے آ رہی تھی۔ لاہور سٹیشن کے باہر پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ لوگ پریشان ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں کو سامان اٹھائے بدحواسی کے عالم میں سٹیشن کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ لاہور چھوڑ رہے تھے۔ میں بڑا حیران ہوا۔ میں نے ایک واقف کار سے پوچھا۔

"کیوں بھئی، لاہور چھوڑ چلے؟"

وہ ذرا ہنسا اور بولا:

"نہیں یار۔ بچوں کو پشاور چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

میں نے رکشا کیا اور اسے فلیمنگ روڈ چلنے کو کہا۔ رکشے والے نے تین روپے مانگے۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ رکشا پٹرول لینے کے لئے پٹرول پمپ کی طرف مڑا۔ وہاں رکشوں اور ٹیکسیوں کی قطار لگی تھی۔ اب محسوس ہوا کہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہماری باری آئی۔ میکلوڈ روڈ پر لوگ تانگوں اور ٹیکسیوں پر سامان لادے ریلوے سٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے فلیمنگ روڈ پر بڑی ہما ہمی اور پُرجوش ماحول تھا۔ رضاکار وردیاں پہنے پھر رہے تھے۔ ہمارے محلے میں محلے داروں کے ناموں کا اندراج کیا جا رہا تھا۔ وارڈن پوسٹیں وجود میں آ چکی تھیں۔ کوئی دس منٹ گھر میں گزارنے کے بعد میں سیدھا ریڈیو پاکستان کی طرف چل پڑا۔

اب شام ہو رہی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی لالی نے ہیبت روڈ پر شیشم کے درختوں کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ اب توپوں کے دھماکے زیادہ سنائی دیتے تھے ریڈیو سٹیشن کے گیٹ پر فوج کا پہرہ تھا۔ ایمپرس روڈ سے دو فوجی ٹرک گزرے لوگوں نے اپنے بہادر جوانوں کو دیکھ کر اللہ اکبر اور یا علی اور پاک فوج زندہ باد کے پُرجوش نعرے لگائے۔ میں نے فوجی نوجوانوں کو دیکھا۔ اُن کے چہرے گرد آلود تھے۔ لیکن آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں حملہ آور دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا آہنی عزم تمتما رہا تھا۔ ریڈیو سٹیشن میں ہر شخص پُرجوش پُرعزم تھا۔ دلوں میں ایک نیا ولولہ جاگ اٹھا تھا۔ شہر کے تمام شاعر، ادیب، آرٹسٹ، فنکار، گلوکار، موسیقار اور علمائے کرام جمع ہو گئے تھے۔ ولولہ انگیز تقریریں ریکارڈ ہو رہی تھیں۔ پُرجوش جنگی ترانے لکھے جا رہے تھے ان کی دھنیں بنائی جا رہی تھیں۔ ان دھنوں کو ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ صادق علی مانڈو ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کی طرف جاتے جاتے ترانے کی طرز بنا لیتا اور ایک گھنٹے بعد ریڈیو سے جنگی ترانے کی آواز گونج اٹھتی۔

پاک فوج کو سلام

سیالکوٹ تو زندہ رہے گا۔

نگری داتا کی۔

اے ہوا کے راہیو

سرگودھا میرا شہر۔

زندہ ہے لاہور۔

سٹوڈیو نمبر ۳ میں ملکہ ترنم نور جہاں بیٹھی ترانہ ریکارڈ کروا رہی ہے۔

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو۔

مجھے یاد ہے "ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے۔ کیہ لبھدی ایں وچ بازار کڑے" ریکارڈ کرواتے وقت میڈم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ یہ ترانہ انہوں نے میجر عزیز بھٹی کی شہادت کے اگلے روز ریکارڈ کروایا تھا۔ سٹوڈیو میں ملکہ ترنم کے ساتھ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے اور پھر جب دشمن نے قصور پر حملہ کیا اور اُسے کھیم کرن سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تو ملکہ ترنم نے اسی روز ریڈیو پاکستان لاہور کے سٹوڈیوز میں یہ ترانہ ریکارڈ کرایا۔

نی میرا سوہنا شہر قصور نی

ایدیاں دُھماں دُور دُور نی

ایہہ شہر اے شاہ عنایتؒ دا

ایتھے بُلھے شاہ دا ڈیرا اے

ایتھے رات نوں دن واچانن اے

ایتھے رہندا نت سویرا اے

نی میرا سوہنا شہر......

ناصر کاظمی انبالے سے ہجرت کر کے جب پہلے پہل لاہور آیا تو آج سے بائیس برس پہلے ہماری پاک ٹی ہاؤس میں ملاقات ہوئی۔ وہ انبالے کی پرہاتوں کی باتیں کرتا رہا۔ آموں کے جھنڈ۔ ساون کی لمبی جھڑیاں۔ کوئل کی پکار، سبزے کے فرش، آموں میں پڑے جھولے —— سترہ برس بعد بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو وہ ارض پاک کے تحفظ کے جذبے سے بھڑک اٹھا۔ اب انبالہ نہیں، سرگودھا اس کا شہر تھا۔ اس کے قلم نے لکھا۔

زندہ دلوں کا گہوارہ

سرگودھا میرا شہر

جنگ کے دوران میں ریڈیو پاکستان پر جتنے بھی فنکار، گلوکار، علمائے کرام اور شعرا

آئے۔ انہوں نے ایک پیسہ بھی معاوضے کے طور پر قبول نہ کیا؛ چنانچہ ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سٹوڈیو میں گلوکار جنگی ترانہ گا رہا ہے یا کوئی عالمِ دین تقریر کر رہا ہے اور ڈیوٹی روم میں اس کے نام کا کوئی چیک نہیں جا رہا۔ جن کے چیک بعض دفتری تقاضوں کے تحت بنتے بھی تھے وہ انہیں وصول کرنے کی بجائے وار فنڈ میں دے دیتے تھے۔

سات ستمبر کو میں نے لاہور میں ایک نئی قوم ابھرتے دیکھی۔ ایک ایسی قوم جس کا ولولہ زندہ، نگاہ بیدار اور یقین محکم تھا۔ چھ ستمبر کی شام والی افراتفری اور بے نظمی مفقود ہو چکی تھی۔ اب کسی بھی پٹرول پمپ پر کوئی قطار نہیں لگی تھی۔ آپ جہاں سے جتنا چاہیں پٹرول لے سکتے تھے۔ راشن ڈپوؤں پر کھانے پینے کی ہر شے وافر مقدار میں موجود تھی۔ ملک میں چوری، ڈکیتی، قتل و غارت گری اور اغوا کی وارداتوں کا وجود تک باقی نہ رہا تھا۔ کہیں بھی، کسی بھی جگہ لڑائی مار کٹائی یا فائرنگ کا واقعہ نہیں ہو رہا تھا۔ اخباروں میں جرائم کی ایک بھی خبر نہیں آ رہی تھی۔ ریڈیو سٹیشن پر دن میں ہزاروں فون آتے تھے۔ لوگ پوچھتے تھے کہ ہم ملک اور قوم کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں۔ ہمیں بتایا جائے ــــ لوگ فوجی ٹرکوں کو سڑکوں پر سے گزرتا دیکھ کر جوش میں آ جاتے۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اللہ اکبر کے نعرے لگاتے۔ باغبانپورہ سے پاکستان منٹ تک لوگوں کا تانتا بندھا تھا۔ وہ محاذ پر اپنے فوجی جوانوں کے چہروں پر جلال تھا۔ سورج طلوع ہو رہا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر کفار سے جہاد کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر جنگِ بدر کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ان غازیانِ صف شکن، خدا کے شیروں، اللہ کے سپاہیوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالوں نے دشمن کو ہر محاذ پر کس طرح ذلت آمیز شکست دی۔ کس کس طرح جوانمردی اور بلند ہمتی سے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے خود شہید ہو گئے، لیکن دشمن کو ارضِ پاک پر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا ــــ اس کے بارے میں آپ بہت کچھ پڑھ چکے ہیں اور دنیا کا ہر ملک پاک فوج کی بہادری اور شجاعت کا معترف ہے۔ میں ان سنہری کارناموں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ ہو سکتا ہے میں انہیں بیان کرتے ہوئے فوجی نقطۂ نگاہ سے ان کارناموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہماری پاک فوج کے جیالوں نے سترہ دن کی جنگ میں یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام زندہ ہے، مسلمان زندہ ہے اور اللہ کے اس آخری دین کا جب بھی جیالا

ہو، تو اس عظیم نشاۃِ الثانیہ کا مرکز پاکستان ہوگا۔

جنگِ ستمبر کے دو تین سال بعد بھارت سے آئے ہوئے کچھ ہندو اور سکھ ادیبوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے جنگِ ستمبر کی باتیں شروع کر دیں اور کہا کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی جو بعض غیر ملکی طاقتوں کے ایما پر شروع ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے بین الاقوامی انسانیت اور ادب کی انسانیت پرستی کا تذکرہ شروع کر دیا۔ میں نے ان سے کہا۔

"اے میرے دوستو، پہلی بات تو یہ ہے کہ بین الاقوامی انسانیت کا نام ہی اسلام ہے۔ جب بھارت کی سرکار نے مقبوضہ کشمیر کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر پاکستان پر حملہ کیا ــــ تو اس نے بین الاقوامی انسانیت ہی پر حملہ کیا تھا۔ ہماری غیرت کو للکارا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر میں انسانیت پرستی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھارتی حملہ آوروں کی یلغار کا مقابلہ نہ کرتا اور وہ لاہور پر قابض ہو جاتے تو کیا وہ محض اس بنا پر مجھے معاف کر دیتے کہ میں بین الاقوامی انسانیت کا پرستار ہوں اور یہ کہ راجندر سنگھ بیدی میرا دوست ہے اور الٰہ آباد کے امپریل ہوٹل والا افسانہ نگار بلونت سنگھ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ہرگز نہیں ــــ جب کسی ملک کی فوج فاتح بن کر کسی ملک میں داخل ہوتی ہے تو وہاں کے افضل ترین انسان کو ذلیل ترین انسان بنا دیتی ہے اور یہ بین الاقوامی انسانیت کے خلاف ہے، اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اسلام ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ غیرت مندی اور خودداری کی تعلیم دیتا ہے۔

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

میں جب بھارتی حملہ آوروں کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار بن کر ڈٹ گیا تھا تو میں نے بین الاقوامی انسانیت ہی کی اخلاقی اقدار کو پامال ہونے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ میں تمہارے ناگ پور، کلکتہ، دلّی، جھانسی، مدراس اور لکھنؤ سے پیار کرتا ہوں اور وہاں کے رہنے والوں سے دشمنی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اسلام مجھے امن اور محبت کا درس دیتا ہے۔ لیکن اگر تمہارے شہروں کے رہنے والے مشین گنیں، توپیں، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں لے کر میرے امن پسند شہروں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے حملہ کر دیں گے تو یاد رکھو تمہارے ناگ پور، لکھنؤ، کلکتہ اور جھانسی کا سینہ

چیلنج کرنے کے لیے سب سے پہلا گولہ میرے ٹینک میں سے نکلے گا۔ بھارتی ادیب خاموش ہو گئے وہ جواب کیا دیتے۔ وہ میری بات سمجھ بھی نہ سکے تھے۔ حیرانی مجھے اُس وقت ہوئی جب خود ہمارے پاکستان کے دو ایک افسانہ نگاروں نے چائے کی پیالی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یار، جنگ ستمبر تو محض ایک سٹنٹ تھا۔ ہم ادیب ہیں۔ ہمیں تو ساری انسانی برادری سے پیار کرنا چاہیئے۔ ہمیں تو ساری انسانی برادری سے پیار کرنا چاہیئے ہمیں جنگ سے نفرت کرنی چاہیئے۔"

میں نے ایک ادیب سے پوچھا۔

"میرے افسانہ نگار، ڈرامہ نگار دوست، تم انسانی برادری سے پیار کرتے ہو اور جنگ سے نفرت ——— مجھے بتاؤ تم اپنی جوان بیٹی کے ساتھ ایک سڑک پر سے گزر رہے ہو اور چند غنڈے تمہاری بیٹی کو اٹھا کر ٹیکسی میں ڈال کر فرار ہو جاتے ہیں تو کیا تم انہیں کچھ نہ کہو گے؟ کیا تم اپنی بیٹی کی چیخ و پکار سنتے رہو گے اور انسانی برادری سے محبت اور جنگ سے نفرت کا پرچار کرتے رہو گے معاف کرنا اگر تم ایسا کرو گے تو تم جانور سے بھی ارزل ہو گے، کیونکہ یہ بے غیرتی ایک جانور بھی گوارا نہیں کرتا۔"

میرا افسانہ نگار دوست قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور بولا:

"تم جذباتی ہو رہے ہو۔ پھر کبھی بات کریں گے۔"

اس نے پھر کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔ وہ مجھ سے بات کر بھی نہیں سکتا۔ وہ نہ کفر سے باخبر ہے نہ اسلام سے وہ اچھا مسلمان کیا بنے گا وہ ایک بڑا کافر بھی نہیں

"زمانے کی قسم انسان گھاٹے میں ہے......"

ہاں ——— مگر جن کو خدا توفیق دے۔ حکمت کی، ایمان کی سلامتی کی، تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

بی آر بی نہر پر شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں میجر عزیز بھٹی شہید کی شہادت گاہ پر کوئی اگربتیاں سلگا گیا تھا وہ بجھ گئی ہیں۔ اگربتیاں بجھ جاتی ہیں، لیکن اُن کی خوشبو باقی رہ جاتی ہے۔ شہادت گاہیں مٹ جاتی ہیں۔ مگر شہید زندہ رہتے ہیں ——— بی آر بی نہر کا پُر سکون پانی بڑی سبک رفتاری

سے بہا چلا جا رہا ہے۔ کنارے کے درختوں کا عکس پانی میں گہرا سبز ہو گیا ہے۔ سورج مغربی افق میں غروب ہو رہا ہے نہر کے پانی میں ایک بھی لہر نہیں اٹھ رہی۔ اپنے شہیدوں کی یاد کو سینے سے لگائے وہ ابدی سکون کے ساتھ بہا چلا جا رہا ہے۔ میں میجر عزیز بھٹی شہید کی شہادت گاہ کی بجھی ہوئی اگر بتیوں اور سوکھے ہوئے پھولوں کو دیکھتا ہوں اور مجھے سیب کے شگوفوں کا خیال آ رہا ہے ——— دُور کسی گاؤں کی مسجد سے شام کی اذان کی صدا بلند ہو رہی ہے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کوئی نہیں معبود سوائے اللہ کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اُس کے رسول ہیں۔"

اور میں شہید ہوں۔

امرتسر کی ایک ہولناک رات

یہ واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجل نے سنایا۔

کامریڈ بجل آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا ممبر تھا۔ پارٹی کا دفتر ہال بازار میں سنمد اور شکر پور ہوٹل کے سامنے مسجد خیر الدین کے پہلو میں تھا۔ نیچے گراموفون ریکارڈوں کی دکان تھی جہاں سے دن بھر کبھی کمل جریا، کبھی اختری بائی فیض آبادی، کبھی پیارو قوال اور کبھی سہگل، کانن اور پنکج کے گیتوں کی آواز آیا کرتی۔ اسی دکان کی بغل سے تنگ سیڑھیاں اوپر پارٹی کے دفتر کو جاتی تھیں۔ سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں ہی امرتسر تانگہ ڈرائیور یونین کا دفتر بھی تھا جس کا سکرٹری کامریڈ چمن اور جنرل سکرٹری ظہیر کاشمیری تھا۔ ناٹے قد اور گٹھے ہوئے بدن والا کامریڈ چمن کوچوانوں کے چندے کی شراب پی کر شام کو پارٹی کے دفتر میں آ کر خوب اودھم مچاتا تھا۔ کامریڈ اللہ رکھا ساجد جناح کیپ اور کھدر کی بوسکی شلوار قمیض میں بڑا مخلص معلوم ہوتا۔ وہ پنجابی کا شاعر بھی تھا۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتا۔

ایک روز میں اور احمد راہی دفتر کی بالکونی میں کرسیاں ڈالے بیٹھے ہال بازار کی رونق دیکھ رہے تھے کہ کامریڈ ساجد ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ بازار میں ہندو سکھ لڑکیاں بڑی تعداد میں گزر رہی تھیں۔ غالباً اس روز کوئی تہوار تھا۔ کامریڈ ساجد پہلے تو ان لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"کامریڈ ایک شعر ہو گیا ہے اردو میں۔ عرض کیا ہے کہ ؎

ہے بات کیا جو بھیڑ ہے اتنی لگی ہوئی

کچھ دِکھ رہا ہے آج یہ ہال بازار میں۔"

ظہیر کاشمیری نے پارٹی دفتر کے اوپر والے کمرے پر قبضہ جما رکھا تھا۔ چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ دری پر ایک صندوقچی رکھی تھی۔ کونے والی میز پر سیاہ پتھر

کا ایک چورس ٹکڑا پڑا تھا جس پر ٹیگور کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ کامریڈ ساجد، کامریڈ بجل، کامریڈ شریف متین۔ کامریڈ چمن اور کامریڈ کنول۔ یہ لوگ سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رُکن تھے۔ ظہیر کاشمیری خانساماں یونین اور تانگہ ڈرائیور یونین کے لیے کام کرتا۔ میں اور احمد راہی کبھی کبھی اس دفتر میں جا کر گپ بازی میں وقت گزارا کرتے۔

مجلسِ احرار کا ان دنوں امرتسر میں بڑا زور تھا۔ مسجد خیر الدین اور انجمن پارک کی فضائیں سید عطاء اللہ بخاری اور شیخ حسام الدین کی جوشیلی بھڑکیلی تقریروں سے گونجا کرتی تھیں۔ اس جماعت میں بڑے مخلص کارکن بھی تھے مگر حکومتِ الٰہیہ کے پروگرام کی تفصیلات کو یہ واضح صورت میں امرتسری مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ میرے خیال میں اس جماعت کا سارا جوش، شعلہ فشاں تقریروں، ہنگامہ خیز جلسوں، پُرہجوم جلوسوں اور فلک شگاف نعروں میں صرف ہوتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا امرتسر کی سیاسی فضا کو پُرجوش، گرم اور بیدار رکھنے میں مجلس احرار بھی بڑا کام کر رہی تھی۔ اس خوشش کو بعد میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی نیلی پوش تحریک نے بھی خوب گرمایا اور جب مسلم لیگ پاکستان کا مشن لے کر سامنے آئی تو امرتسری مسلمانوں کو پہلی بار اندھیرے کے سمندر میں دور۔ روشنی کا ایک مینار ٹمٹماتا دکھائی دیا۔ پاکستان کے قیام کا پروگرام ایک بڑا واضح اور مثبت پروگرام تھا۔ اس پروگرام کی قیادت ایک پُرعزم، بے لوث اور مردِ آہن کے ہاتھ میں تھی جس نے برہمنی سامراج کے مکروفریب کے پردے کو چاک کر کے اسلام کا پرچم بلند کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں اور خاص طور پر امرتسر کے مسلمان سیاسی طور پر ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک سیاسی بے یقینی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے تھے۔ ہندوؤں کی تہذیب، کلچر اور مذہب الگ تھا۔ ان کے ساتھ مل کر وہ رہ نہیں سکتے تھے۔ اُن سے الگ ہو کر رہنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ امرتسر میں ہر محرم اور عید میلاد پر ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔ پٹ رنگوں کا تعزیہ گرو بازار میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ چونکہ ہندو سکھوں کا گڑھ تھا۔ غیر مسلم اس تعزیے پر پتھر پھینک کر بھاگ جاتے۔ ایک بار محرم پر کرموں ڈیوڑھی کے ہندو حلوائی نے کھولتا ہوا گھی مسلمانوں پر پھینک دیا۔ جس کا بدلہ اسی وقت ہندو حلوائی کی دکان کو نذرِ آتش کر کے لے لیا گیا۔ امرتسر کا مسلمان بہادر دلیر اور نڈر تھا۔ ہندو سکھ ہمیشہ اس سے دب کر رہتے تھے۔ پھر بھی غیر مسلم اپنی فرقہ وارانہ شرارتوں سے

باز نہ آتے اور مذہبی تہوار پر فساد کھڑا کر دیتے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے درشنی ڈیوڑھی میں عید میلاد النبیؐ کے جلوس پر ہندو لڑکوں کو پتھر پھینکتے اور پھر بھاگتے دیکھا ہے۔ میں اُن دنوں ایم اے۔ او ہائی سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ عید میلاد کا جلوس شہر میں سے ہوتا ہوا کمپنی باغ کی طرف جاتا تھا۔ میں نے چاند تارے والا سبز پرچم اٹھا رکھا تھا۔ ہمیں اُن دنوں جلوسوں میں جھنڈے اٹھانے کا بڑا شوق تھا۔ پرچم اٹھائے جب ہم سینہ تانے اپنے محلے میں سے گزرتے تو ہمیں یوں محسوس ہوا کرتا گویا ہم دشمن پر فتح پا کر آ رہے ہیں۔ جب یہ جلوس درشنی ڈیوڑھی میں پہنچا تو ایک ہندو کے مکان سے چند اینٹیں ہمارے آگے آن پڑیں۔ میں نے مکان کی طرف دیکھا تو وہاں ممٹی پر سے دو چار ہندو لڑکے دوسرے مکان میں کود رہے تھے۔ ہم نے اُس مکان کا بند دروازہ توڑ دیا ——— مگر پولیس نے مداخلت کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ ہندو ہمیشہ چھپ کر مسلمانوں کے جلسوں اور جلوسوں پر پتھر پھینکتے اور دُم دبا کر بھاگ جاتے۔ وہ کھل کر کبھی میدان میں سامنے نہیں آئے تھے۔ جب امرتسر کے شیر مسلمان میدان میں آتے تو میدان خالی ہوتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غیر مسلموں کی یہ اشتعال انگیز حرکتیں کب تک جاری رہیں گی اور مسلمانوں کی آنیوالی نسلیں برہمنوں کی فتنہ پرور اور منافقانہ ذہنیت کے ساتھ اپنا مستقبل کیسے سنوار سکیں گی؟

چنانچہ اسی تذبذب اور عدم اطمینان کے عالم میں جب پاکستان کی قرارداد سامنے آئی تو مسلمانوں کو پہلی بار اپنی منزل کا سراغ ملا اور انہوں نے اس منزلِ درخشاں تک پہنچنے کے لئے جان و مال کی قربانیاں دینے کا عزم بالجزم کریں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ابھی تک ہندو لیڈروں کے دام میں گرفتار تھے اور کانگریس کی برہمنی جماعت کو ہی ہندوستان کی واحد جماعت سمجھتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب برہمنی سامراج اور مسلم دشمنی کے شعلے اُن کے گھروں تک پہنچ گئے تو اُن پر ہندو کا منافقانہ اور اسلام دشمن انداز کھل کر سامنے آ گیا۔ میں اِن دنوں میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔ لیکن میری خانہ بدوشیاں مجھے اتنی عمر میں ہی بمبئی سے کلکتے، ناگ پور، مدراس، ترچناپلی، رامیشورم اور وہاں سے لنکا اور پھر وہیں سے رنگون تک گھما پھرا لائی تھیں۔ میں نے مدراس کے دوپٹے مسلمانوں کو اسلامی شعار پر انتہائی پابندی سے عمل کرتے دیکھا تھا۔ میں نے وزیگا پٹم میں مرہٹے مسلمانوں کو سُرخ آنکھیں لئے سلطان

شہید ٹیپو کے مزار پر نامعلوم خلاؤں میں گھورتے دیکھا تھا۔ میں نے رنگون کی سورتی جامع مسجد میں مسلمانوں کو نماز جمعہ کے بعد دینِ اسلام کی مرکزیت اور عالمِ اسلام کی ترقی و خوشحالی کی دعائیں مانگتے سنا تھا۔ میں نے رنگون کے زیر بادی برمی مسلمانوں کے محلوں میں صبح کے وقت قرآنِ کریم کی تلاوت کی پُرشکوہ آوازیں سنی تھیں اور میں کولمبو کی ٹیپو مسجد میں ہر نماز پر مسلمانوں کے اجتماعِ عظیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ پھر میں نے اجین اور ناگ پور کے برہمنوں کو مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات کرتے اور دامن بچا کر نفرت سے گزرتے دیکھا تھا۔ میرے سامنے ہندو کلکتے کی ذکریا سٹریٹ والی مسجد ناخدا کے آگے سے باجے بجاتے اور مسلمانوں کو مشتعل کرتے گزرا کرتے تھے۔ اُس عمر میں ہی مجھے سیاسی بصیرت نہ سہی مگر اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے ہندو۔ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اور اُن کے جھوٹے برتنوں کو ہاتھ لگائے بغیر کتوں کے آگے پھینک دیتے ہیں۔ امرتسر کے ہندو محلوں میں جگہ جگہ پانی کی سبیلیں لگی ہوتیں۔ ان سبیلوں پر ہندو اور سکھ یا تو شیشے یا تانبے کے گلاس میں پانی پیتے اور یا کسی غریب سبیل پر اوک سے پانی پی لیتے۔ لیکن مسلمان کو ہر ہندو سبیل پر بانس کی نلکی میں پانی ڈال کر جانوروں کی طرح پینا پڑتا۔ گویا مسلمان کو ہندو اچھوتوں سے بھی کم تر سمجھتے تھے۔ یہ وہ ذلت انگیز رویہ تھا جسے کوئی بھی غیور قوم برداشت نہیں کر سکتی۔ اور مسلمان ایک بہادر اور غیور قوم ہے۔ اُس نے کئی سو برس تک ہندوؤں پر حکومت کی تھی۔ وہ بھلا اِس ذِلّت کو کیونکر زیادہ دیر برداشت کر سکتی تھی۔ قرار دادِ پاکستان نے مسلمانوں کو اُن کی عزت نفس، دین، کلچر اور غیرت کے تحفظ کا پیام دیا تھا۔ چنانچہ امرتسر کے تقریباً ہر مسلمان کے دل میں پاکستان کی شمع روشن ہو گئی اور وہ آندھیوں اور طوفانوں کے مقابلے کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔

دوسرے مسلمان گھروں کی طرح ہمارے گھر میں بھی مسلم لیگ اور پاکستان کا چرچا رہنے لگا۔ ہمیں اور تو کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں اتنا ضرور معلوم تھا کہ پاکستان بن گیا تو مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملک مل جائے گا۔ جس میں وہ آزادی اور عزت کے ساتھ رہیں گے۔ اور ایک مسلمان کے لئے آزادی اور عزت سے بڑھ کر اور کوئی شے اِس دنیا میں نہیں ہے۔ شہر میں لیگ کے جلسے منعقد ہونے اور جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ ایک بار انجمن پارک میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ میں اپنے

چھوٹے بھائی مقصود کے ساتھ جلسہ سننے گیا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب راجہ غضنفر علی خان تقریر کے بعد تالیوں کے شور میں سٹیج سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک لیگی کارکن نے نعرہ لگایا۔

"راجہ حق ظفر علی خان ـــــ زندہ باد"

اور میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ یہ لفظ اصل میں غضنفر ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ جنگ شروع ہو کر ختم ہو گئی اور شہر میں سیاسی ہنگامے زیادہ تیز ہو گئے گول باغ، انجمن پارک، مسجد خیر الدین، سکتری باغ اور مسجد جان محمد میں ہر جمعے کو جلسے ہونے لگے۔ شاید انہی دنوں لندن سے کیبنٹ مشن آیا۔ شملہ کانفرنس ہوئی۔ پاکستان کی منزل قریب آ رہی تھی اور امرتسری مسلمانوں میں جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ عورتوں کے جلوس پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے نکلنا شروع ہو گئے۔ پولیس اُن پر آنسو گیس پھینکنے لگی۔ امرتسر کی کوئی دکان، کوئی ہوٹل، کوئی بیٹھک ایسی نہ تھی جہاں پاکستان اور قائداعظم کے بارے میں بات نہ ہوتی ہو ـــــ مارکیٹ ملکم سنگھ میں صوفی غلام محمد ترک کا ترک ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل امرتسر کے شاعر ادیبوں اور دانشوروں کے ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس تھے۔ یہاں صبح و شام گرما گرم بحثیں ہوتیں سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں بھی پاکستان زندہ باد کے نعروں کی گونج پہنچ چکی تھی۔ ایک روز مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجلی نے کہا۔

"یار تم لوگ تو معلوم ہوتا ہے پاکستان بنا لو گے۔ لیکن ہمارا کیا بنے گا؟
ہم لوگ ہندوؤں کے ساتھ کیسے گزارا کریں گے؟"

میں نے کہا۔

"بہر حال، اسلام کے مقابلے میں تم لوگ ہندو مذہب کے بہت قریب ہو۔
تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔"

اس پر کامریڈ موہن سنگھ بجلی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا اور اس کے بالوں بھرے ادھیڑ عمر کے پچکے سے چہرے پر لگی عینک کے شیشے ماند پڑ گئے تھے۔ کامریڈ بجلی بڑا مخلص سکھ تھا۔ اُسے نہ اسلام سے دلچسپی تھی، نہ ہندوازم سے اور نہ سکھ مت سے ـــــ

مگر کڑا کرپان وہ ضرور پہنتا تھا اور کیس بھی اُس نے رکھے ہوئے تھے۔ یہ حقیقت اُس زمانے میں ہی میرے تجربے میں آ چکی تھی کہ ہندو اور سکھ کمیونسٹ ہو کر، دہریہ ہو کر بھی اپنے مذہبی شعائر پر کسی نہ کسی طور قائم رہتے تھے۔ ہمارے محلے کے رامگڑھیا ہائی سکول میں ہمارا حساب کا ماسٹر موتا سکھ تھا۔ اور دہریہ تھا۔ یعنی اُس نے داڑھی مونچھ اور بال صاف کر رکھے تھے پھر بھی وہ صبح کے وقت شبد کیرتن بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر سنتا اور ہر بات میں گورو نانک اور گورو ارجن کے کسی قول کا حوالہ ضرور دیتا۔ اور اندر ہی اندر وہ دینِ اسلام کا کٹر دشمن بھی تھا۔

لیکن کامریڈ موہن سنگھ بجلی بڑا مرنجاں مرنج سکھ تھا۔ جب امرتسر میں ۱۹۴۷ء کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھی پھر بھی کامریڈ بجلی کرفیو کھلنے کے بعد پارٹی کے دفتر کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ پارٹی کا دفتر مسلم اکثریت کے محلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہم نے اُسے کئی بار سمجھایا کہ وہ یوں کھلے بندوں نہ آیا کرے مگر اُس نے ہر بار مسکرا یہی کہا۔

"کامریڈ ـ مجھے مار کر کوئی کیا لے گا"

مگر لاہور اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر ماسٹر تارا سنگھ نے ننگی تلوار لہرا کر اعلان کر دیا تھا کہ سکھ پاکستان کبھی نہیں بننے دیں گے اور مسلمان ہر وقت پر پاکستان بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور امرتسر کے گلی کوچے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے تھرا رہے تھے۔ چنانچہ ایک روز کامریڈ موہن سنگھ بجلی پر حملہ ہو گیا۔ کامریڈ بجلی نے بڑی مشکل سے جان بچا کر پارٹی کے دفتر میں آ کر پناہ لی۔ اس کے بعد اُس نے ہال بازار میں دفتر کی طرف آنا بند کر دیا۔ موہن سنگھ بجلی محلہ بھیے والا کھوہ میں تاروں والے باغ کے سامنے ایک گلی میں رہتا تھا۔ یہ محلہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا۔ اس سے آگے جا کر چوک لوہگڑھ آتا تھا جہاں دروازہ لوہگڑھ کے آس پاس دو چار محلے مسلمانوں کے تھے۔

جو واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجلی نے سنایا اُس کا تعلق اگست ۱۹۴۷ء کے اواخر سے ہے۔ یہ بڑے آگ اور خون لتھڑے ہوئے دن تھے۔ کٹڑہ جیمل سنگھ چوک [illegible] سے لے کر پمپ والے بازار تک اور وہاں سے لے کر مسجد قاصداں تک سارے کا سارا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اُدھر بازار رامگڑھیاں، کٹڑہ کرم سنگھ، بازار سرائے رامداس، بازار جنگیاں، محلہ

ابواہیاں اور ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے اسی قسم کے دوسرے محلوں میں مسلمانوں کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ ضلع گورداسپور اور امرتسر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے تھے۔ ہندوستان نے مکانوں پر ترنگے لہرا دیئے تھے۔ وہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خالی مکانوں کو لُوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ ہندو محلوں سے مسلمان محلوں پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ امرتسر کے گلی کوچوں، بازاروں، پارکوں، باغوں اور نالوں میں پڑی ہوئی لاشوں کو گدھ اور کُتّے نوچ رہے تھے۔ مسلمان اپنا سب کچھ لُٹا کر مہاجر کیمپوں میں دم بخود بیٹھے شہر کی چار دیواری سے اُٹھتے سیاہ دھوئیں اور سرخ شعلوں کو تک رہے تھے۔ شریف پورہ کی مسلم آبادی کو مہاجر کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے باہر ہماری مشہور بلوچ رجمنٹ مشین گنیں لئے بیٹھی تھی۔ اُسے جی ٹی روڈ عبور کر کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ شہر میں گورکھا، ڈوگرہ اور سکھ رجمنٹوں کا راج تھا۔ سوائے ہمارے محلے کٹڑہ مہان سنگھ کے امرتسر کی ساری زخم خوردہ مسلم آبادی کیمپوں میں کوچ کر گئی تھی۔ کٹڑہ مہاں سنگھ کے مسلمان سمٹ سمٹا کر ہماری گلی کوچہ ڈنگراں میں آ گئے تھے اور ہم اُن ٹرکوں کا انتظار کر رہے تھے جو ہمیں اس گلی سے اٹھا کر شریف پورے کے کیمپ میں پہنچانے والے تھے۔ کرفیو کے گھٹنے اور رکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سوائے ہمارے محلے کے سارا امرتسر ہندو فوج کی تحویل میں تھا۔ اتنے بڑے شہر میں رہنے والی مسلم اکثریت کے مکانوں کو لُوٹ لُوٹ کر آگ لگا کر ہندو سکھ تھک چکے تھے۔ ہماری گلی کے منہ پر لوہے کا مضبوط دروازہ چڑھا دیا گیا تھا۔ پکی گلی، کیسری باغ، محلہ بکرو والاں، چوڑا کھوہ، پیلا ہسپتال اور کوچہ انگریزاں کے سارے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں پناہ لے چکے تھے۔ یہ لوگ ننگے سر، ننگے پاؤں اپنے مکانوں سے بھاگ گئے تھے۔ ہندو فوج نے دستی بموں اور سٹین گنوں سے ان کے گھروں پر حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے کسی کا سارا خاندان سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ تو کسی کے جوان بچے کے سینے میں گولی ماری گئی تھی۔ کوئی بچہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا تو کوئی اپنے شہید ہو چکے باپ کو رو رو کر آوازیں دے رہا تھا۔ پاکستان ٹائمز کے مشہور آرٹسٹ اور پاکستان کے نامور باکسر محمود بٹ کا بڑا بھائی حامد بٹ میرا کلاس فیلو تھا۔ اونچا لمبا جوان خوبصورت اور ہاکی کا بہترین کھلاڑی۔ اُس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ جب ہندو فوجیوں نے اُن کے محلے پر حملہ کیا تو اُس نے ایک پل کے لئے

کھڑکی کی چق اٹھا کر باہر دیکھا۔ سنتری نات سنتری کی ایک گولی اُس کی گردن پر آ کر لگی اور وہ وہیں شہید ہو گیا۔ اُس ہنگام قیامت میں غم نصیب گھر والے حامد کی لاش بھی اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ حامد بٹ اگر زندہ رہتا تو آج ہماری قومی ہاکی ٹیم کے اہم ستونوں میں سے ہوتا۔

پیر احمد شاہ کشمیری گڑیل جوان تھا۔ سرخ و سپید رنگت۔ چہرے پر شرعی داڑھی مونچھ۔ پانچ وقت کا نمازی۔ پرہیز گار۔ نیک سیرت ــــ اور خوب صورت ــــ ہماری گلی سے یہ پتہ کرنے نکلا کہ کوچہ رنگریزاں کے سارے مسلمان آ گئے ہیں یا نہیں۔ درباری پنساری کی دکان کے سامنے چوک میں ہندو تھانیدار مہتہ نے اُسے گولی مار کر شہید کر دیا۔ اُس کی لاش بھی وہیں پڑی رہی۔ یہ آنکھیں کس کس مسلمان کی شہادت پر اشکبار ہوں! یہ سینہ کس کس کے ماتم میں خوں چکاں ہو! ہزاروں ماؤں کے لعل مشرقی پنجاب کے شہروں میں بے گور و کفن رہ گئے۔ جن بھائیوں کو اُن کی بہنوں نے سہرے باندھنے تھے انہیں کفن بھی نصیب نہ ہو سکے۔ بے شک ہم نے پاکستان اپنے پیاروں کا خون دے کر حاصل کیا ہے اور اپنی جانیں دے کر بھی اِس کی حفاظت کریں گے۔

امرتسر آگ اور خون میں نہا رہا تھا۔ فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں فضا میں گلی سڑی لاشوں اور جلے ہوئے مکانوں کی بُو تھی۔ ویران سڑکوں پر راتوں کو کُتّے روتے رہتے۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا دور دورہ تھا کہ کامریڈ موہن سنگھ بکلی مجھ سے ملنے میرے محلے میں آیا۔ میں گلی کے کونے والے مکان میں کھڑکی کے ساتھ لگا پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے آہنی جنگلے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا کہ کامریڈ بکلی ایک پولیس جیپ سے نیچے اترا اور گلی کے آہنی دروازے کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹانے لگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مٹیالی پھیکی دھواں آلود دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے بکلی کو دیکھ کر اوپر سے آواز دی۔

"کامریڈ بکلی! کس لئے آئے ہو؟"

مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ شاید وہ ہندو سکھ پولیس کو ساتھ لے کر ہمارے محلے پر حملہ کرانے آیا ہے۔ میں نے سوچا اگر ایسی بات ہوئی تو میں اوپر ہی سے بندوق کا فائر کر کے اُسے ڈھیر کر دوں گا۔ میری آواز پر کامریڈ بکلی نے چہرہ اوپر اٹھا کر ہاتھ سے عینک درست کی اور بولا۔

"کامریڈ! نیچے آؤ۔ مجھے تمہیں ایک امانت دینی ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کونسی امانت؟ کس کی امانت کامریڈ بجلی؟"

بجلی بولا۔

"تم نیچے آؤ۔ میں تمہیں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ تم فوج کو لے کر ہمارے محلے میں کیوں آئے ہو؟"

اتنا سُن کر کامریڈ بجلی نے پولیس سے کہا کہ وہ جیپ لے کر کوتوالی چلے جائیں وہ اپنے آپ وہاں پہنچ جائے گا۔ جیپ وہاں سے چلی گئی۔ اب بجلی محلے میں اکیلا رہ گیا۔ سامنے دکانیں ٹوٹی پڑی تھیں اور اُن کا سامان باہر بکھرا ہوا تھا۔ ذرا دُور چوک میں ایک بیل کی پھُولی ہوئی لاش مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بجلی اوپر منہ کر کے کہنے لگا۔

"کامریڈ! میں اب بالکل نہتا اور اکیلا ہوں۔ اب تو نیچے آجاؤ یا مجھے اپنے پاس اوپر بلا لو۔ واہگورو کی قسم! مجھے ایک ضروری امانت تمہیں دینی ہے۔"

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس مکان میں اکیلا ہی بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا۔ پہرہ کیا تھا بس اتنی ہی ڈیوٹی پر تھا کہ اگر ہندو فوجی حملہ کرنے آتا دیکھوں تو فوراً اطلاع کر دوں تاکہ گلی کے مسلمان وہاں سے بھاگ کر شریف پورے والے کیمپ میں پہنچ جائیں۔ اس مکان کا ایک دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا اور بجلی بازار میں کھڑا تھا۔ خدا جانے کیوں مجھے کامریڈ بجلی کی بات پر اعتبار آگیا پھر بھی میں نے محلے کے مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کیا۔ میں نے چوبارے کے اوپر والے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا اور سیڑھیاں اتر کر بازار والے دروازے پر آ کر رک گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کی کنڈی کھول دی۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا رُخ اگرچہ براہِ راست بجلی کی طرف نہیں تھا لیکن وہ میرے نشانے کی زد سے باہر بھی نہیں تھا۔

"کونسی امانت ہے کامریڈ بجلی؟"

موہن سنگھ بجلی کا چہرہ اترا ہوا تھا اور داڑھی کے بالوں میں ہلکی ہلکی پڑی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ جیسے اُسے بندوق کا ذرہ برابر بھی خوف نہ ہو۔ میرے پاس آکر بولا۔

"کامریڈ! یہاں سیڑھیوں میں بیٹھ کر ہی مجھ سے دو چار باتیں سُن لو اور پھر اپنی امانت لے لو۔ واہگورو کی کرپا ہے کہ تم مل گئے ورنہ یہ بوجھ جانے کتنی دیر مجھ پر رہتا۔"

ہم دونوں سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں کوئی چیز رومال میں لپٹی ہوئی تھی جسے اُس نے اپنی صدری کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ رنگ اُس کا بھی اڑا ہوا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ سلاخ دار روشندان میں سے مٹیالی فساد زدہ دھوپ کی ہلکی ہلکی روشنی اور نہال سنگھ کی جلی ہوئی دکان میں سے گندے بیروزے کی بُو اندر آ رہی تھی۔ موہن سنگھ بجلی نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جلدی جلدی جو دردناک واقعہ مجھے سنایا اُسے میں آج آپ کو اپنی زبانی سناتا ہوں۔

جس روز کامریڈ موہن سنگھ بجلی پولیس کی جیپ میں بیٹھ کر مجھ سے ملنے آیا یہ اُس سے ایک روز پہلے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں موہن سنگھ بجے والا کھوہ میں رہتا تھا جو کہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا اور ۱۵ اگست کے بعد تو ان علاقوں میں کسی مسلمان کے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان علاقوں سے مسلمانوں کی ساری آبادی دانہ گنج اور رگھو برج کی جانب سے نکل کر مہاجر کیمپوں یا ریفوجی ٹرینوں میں بیٹھ کر پاکستان کی طرف کُوچ کر چکی تھی۔ ان مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے ویران محلوں میں ہندو سکھ لوٹ مار میں مصروف تھے۔ وہ مکانوں کو لوٹ لوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ امرتسر کا مشہور پنجابی شاعر اور ادبی محفلوں کی جانِ جہاں چاچا عیسیٰ اسی علاقے میں شہید ہوا۔ وہ ہندوؤں کی بنائی امن کمیٹی کے ارکان کے ساتھ امن کی بات چیت کرنے گیا کہ اُسے گولی مار دی گئی۔ ہم نے اُس کی لاش حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ ایک بھنگی نے ہمیں ترک ہوٹل میں آکر بتایا کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے چاچا عیسیٰ کو گولی کھا کر گرتے دیکھا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اب ان ویران وہشت زدہ گلی کوچوں میں ہندو سکھ غنڈے فوج اور پولیس کے ساتھ مل کر دندناتے پھرتے تھے۔ کہیں جل بجھے مکان سُلگ رہے تھے اور کہیں تازہ لگی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ مسجدوں کے منبر توڑ کر ہندوؤں نے وہاں مورتیاں لا کر رکھ دی تھیں اور دروازوں پر گیرا مٹی سے "اوم" لکھ دیا تھا۔ موہن سنگھ بجلی کے بیان کے مطابق وہ شام کے وقت کرفیو لگنے سے کچھ دیر پہلے گول باغ کی طرف سے ہاتھی گیٹ کی جانب آ رہا تھا کہ سیتلا مندر کے پاس اُسے اُس علاقے کی نام نہاد امن کمیٹی کا چیئرمین بلرام مل گیا۔ بلرام کبھی کبھی پارٹی کے دفتر میں بھی آیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جھک کر ملتا۔ بڑا انکسار دکھاتا ——— اُس روز بلرام نے شراب پی رکھی تھی اور وہ موہن سنگھ بجلی کو زبردستی اپنے ساتھ سیتلا مندر کے پچھواڑے تالاب کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی کوٹھڑیوں میں سے ایک کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہاں بلرام کے چھ سات ہندو دوست شراب پی رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ موہن سنگھ ان سب کو جانتا تھا۔ اُس نے بہت کہا کہ اُسے گھر جانا ہے۔ کرفیو کا وقت ہو رہا ہے لیکن کسی نے ایک نہ سُنی۔ بلرام نے شراب کا گلاس اٹھا کر کہا۔

"بجلی! کونسا کرفیو؟ کیسا کرفیو؟ امرتسر میں اب ہمارا راج ہے۔ آج ہم تمہیں سورگ کی سیر کرائیں گے" اور قہقہہ لگا کر وہ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اب موہن سنگھ بجلی کو علم ہوا کہ ان ہندوؤں نے شہر کے اندر سے کسی مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے اور شراب ختم کرنے کے بعد اُسے اپنی بربریت اور وحشت کا نشانہ بنانے والے ہیں۔ موہن سنگھ بجلی کا کہنا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ خدا جانے وہ کس شریف باپ کی بیٹی تھی اور یہ لوگ اُسے اٹھا لائے تھے۔ موہن سنگھ نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اُس لڑکی کو ان درندوں سے ضرور بچائے گا۔ مگر بلرام اور اُس کے غنڈے دوستوں کی آنکھیں شراب پی کر خونی ہو رہی تھیں۔ یہ بھوکے بھیڑیوں کے جبڑوں سے اس کا تر نوالہ چھیننے والی بات تھی۔ پھر بھی موہن سنگھ بجلی کہتا ہے کہ میں نے اُس بے کس و مجبور مسلمان بیٹی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے حصول کے لئے خود بھی بلرام کے ساتھیوں کی ہاؤ ہو میں شریک ہو گیا ایک ہندو غنڈہ تھوک کر اُسے پاؤں سے مسل کر بولا۔

"میں مسلمانوں کو یوں ہی مسل دوں گا۔ ہا ہا ہا۔ بلرام! چلو اُس مُسلی (مسلمان عورت) کے پاس چلو۔ سالی کو اب ہوش آ گیا ہو گا۔"

دوسرا بولا۔

"ٹھیرا تا جی! میری مانو۔ اس نے بے ہوشی کا بہانہ بنایا ہے۔"

بلرام اپنے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے جھکولے کھا رہا تھا۔

"بس ——— چپ رہ رام مورتی! ان مسلمانوں کی عورتوں کو ہم الٹا لٹکا دیں گے۔ کیا سمجھتا ہے؟"

"ہاں جی! وہ سالی سب ہند نہیں کہہ رہی تھی۔"

موہن سنگھ نے پوچھا۔

"کیا کہتی تھی وہ؟"

بلرام میز پر مکا مارتے ہوئے چیخا۔

"کہتی تھی پاکستان زندہ باد ——— بس۔ بس ——— مزا چکھا دوں گا۔ مزا چکھا دوں گا۔"

پھر یہ موہن سنگھ کہتا ہے کہ میں نے موقع غنیمت جان کر بلرام سے کہا۔

"یار بل! میں جا کر اس مسلمان عورت سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کس طرح سے ہند نہیں کہتی۔ اور فکر نہ کرو۔ میں اُسے راضی بھی کر لوں گا۔"

موہن سنگھ نے آنکھ ماری جس پر بلرام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ سارے ہندو غنڈوں نے موہن سنگھ کی بات کو پسند کیا۔ رام مورتی بولا۔

"ہاں جی! موہن سنگھ کو بھیج دو۔ بوڑھا آدمی ہے۔ اس کی بات وہ مُسلی مان جائے گی۔"

چنانچہ موہن سنگھ بجلی ساتھ والی کوٹھڑی کا تالا کھول کر اندر آ گیا۔ اندر طاق میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ اندر گوبر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر ایک لڑکی پڑی تھی۔ دیئے کی دھیمی روشنی میں موہن سنگھ نے دیکھا کہ اُس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے

تھے۔ بال یوں کھلے تھے جیسے کسی نے زبردستی نوچے ہوں۔ وہ بمشکل اٹھارہ سترہ برس کی زرد سی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ موہن سنگھ اُس مسلمان لڑکی کے قریب گیا تو اُس نے تڑپ کر گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ مسلمان لڑکی کی آنکھوں میں خونخوار چیتے کی چمک تھی۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے گرج کر کہا۔

"خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔"

موہن سنگھ بجلی کہتا ہے کہ میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ بلکہ میں تمہیں ان درندوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تیرے لئے کیا کروں۔ وہ لوگ شرابیں پی رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ اگر میں نے تمہیں یہاں سے بھگا دیا تو وہ میرے ساتھ تمہاری بھی تکا بوٹی کر دیں گے۔ اور پھر اگر تو یہاں سے بھاگ کر نکل بھی تو کسی دوسرے ہندو غنڈے یا ہندو سپاہی کے ہاتھ آجائے گی۔ مسلمان لڑکی نے جب موہن سنگھ کے منہ سے بیٹی کا لفظ سُنا تو اسے ذرا حوصلہ ہوا۔ ایک پل کے لیئے اُس نے موہن سنگھ کو غور سے دیکھا اور پھر اچانک گلے میں سے ایک موٹا سا تعویذ نکال کر اُسے دیتی ہوئی بولی۔

"میری یہ امانت اپنے پاس رکھ لیں اور کسی بھی مسلمان کو دے دیں۔ میرا نام رضیہ بانو ہے۔ میں ایم اے او گرلز ہائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ہندوؤں نے میرے دونوں بھائیوں اور ابا جان اور امی جان کو میرے سامنے شہید کر دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔ ان ہندوؤں سے جا کر کہہ دیں کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو اپنی عزت جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔"

بقول موہن سنگھ بجلی اُس مسلمان لڑکی نے اچانک موہن سنگھ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور موٹا تعویذ اُسے دے کر چشم زدن میں موہن سنگھ کی کرپان نیام سے کھینچی اور دیکھتے دیکھتے اُسے اپنے دل میں اتار لیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ مسلمان لڑکی ایک ہلکی سی سسکی بھر کر چارپائی پر گر پڑی۔ موہن سنگھ ایک پل کے لئے تو پتھر سا ہو کر رہ گیا۔ لڑکی کے سینے سے خون جاری تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔ پھر اُس نے شور مچا دیا۔ ساتھ والی کوٹھڑی سے سارے

ہندو غنڈے سے لڑکھڑاتے گرتے پڑتے اندر آگئے اُس وقت تک وہ مسلمان لڑکی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ موہن سنگھ نے کہا۔

"اس نے میری کرپان سے خودکشی کر لی۔ میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اس نے میری کرپان کھینچ کر دل میں گھونپ لی۔"

ہندو غنڈوں نے وحشی ہو کر بھڑکیں ماریں اور بلرام نے کہا۔

"مر گئی ہے تو مرنے دو۔ ہم کوئی دوسری لڑکی اٹھا لائیں گے۔ رام مورتی! چلو۔۔۔۔ چلو یارو۔۔۔۔ کوئی دوسری عورت اٹھا لاتے ہیں۔ مسلی نہیں تو ہندو عورت ہی سہی ہا ہا ہا۔"

اور وہ سارے شرابی شور مچاتے، بھڑکیں مارتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ موہن سنگھ اُس مسلمان لڑکی کی لاش کے پاس اکیلا رہ گیا۔ بقول موہن سنگھ اس لڑکی کی لاش کے چہرے پر ایک عجیب سکون اور نور تھا۔ دیئے کی دھیمی روشنی میں خون آلود کپڑوں میں اُس کا سفید چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے گلاب کے پھولوں میں موتیئے کا سفید گجرا پڑا ہو۔ موہن سنگھ بجلی کتنی ہی دیر رضیہ بانو کی لاش کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"کامریڈ! ایک مسلمان لڑکی اتنی غیرت مند بھی ہو سکتی ہے۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ سچ کہتا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس کا دیا ہوا تعویذ میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں کتنی ہی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ شہر کی جانب سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آجاتی تھی۔ پھر میں نے اُس بہادر مسلمان بچی کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور باہر لے آیا۔"

سیتلا مندر والے تالاب کے عقب میں کچا میدان ہے جو ذرا فقدر فتح شاہ بخاری ؒ اور حضرت شکر شاہ ؒ کے مزار تک چلا گیا ہے۔ یہاں کہیں کہیں کیکروں کے جھنڈ ہیں۔ موہن سنگھ بجلی نے انہی کیکروں کے ایک جھنڈ میں زمین میں گڑھا کھودا اور رضیہ بانو کی لاش کو دفن کر دیا۔۔۔ موہن سنگھ بجلی کہنے لگا۔

"کامریڈ! مجھے مسلمانوں کی طرح فاتحہ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے رب سے کہا تھا کہ اے سب کے پالنہار! اس غیرت مند مسلمان بچی کی آتما کو شانتی

دے ــــ"

میں سیڑھیوں میں دم بخود بیٹھا تھا۔ موہن سنگھ بجلی نے رضیہ بانو کی امانت وہ تعویذ میرے حوالے کیا اور خشک سی آواز میں بولا۔

"کامریڈ! یہ بچی جہاں دفن ہے وہاں میں اُس کی قبر نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے ہندو اُسے ڈھا دیں گے۔ میں وہاں مسلمانوں کے رواج کے مطابق جمعرات کو دیا بھی نہ جلا سکوں گا۔ اُس پر پھول بھی نہ ڈال سکوں گا۔ لیکن کامریڈ! یقین کرو میں جب تک زندہ رہا، ہر جمعرات کو وہاں آکر اپنے آنسوؤں کے پھول ارپن کرتا رہوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں میں نے اُس بچی کی امانت تجھے دے دی ہے اب میرے دل سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ کسی مسلمان کو یہ تعویذ دے دینا۔ شہر میں کوئی مسلمان نہیں رہا تھا۔ میں نے سُنا کہ تمہارے محلے میں مسلمان ابھی ہیں۔ چنانچہ میں تمہارے پاس آگیا۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ میں جاتا ہوں۔ کوتوالی میں سپاہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اِس کے ساتھ کامریڈ بجلی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دبایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر رضیہ بانو شہید کا تعویذ ہاتھوں میں لئے سیڑھیوں میں بیٹھا رہا۔ کامریڈ بجلی کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اچانک بازار میں فائر کی آواز آئی۔ میں چونکا۔ جلدی سے دروازے کو اندر سے تالا لگایا اور چوبارے میں آگیا۔ جنگلے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک فوجی ٹرک چوک میں کھڑا تھا اور سکھ ہندو فوجی چھلانگیں لگا کر نیچے کود رہے تھے۔ میں چشم زدن میں سیڑھیاں اُتر کر گلی میں آگیا اور محلے والوں کو ہندو فوجیوں کی آمد خبر سنائی ـــ اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گلی کا آہنی دروازہ ایک طرف سے جھک گیا۔ اِس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور لوگوں نے گلی کی دوسری جانب لال حویلی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا پیچھے ایک اور دھماکہ ہوا۔ اب آہنی گیٹ ایک طرف سے اکھڑ چکا تھا اور ہندو سکھ غنڈے تلواریں اور برچھیاں لئے اچھلتے کودتے شور مچاتے گلی میں آگئے تھے۔ لیکن اس وقت گلی میں سوائے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے گھریلو سامان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گلی کے سارے مسلمان لال حویلی اور گوجروں کے ویڑے میں سے گزر کر پاتھی گرونڈ

کے ساتھ والی دیوار سے ہوتے شریف پورے والے مہاجر کیمپ کے قریب پہنچ چکے تھے اور کیمپ میں متعین بلوچ رجمنٹ کے جوان اُن کے عقب میں کور فائرنگ کر رہے تھے۔ شریف پورے پہنچ کر میں ایک تھڑے پر بیٹھ گیا اور جیب میں سے رضیہ بانو شہید کے تعویذ کو نکال کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بٹوہ نما تعویذ تھا۔ میں نے اُس کا بٹن کھولا تو اندر بادامی رنگ کا خستہ سا کاغذ نکلا جس پر قلم اور سیاہ روشنائی سے پوری سورہ فاتحہ لکھی ہوئی تھی میں نے اُس مقدس امانت کو اپنی آنکھوں کے ساتھ لگایا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میری آنکھوں میں "فتح شاہ بخاری" کے میدان والے لیکروں کا وہ جھنڈ پھر گیا جہاں اسلام کی ایک غیور بیٹی دفن تھی اور جس کی کوئی قبر نہ تھی۔ جہاں کبھی کوئی دیا نہیں جلے گا۔ جہاں کبھی کوئی پھول نہیں ڈالے گا ـــ لیکن رضیہ بانو کبھی نہیں مر سکتی۔ اُس نے اپنی لاکھوں بہنوں، بھائیوں اور بیٹوں کے خون سے اُس باجبروت قلعے کی بنیادیں استوار کی ہیں جس کی چوٹی پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔ زندہ باد! رضیہ بانو!

امرتسر کے دانشور

امرتسر میں جو مسلمان آباد تھے۔ یہ شہر ان کی وجہ سے علم و دانش کا گہوارہ تھا۔ پتنگ بازی، شعر بازی، کرکٹ میچ، دنگل، مشاعرے، ادبی مذاکرے اور علمی مناظرے، سیاسی ہنگامے اور دینی گرم جوشی یہ ساری گہما گہمی اور رستاخیزی ان امرتسری مسلمانوں کے دم قدم سے تھی جو امرتسری تہذیب، امرتسری کلچر اور امرتسری ثقافت کے نقیب تھے۔ امرتسری تہذیب پر زیادہ اثر کشمیری کلچر کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آباد امرتسری گھرانوں میں آج بھی سبز چائے کے تو امرتسر وہ امرتسر نہ رہا۔ امرتسر شہر کی محفل سے شمع اٹھ گئی اور بزم میں اندھیرا چھا گیا۔ بیس پچیس سال کی مدت میں امرتسر کے ہندو سکھ بڑی مشکل سے ایک چنچل نام کا ہندو لوک گویا ہی پیدا کر سکے۔ جس کی آواز زنانہ بے سُری ہے اور جس کا گانا سن کر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں کی ہجرت کے بعد امرتسر بیوہ ہو گیا۔ روح پاکستان میں آگئی۔ اور مردہ جسم امرتسر کے کمپنی باغ میں پڑا رہ گیا۔

جب اس شہر کا سہاگ سلامت تھا تو یہاں بڑے بڑے نابغہ روزگار رہا کرتے تھے۔ جن میں سے کچھ تو پاکستان چلے گئے۔ کچھ وہیں امرتسر کی خاک میں سما گئے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے کہ جنہیں امرتسر کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ میں یہاں صرف ان اصحاب کا ذکر کروں گا جن سے میں ملا۔ جن کو میں نے قریب سے دیکھا اور جن کی مجلس میں بیٹھنے کی مجھے سعادت ملی۔ یہ لوگ علم و ادب کے سمندر تھے۔ لیکن دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اپنے عہد کے سورج تھے۔ لیکن صبح کو ایک کنوئیں سے طلوع ہوتے تھے اور شام کو دوسرے کنوئیں میں غروب ہو جاتے تھے۔

حکیم فیروز الدین طغرائی بھی امرتسر کے ایک مہر تاباں تھے۔ ان کے بارے میں علامہ اقبال نے ایک محفل میں کہا تھا کہ طغرائی ایک ایسا کنواں ہے جس پر رہٹ نہیں لگ سکا۔ افسوس کہ میں نہ تو مسلم

امرتسر کے اس عظیم شاعر سے شرف ملاقات حاصل کر سکا اور نہ امرتسر میں وہ مکان ہی دیکھ سکا جہاں طغرائی صاحب رہا کرتے تھے۔ صوفی تبسم صاحب ان کے شاگردوں میں سے تھے اور مجھے اکثر پاکستان میں ان کی باتیں اور فارسی اشعار سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے طغرائی کا فارسی دیوان بھی چھاپا مگر خدا جانے پھر وہ کہاں غائب ہو گیا۔ اصل میں طغرائی صاحب جس محلے میں رہتے تھے۔ وہ ہمارے محلے سے بہت دور تھا۔ امرتسر کا کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس ہمارے محلے میں تھا ایک کا نام ترک ہوٹل تھا اور دوسرا تھا کامریڈ ہوٹل۔ ہال بازار کے ایک بغل بازار میں مارکیٹ حاکم سنگھ تھی۔ یہ دونوں ہوٹل اس تنگ سی گلی میں آمنے سامنے تھے۔ ہوٹل کیا تھے بس چائے خانے تھے۔ انگیٹھیوں پر نیلی نیلی چینکیں تھیں اور اندر ملیں میزیں اور پرانی کرسیاں اور بنچ۔

کامریڈ ہوٹل میں ایک معمر بزرگ اکثر آ کر حکیم طغرائی کے اشعار سنایا کرتے ان کا رنگ کالا تھا۔ بے حد دبلے پتلے تھے اور گاتے گاتے ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے جنہیں وہ سفید پگڑی کے پلو سے پونچھ لیتے اور پھر چائے کی پیالی پر جھک جاتے اور گم ہو جاتے۔ ہماری عمر چھوٹی تھی۔ اتنا شعور نہیں تھا کہ طغرائی کی شاعرانہ عظمت کا ادراک کر سکتے اور ان کی مجلس کی طرف کھچے چلے جاتے۔ حکیم صاحب کے بارے میں صوفی تبسم بہت کچھ لکھ سکتے تھے اور میں نے ایک دو بار انہیں گزارش بھی کی تھی لیکن صوفی صاحب بے حد مصروف انسان تھے۔ اب میرے خیال میں اگر لاہور میں کوئی شخصیت طغرائی کے بارے میں کچھ کر سکتی ہے تو وہ عرشی صاحب ہیں۔ میں ان سے شرف ملاقات حاصل، نہیں کر سکا لیکن غائبانہ ان کے تبحر علمی کا مداح ہوں۔ اگر انہوں نے بھی طغرائی صاحب پر کچھ نہ لکھا تو پھر شاید امرتسر کا یہ عظیم شاعر، مہر تاباں حکیم فیروز الدین طغرائی گمنامی کے کنوئیں میں اتر کر وقت کے پاتال میں گم ہو جائے۔

حکیم طغرائی کی روایت عرفی اور بیدل کی روایت تھی لیکن اب میں امرتسر کی ایک ایسی شخصیت کا ذکر کرنے والا ہوں۔ جنہوں نے انشاء اللہ خان انشا کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کا نام غلام احمد تھا اور آغا حشر کاشمیری کے نام سے علم و شعر کی دنیا میں جانے جاتے۔ سرخ و سپید رنگ، میانہ قد، بھرا بھرا جسم ہٹلر ٹائپ کی مونچھیں، آواز تیز تھی۔ چہرے پر ہر وقت طنزیہ سی مسکراہٹ رہتی پیچھے سے کوئی آواز دیتا تو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے۔ ساتھ والے سے پوچھتے۔ کون ہے پیچھے؟

چال میں بڑا ضبط تھا۔ چلتے وقت کوئی فالتو حرکت نہیں کرتے تھے۔ کسی وقت لگتا کہ دبے پاؤں چل رہے ہیں۔ زیادہ سلام دعا لینے کے عادی نہیں تھے۔ ہاتھ ملانے سے گریز کرتے تھے لاہریڈ ہوٹل کے کونے میں اگر بیٹھ جاتے اور ارد گرد بیٹھے ہوؤں سے بے نیاز باہر سے آنے جانے والوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتے۔ چہرے پر وہی طنزیہ مسکراہٹ ہوتی جو چہرے کی ایک مستقل حالت بن چکی تھی۔ کوئی بات کرتا تو اس کا جواب باہر تکتے ہوئے ہی دیتے سوال کرنے والے کی طرف بہت کم دیکھنا گوارہ کرتے۔ آنکھوں میں ایک چمک تھی جو کسی وقت دھندلی ہو جاتی بھنویں اور پلکیں گنجان تھیں۔ سوال آپ نے کیا ہے تو وہ جواب میری طرف دیکھ کر دیتے تھے۔ جون کی دوپہر میں وہ کمپنی باغ کی بجائے امرودوں کے باغ کی سیر کرنے نکل جاتے اور امرود کی ٹہنی ہاتھ میں تھامے واپس آتے کپڑے بڑے صاف ستھرے پہنتے۔

بہت کم بات کرتے تھے لیکن اگر کسی نے کہہ دیا کہ غالب بڑا شاعر ہے تو جب تک اسے جھوٹا ثابت نہ کر لیتے۔ دم نہیں لیتے تھے۔ غالب ہی کے اشعار کی ایسی ایسی تشریح کرتے کہ محفل میں بیٹھا ہر شخص سوچ میں پڑ جاتا کہ غالب نے یہ کیا کہہ دیا!

اس کے ساتھ ہی عروض، قافیہ، منطق، ہندسہ، نجوم، ہیئت، طب، فلسفہ، شعر اور معقولات و منقولات کا سمندر بہنے لگتا۔ علم و حکمت کے پیچیدہ سے پیچیدہ نکتے پر خلش کاشمیری گھنٹوں بولتے چلے جاتے۔

لمبی سے لمبی اور مشکل سے مشکل بحر کی تقطیع آغا خلش کاشمیری ایک سیکنڈ میں کر دیتے ساتھ ہی علم عروض پر خیالات کا دھارا بہہ نکلتا۔ بات عروض سے چل کر علم موسیقی کے مجذوبانہ میں پہنچ جاتی۔ پھر فلسفہ، اخلاق اور طب اکبر موضوع بحث بن جاتے۔ خلش صاحب بے تکان اور منطقی اردو میں بولتے جا رہے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں ہوں یا آواز میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ خیال سے خیال نکل رہا ہے دلیل سے دلیل روشن ہو رہی ہے۔ ایک موضوع دوسرے موضوع میں جذب ہوتا جا رہا ہے۔ خلش صاحب کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ بالکل گلنار۔ آنکھوں میں جذب کی کیفیت آ گئی ہے۔ شمع آغا خلش کاشمیری کے سامنے ہے اور علم کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ آج یہ روشنی ہمارے درمیان نہیں ہے مگر شمع ضرور جل رہی ہے اور اس کی روشنی ہماری زمین سے آگے نکل گئی ہے۔ علم کی شمع کبھی نہیں بجھتی۔ علم کا سفر سات آسمانوں میں بھی جاری رہتا ہے۔

صوفی ترک ہوٹل میں یارانِ ادب کی محفل سجی تھی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ کریون اے اور پاسنگ شو کے سگرٹوں کی ڈبیاں کھلی تھیں۔ تھالی میں بنارسی پان سجے ہوئے تھے۔ آغا خلش کاشمیری حسب عادت خاموش بیٹھے اہلِ مجلس سے بے نیاز ہوٹل میں آنے جانے والوں کو ٹکٹکی باندھے تک رہے تھے کہ اچانک پنجابی کے ایک شاعر داخل ہوئے جو دھوبی کا دھندا کرتے تھے۔ خلش صاحب نے شاعر کو دیکھا تو اچانک پنجابی کا یہ بند پڑھنا شروع کر دیا۔

تھد دھوبیاں دیا سبحان اللہ
ایدھر دال پتھے اودھر گھنڈ پئے گئی
تن سیر روپئے دے چاول آئے
پنج سیر کی آٹے گھنڈ پئے گئی
عیسیٰ مرگئے کہا ورتاون لگا
جدھر گھنڈ گئی اودھر ڈانڈ پئے گئی

یہ شعر آغا صاحب نے اس وقت برجستہ کہے تھے اور تخلص امرتسر کے ایک مشہور و معروف پنجابی شاعر نادم عیسیٰ کا دے دیا تھا یعنی ظاہر یہ کیا کہ یہ اشعار چاچا عیسیٰ نے دھوبی برادری کے خلاف کہے ہیں تو دھوبی شاعر نے خلش صاحب سے پوچھا۔

”استاد جی! ہم نے چاچا عیسیٰ کو کب اپنی شادی میں بلایا تھا۔؟“

خلش صاحب بولے۔ بلایا ہوگا تو اس نے شعر کہے۔

تھوڑی دیر میں چاچا عیسیٰ بھی تشریف لے آئے۔ بس پھر کیا تھا۔ دونوں شاعروں کی وہ آپس میں جنگ ہوئی کہ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ اس دوران آغا صاحب کے چہرے پر دبی دبی سی طنزیہ ہنسی رہی۔ ایک بار بھی کھل کھلا کر نہیں ہنسے۔

آغا خلش کاشمیری کو برجستہ اور فی البدیہہ شعر کہنے میں کمال حاصل تھا۔ بس مطلع کہنے کی دیر ہوتی۔ اس کے بعد شعر پر شعر ہو رہا ہے۔ قافیے پر قافیہ بنتا چلا آ رہا ہے۔ قافیے ختم ہو جاتے تو خود بنانا شروع کر دیتے شعر کی زمین ختم ہو جاتی تو پانی میں اتر جاتے اور وہاں سے بھی شعر نکال لاتے۔ پچاس پچاس، سو سو شعر ایک نشست میں کہہ جاتے۔ مشکل گوئی پر اتر آتے تو ایسی ایسی دقیق ترکیبیں اور عربی کے مشکل الفاظ استعمال

کرنے کر سامعین منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ہجو، ہزل اور استہزائیہ ایسی لکھتے کہ حالب موڑ لگا جاتے۔ بیچ بیچ میں ہندی اور سنسکرت کے ایسے ایسے لفظ لاتے کہ معلوم ہوتا آسمان سے پتھر گر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کشمیری اور مرہٹی زبانوں کے لفظ بھی استعمال کر جاتے۔ ان کی ہجو سن کر سید انشا اور مصحفی کے معرکے یاد آجاتے تھے۔

آغا خلش کاشمیری امرتسر کے تھے لیکن ہماری ہوش میں ان کا قیام زیادہ تر بمبئی سے اکثر امرتسر آتے اور مہینہ مہینہ بھر یہاں رہتے اور صوفی ترک اور کاسریڈ ہوٹل میں صبح سے رات گئے تک علم و ادب کی محفل گرم رہا کرتی۔ اپنے ہند سالے میں وہ کسی نہ کسی علمی ادبی شخصیت سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ ایک بار سیماب اکبر آبادی سے ایسا زبردست معرکہ ہوا کہ بات شعر و شاعری سے نکل کر پتھر اور دھات کے زمانے تک جا پہنچی۔ ضبط قریشی مقیم راولپنڈی آغا صاحب کے ہونہار اور قابل قدر شاگردوں میں سے ہیں۔ ایک بار میں ان کے ساتھ آغا صاحب کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ بیٹھک میں صوفے پر بیٹھے برف کے ساتھ کچھ کھا رہے ہیں برف توڑ کر پیالے میں رکھی تھی اور بائیں ہاتھ میں وہ کچھ تھے۔ ہمارے استفسار پر آغا صاحب نے معدے کی ساخت، برودت صفرا کے اخراج۔ اور اس کے مزاج پر ایک زوردار لکچر دیا۔ ایک بار کیلا چھلکے سمیت کھا گئے۔ کہنے لگے۔

"میرا مزاج دھوبی ہے جو لیمی اعتبار سے تمام مزاجوں کا بادشاہ ہے۔"

آغا خلش کاشمیری خود بھی امرتسر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ لیکن ایک بار میں نے ان کے سر پر تاج بھی دیکھا۔ یہ تاج روایتی بادشاہوں کا تاج نہیں تھا بلکہ بارہ سنگھے کا سر تھا۔ الیگزانڈرہ پارک میں ایم اے او کلب اور ہندو جم خانہ کے درمیان بڑے معرکے کے کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے خلش صاحب نے اپنے محلے حسین پورے میں نوجوانوں کا ایک گروہ بنا رکھا تھا جس کا نام بر جستہ تھا۔ ایک بار الیگزانڈرہ پارک میں ایم اے او کلب اور ہندو جم خانہ کے درمیان کرکٹ میچ ہوا۔ حیدر نے ساٹھ رنز بنائے تو انرول میں آغا خلش کاشمیری کا برجستہ نمودار ہوا۔ آغا صاحب نے بارہ سنگھے کا سر اپنے سر پر رکھا ہوا تھا، نوجوانوں کا گروہ پیچھے پیچھے تھا اور انہوں نے ساری گراؤنڈ کا چکر لگایا۔ وہ گا رہے تھے۔

حیدر نے جو ہٹ لگائی

گیند جا پیا رہیڑے

برجستے والیو دستو — میچ جتن گے کیہڑے ؟

اور پھر سب اونچی آواز میں کہتے "ایم اے او، ایم اے او" شب برات کے موقع پر برجستہ اصلاح معاشرہ کا جلوس بھی نکالا کرتا تھا۔ جلوس کے نوجوان آغا صاحب کی قیادت میں ٹیچ کورس کے سر انگ میں یہ شعر گاتے گلیوں کا چکر لگاتے۔

آ تا شا باشی نہ تو جالا

معلا تا اپاں تا تو گودا

(د آتش باشی نہ تو چلا۔ دولت اپنی نہ تو گنوا)

حسین پورے میں پہلا ریڈیو آغا خلش کاشمیری کے گھر آیا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم لگی تو محلے کے لوگ ان کی بیٹھک کے اندر اور باہر بیٹھ کر ریڈیو سنا کرتے تھے۔ جنگ کے دنوں میں ہی آغا صاحب بمبئی چلے گئے اور ہفتہ وار "مصور" کی ادارت سنبھال لی جسے مرتے دم تک نبھایا۔ پاکستان بن گیا۔ ایک بار قسبت روڈ پر ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے شاگرد رشید ضبط قریشی میرے ساتھ تھے۔ خلش صاحب کے بالوں میں سفیدی آنے لگی تھی۔ اس کے بعد پھر ان سے ملنا نہ ہوا۔ لوگوں کی زبانی سنا کہ بمبئی میں کسی عورت کو دل دے بیٹھے۔ شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ آغا صاحب نے دلہن کے لئے عروسی جوڑا بھی تیار کروا لیا لیکن خدا جانے پھر کیا ہوا کہ لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا۔ آغا صاحب نے غصے میں آکر دلہن کا عروسی جوڑا زیب تن کیا۔ سونے کے سارے زیور پہنے اور بمبئی کے بازاروں کا چکر لگانا شروع کر دیا غالباً ۱۹۷۰ء کے آخر یا ۱۹۷۱ء کے شروع میں کسی اخبار میں چھوٹی سی یہ خبر چھپی کہ بمبئی کے ایک خیراتی ہسپتال میں آغا خلش کاشمیری کا انتقال ہو گیا۔ جنازے میں فلم انڈسٹری کے دس بارہ افراد نے شرکت کی اور انہیں خاموشی سے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ سید انشاء اللہ خان انشاء کی روایت نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔

عینی خادم تلامی گنجوی زندہ ہوتے تو ضرور مرثیہ کہتے لیکن وہ تو اس سے کہیں پہلے امرتسر میں ہی کیٹی بناتے ہوئے ہندوؤں کے حملے میں شہید ہو گئے تھے ان پر کسی نے مرثیہ نہ کہا۔

کیا باغ و بہار شخصیت تھی چاچا میلے کی بھی۔ پنجابی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کی نعتیں تو آج بھی نعت خوانوں کو ازبر ہیں۔ صوفی ترک کے ہوٹل میں سبزہ کاہ سر پر رکھے کرسی پر پاؤں رکھے اکڑوں بیٹھے پان چباتے ہوئے فکر سخن کیا کرتے۔ عید میلاد کے جلوس میں ہر چوک میں کرسی پر کھڑے ہو جاتے اور اپنی تازہ کوئی نعت تحت اللفظ سناتے۔ امرتسر میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا تو ہندو مسلم فساد شروع

ہو گئے چچا میسی نے ایک امن کمیٹی بنائی جس میں ہندو بھی شریک تھے چچا اس کمیٹی کے صدر تھے۔ ایک روز ہندوؤں والے باغ یا شاید پیسے والا کھوہ کی طرف امن کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے اور پھر واپس نہ آ سکے۔ بعد میں ایک شخص نے ان کی لاش ہندوؤں کے محلے میں ایک دکان کے پھٹے کے نیچے سڑک پر پڑی ہوئی دیکھی تو آ کر بتایا کہ چچا میسی شہید ہو گئے ہیں۔

بابو غلام محمد بٹ، صوفی ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل کی محفلوں کی جان تھے، درمیانہ قد، بھاری بدن، سر کے بال سیدھے پیچھے کو جاتے ہوئے، کھلتا ہوا گندمی رنگ، پرجوش انداز میں بات کرتے اور دل کھول کر قہقہہ لگاتے، کوئی نہ کوئی منطق، فلسفہ، تنقید کی ادبی کتاب ہمیشہ بغل میں ہوتی، شعر و ادب، فلسفہ، تنقید، منطق کو درجنوں علوم پر گھنٹوں بحث کرتے اور کبھی نہ تھکتے۔ ہال بازار کی بغلی گلی میں ان کا قالینوں کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا چار پانچ کھڈیاں لگی تھیں۔ خود بہترین نقاش تھے اور ایسے ایسے پیچیدہ فن تیار کرتے کہ بڑے بڑے کاریگر دنگ رہ جاتے۔ ایک بار روسی ترکستان سے ایک قالین کا ٹکڑا آیا۔ جس پر روسی ادیب گورکی کی تصویر بنی تھی بابو غلام محمد نے اس تصویر کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔

" میں قائداعظم کی تصویر والا قالین بناؤں گا اور روسیوں کو بھیجوں گا، فن بنانا یہ ہم سے سیکھیں "

اور پھر انہوں نے روسی قالین کے فن کی کچھ ایسی دقیق قسم کی غلطیاں نکالیں کہ جنہیں ہم تو نہ سمجھ سکے لیکن ان کا منشی سن سن کر سر ہلا رہا تھا۔ بٹ صاحب نے اسی روز فن پر کام شروع کر دیا اور دو مہینوں میں قالین کا ٹکڑا تیار کروا لیا جس پر قائداعظم کی تصویر بنی ہوئی تھی پھر یہ قالین روسی ترکستان بھجوایا گیا وہاں سے تعریفی خط آیا تو بابو غلام محمد جیب میں ڈال کر ترک ہوٹل آ گئے وہاں دوستوں کی محفل لگی تھی بٹ صاحب نے خط نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

" قائداعظم نے اپنا لوہا روسیوں سے بھی منوا لیا۔ اسے پڑھو "

سگریٹ بٹ صاحب ہمیشہ مٹھی میں دبا کر پیتے تھے۔ چائے کے رسیا تھے اور مطالعہ کرتے وقت چائے اور سگریٹ ساتھ ساتھ پیتے جاتے تھے۔ شروع شروع میں ہیگل کے جدلیاتی فلسفے سے بہت متاثر تھے۔ جدلیات کا لفظ ان میں کئی بار استعمال کرتے۔ ان کے کارخانے کے کشمیری کاریگروں کو مہینے کی سات تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی اس روز سارے کاریگروں کو مہینے کی سات تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی اس روز سارے کاریگر جوا کھیلنے بیٹھ جاتے۔ جیتنے والے سینما دیکھنے چلے جاتے اور جو ہار جاتے وہ منہ لٹکائے بٹ صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک ہارے ہوئے کاریگر نے آ کر ان سے ایڈوانس مانگنے آ جاتے تھے ایک بار میں بٹ صاحب کے پاس ایڈوانس مانگا تو بابو غلام نے بند مٹھی میں سے سگریٹ کا زوردار کش کھینچ کر لیا۔

" تم لوگوں کا جدلیاتی نظام برباد ہو گیا ہے "

سگریٹ کی راکھ ہمیشہ چٹکی مار کر گراتے، ایسا کرتے ہوئے سگریٹ والی بند مٹھی کو نصف دائرے میں گھماتے دوستوں میں دل کھول کر خرچ کرتے، چائے کی جس محفل میں بابو غلام محمد بٹ بیٹھے ہوتے وہاں چائے، پان اور سگریٹوں کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹتا، ان کے تبحر علمی کا تمام احباب کو بڑا احترام تھا۔ جذباتی بھی بہت تھے۔ بحث کے دوران کبھی کبھی غصے میں بھی آ جاتے اور چہرہ سرخ ہو جاتا قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، طبیعت میں خودداری تھی لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر آئے تھے لیکن یہاں کسی کا زیر بار ہونا گوارا نہ کیا۔ بلڈرا ہیلس میں کچھ دیر کام کیا۔ پھر کراچی سے ایک ادبی ماہنامہ "ادب" کے نام سے نکالا۔ مجھے خط لکھ کر ایک مزاحیہ مضمون "قبر سے ایک خط" منگوایا۔ یہ پرچہ بھی نہ چل سکا۔ جب کبھی لاہور آتے تو ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی، پھر ایک روز سنا کہ بابو غلام محمد بٹ کا کراچی میں انتقال ہو گیا، یقین نہ آیا کہ وہ زندگی اور علم و حکمت سے بھرپور شخصیت کراچی کے قبرستان میں دفن ہو گئی ہے۔ جو شمعیں امرتسر کے دبستان میں روشن ہوئی تھیں وہ ایک ایک کر کے پاکستان میں آ کر بجھتی چلی جا رہی ہیں، وہ گلاب جنہیں امرتسر کی ٹھنڈی کھوئی کے پانی نے تروتازگی اور شادابی بخشی تھی یہاں آ کر مرجھاتے چلے گئے۔ آج وہ پھول نظر نہیں آتے، کبھی کبھی تنہائی شب کے ویران جھونکوں کے ساتھ ان کی خوشبو آ جاتی ہے۔ یادوں کی اندھیری رات میں ایک جگنو سا چمک کر بجھ جاتا ہے۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ پھولوں سے بھرا ہوا گلدان میز پر رکھ کر پیالیوں میں گولڈن چائے ڈالوں اور پھر کھڑے ہوئے امرتسر کے ان تمام دانشوروں کو اپنے سامنے بٹھا کر چائے کی پیالی پیش کروں اور سگریٹ سلگا کر کہوں۔

" اے پیارے لوگو! تم دور کیوں ہو؟ "

امرتسر کا ماسٹر نثار

اس وقت جب میں ایک "سٹرنگ کپ آف ٹی" پی کر ماسٹر نثار پر لکھنے بیٹھا ہوں تو میری گھڑی صبح کے ساڑھے پانچ بجا رہی ہے اور میرے کمرے کی کھلی کھڑکی میں سے باہر سکول کی گراؤنڈ کے شبنم آلود سبزے کی مہک، آنگن میں کھلے موتیے کی خوشبو کو ساتھ لے کر اندر آ رہی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ امرتسر میں اس وقت میں اور ماسٹر نثار تکیہ شیخ علی کے اکھاڑے میں صراحی دار امرودوں کے درختوں تلے لنگوٹیاں باندھ کر بیٹھے بدن پر تیل کی مالش کر رہے ہوتے تھے اور کمپنی باغ کو جاتی نہر کی جانب سے کھٹے کے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہوتی۔ ماسٹر نثار اور میں ہم عمر تھے، یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی عمریں ہوں گی، مگر وہ بڑا کمزور تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ پتلی گردن پر کدو ایسا سر جھولتا رہتا اور زرد آنکھیں لوکاٹ کی ٹہنی پر بیٹھی شیاما چڑیا کو دیکھ کر بے قرار ہو اٹھتیں۔ ہمیں صبح صبح پہلوانوں کے ساتھ اکھاڑے میں کسرت کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم بھی پہلوانوں کی طرح بدن پر خوب مالش کرتے اکھاڑے کے کنارے گڑے ہوئے تیل میں چپڑے بانس کو تھام کر بیٹھکیں لگایا کرتے جلد ہی تھک جاتے اور پھر اکھاڑے کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرطوب مٹی پر چت لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگتے۔ پھر ہم اکھاڑے میں اتر کر نامی گرامی پہلوانوں کی طرح پنجے میں پنجہ ڈال کر کھڑے ہو جاتے اور پھریوں داؤں پیچ سے کام لیتے گویا رستم زماں کے شاگرد ہوں۔ اپنے اناڑی پنے کی وجہ سے ہم کشتی لڑتے لڑتے ہر بار بڑے پہلوانوں کی زد میں آ جاتے جو ہماری پیٹھ پر لات مار کر ہمیں پرے ہٹا دیتے۔ اکھاڑے سے باہر نکل کر ماسٹر نثار دھاگا اپنی رانوں کے گرد لپیٹ کر یہ دیکھا کرتا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج کتنی بڑھ گئی ہیں۔ واپس آ کر ہم بتے گوجر کی دکان سے پیڑوں کی لسی پیتے [illegible] کی طرح چھاتی [illegible] گوجر بھی بڑا مزیدار آدمی تھا۔

وہ پہلوانی چھوڑ چکا تھا مگر اس کا جسم اب بھی بڑا سڈول تھا۔ ہفتے میں ایک بار گائے کے دودھ سے ضرور نہاتا۔ مگر وہ بڑا ڈرپوک تھا۔ اندھیرے میں اس کے پاؤں نہ اٹھتے تھے اور روشنی میں چھپکلی کو دیکھ کر وہ دکان کی گدی پر اچھل پڑتا تھا۔ سارا دن وہ دکان پر دودھ دہی بیچتا، گوجروں سے حساب کتاب کرتا اور شام کو تحصیل پورے والے ٹھیکے پر جا کر پیٹ بھر کر میٹھا مالٹا شراب پیتا۔ ساتھ ایک کونڈا دہی کا کھا جاتا اور پھر سخی سرور کے تکیے پر جا کر مرغے پر رات گئے تک ماہیا گاتا رہتا۔ بتے گوجر کے کان ٹماٹروں کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ ایک روز ہمیں لسی کا پیالہ تھما کر بتے گوجر نے کہا "اوئے امنڈیو! تسی کہاں سے پہلوان ہو؟ اوئے تمہارے ابھی کان ہی نہیں ٹوٹے"

مجھے یاد ہے اسی روز ہم تکیہ سخی سرور گئے تھے اور ماسٹر نثار نے ایک اینٹ نیچے رکھ کر دوسری اینٹ سے میرا کان توڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں درد سے چیخ اٹھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے کان نہ ٹوٹ سکے۔

چیت بیساکھ کے دنوں میں ہم بانس کی تیلیوں کے پنجرے لے کر کھیتوں باغوں میں مرغیں پکڑنے جایا کرتے تھے۔ مادہ مرغ پنجرے میں بند ہوتی۔ پنجرے کا دوسرا دروازہ کھول کر تکی کھینچ دیتے۔ پنجرے کا دروازہ کھٹ سے بند ہو جاتا اور ہم خوشی خوشی گھر لوٹتے۔

ماسٹر نثار کا اصل نام کچھ اور تھا۔ یہ نام اس نے میڈن تھیٹرز کے مشہور ہیرو ماسٹر نثار کے نام پر رکھ لیا تھا کیونکہ اسے بھی اصل ماسٹر نثار کی طرح گانے اور اداکاری کا بڑا شوق تھا۔ انہی دنوں امرت ٹاکیز میں اصل ماسٹر نثار اور مس کجن بائی کی فلم "لیلیٰ مجنوں" لگی تو ہم دونوں دیکھنے گئے۔ سکرین پر جب ماسٹر نثار نے مجنوں کے روپ میں قبرستان میں جا کر قبروں کو سونگھنا شروع کیا تو ماسٹر نثار نے میرا ہاتھ دبا کر کہا "دیکھتے جانا۔ دیکھتے جانا۔ ہائے ہائے۔ ہائے ہائے۔"

تھوڑی ہی دیر میں سکرین پر مجنوں نے ایک قبر کو جو جھک کر سونگھا تو خوش ہو کر بولا "اسی قبر میں سے میری لیلیٰ کی خوشبو آ رہی ہے ضرور یہی میری لیلیٰ کی قبر ہے۔"

اس کے بعد اس نے ایک ہاتھ ہوا میں پھیلایا، نتھنوں کو پھلایا اور گانا شروع کر دیا۔

ہاں ہاں۔ راحت کا اسی طرح سے زمانہ گزر گیا
جھونکا ہوا کا جیسے ادھر سے ادھر گیا

میرے ساتھ دو آنے والی تھرڈ کلاس میں بنچ پر بیٹھا ہوا ماسٹر نثار جھومنے لگا۔ باہر نکل کر اُس نے کہا "میں ذرا اپنے گانے کو پکا کر لوں پھر ہم دونوں کلکتے جا کر میڈن تھیٹرز والوں کی فلم کمپنی میں کام شروع کر دیں گے۔"

ماسٹر نثار کو "لیلیٰ مجنوں"، "راجہ ہریش چندر"، "جلتی نشانی"، "سدپ بسنت"، "دھوپ چھاؤں"، "ناقہ مترم"، "حاتم طائی" اور "نقش سلیمانی" فلموں کے کئی گیت زبانی مع طرزوں کے یاد تھے۔ اُس نے یہ سارے کے سارے گیت ایک کاپی میں نقل کر رکھے تھے جس کے باہر موٹے قلم سے لکھا تھا "ماسٹر نثار امرتسری عرف شیر دل"۔

ماسٹر نثار ڈھولک بہت اچھی بجا لیتا تھا۔ یہ فن اُس نے کلیر شریف کے عرس پر ایک اُستاد سے سیکھا تھا۔ جو ایک ہیجڑے کے پیچھے ڈھولک بجایا کرتا تھا۔ ڈھولک وہ اس انہماک سے بجاتا کہ اُس کی زرد آنکھیں بند ہوتیں۔ پتلی گردن پر تربوز ایسا سر جھول رہا ہوتا اور دبلا بدن یوں دائیں بائیں پیچ و خم کھا رہا ہوتا گویا کوئی اُسے گدگدی کر رہا ہو۔ ساتھ ہی وہ گاتا بھی۔ اُس کی آواز بہت بری تھی، اُسے راگ داری سے بھی کوئی واقفیت نہ تھی مگر وہ درد میں ڈوب کر گاتا تھا۔ جب وہ ناک سے سانس لیتا تو ایک سیٹی سی بج اٹھتی۔ ذرا کی ذرا اپنی آنکھیں کھول کر ماسٹر نثار چھت کی طرف دیکھتا اور آنکھیں بند کر کے گردن ایک طرف ڈھلکا کر مصرع اٹھاتا۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

وہ گانے میں لفظوں کو بگاڑ دیا کرتا تھا۔ مثلاً مجھے اچھی طرح یاد ہے، بلکہ اس وقت بھی جب میں اُس کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میرے کانوں میں اُس کے گانے کی آواز گونج رہی ہے وہ "راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا۔" میں "زمانہ" کو ہمیشہ "زنانہ" کہا کرتا تھا۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

اس کے علاوہ اُس کی عادت تھی کہ وہ گاتے ہوئے ہر شعر یا گیت کے آخری لفظ کے ساتھ "ہادم" ضرور لگا دیا کرتا تھا۔ اسے شاہو مودک کی فلم "آوارہ گرو راج کمار" کا یہ گانا بہت پسند تھا۔

بے کس ہوں مجبور ہوں میں   جان سے لاچار ہوں

اس کو وہ یوں گایا کرتا تھا

بے کس ہوں مجبور ہوں میں ہادم   جان سے لاچار ہوں ہادم

کبھی کبھی وہ گانے کے شروع میں بھی ہادم لگا دیا کرتا تھا۔

ہادم اُٹھ حاتم کیوں سویا نادان ہادم   اللہ بندے رب کو پہچان ہادم

کبھی کبھی جب وہ ماسٹر نثار ایسا ایکٹر نہ بن سکنے کی وجہ سے بڑا اداس ہوتا تو وہ پاسنگ شو سگریٹ کا لمبا کش لے کر اور ناک سے سیٹی بجا کر دھواں نکالتا اور ڈھولک گھٹنوں میں دبا کر آگے سے گتے ہوئے کہتا: "میرے باؤ! کبھی اپنے بھی دن ضرور پھریں گے۔"

پھر آہستہ آہستہ ڈھولک بجاتے اور گانے میں مگن رہتا۔ وہ دنیا کے جھنجھٹوں سے بے فکر ہو کر گا رہا ہوتا کہ باہر سے اُس کے والد امام دین حجام کی آواز آتی: "اوے تان سین دیا پترا۔ بس کر ہٹی تے نہیں جانا ں؟"

ماسٹر نثار فوراً ڈھولک سے ہاتھ کھینچ لیتا اور آنکھیں کھول کر بلند آواز میں جواب دیتا: "آیا میاں جی!"

وہ اپنے باپ کا بڑا ادب کرتا تھا جس طرح اُس زمانے میں سب بچے اپنے ماں باپ کا ادب کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس زمانے کے باپ اپنے بچوں سے آج کل کے باپوں کی طرح لاڈ پیار نہیں کیا کرتے تھے اُلٹا مارا پیٹا کرتے تھے۔ ماسٹر نثار کا والد حجام تھا۔ بھرا بھرا گول چہرہ۔ سفید ڈاڑھی سر کے سفید بال۔ جن پر وہ مہندی لگا کر پیپل کے پتے باندھا کرتا تھا۔ زیادہ بھنگ پینے کی وجہ سے اُس کے چہرے کی رنگت سبزی مائل پھیکی پڑ گئی تھی۔ میری حجامت بناتے وقت وہ بوریئے پر بیٹھا میرا سر اپنے گھٹنوں میں دبا لیتا اور مشین سے خشخاشی کرنے کے بعد سر پر جب آم کی گٹھلی پھیرتا تو مجھے بوریئے پر تارے چمکتے نظر آتے۔ ماسٹر نثار نے والد کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے ترکھانہ کام کو ترجیح دی تھی۔ چنانچہ وہ حاجی اللہ دتا ترکھان کی دکان پر کام سیکھ رہا تھا یہ حاجی اللہ دتا ترکھان بھی ایک طرفہ بزرگ تھا۔ وہ خربوزے کی پھانک بیجوں اور چھلکے سمیت کھایا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں خربوزے کی اصل اور مفید شے تو اس کے بیج اور چھلکا ہے جس پر گودا تو قدرت نے ویسے ہی ساتھ لگا رکھا ہے۔

کبھی کبھی میں حاجی صاحب کی دکان پر ماسٹر نثار کو ملنے جایا کرتا۔ دکان میں کٹی ہوئی لکڑیوں کی گیلی گیلی خوشبو پھیلی ہوتی اور ماسٹر نثار ایک طرف بورے پر تیشہ لیے بیٹھا لکڑیوں کے تختے چھیل رہا ہوتا۔ بازار میں سے گزرتے ٹھنڈ کی لکڑیوں سے لدے ہوئے گڈے گزرتے تو میں آنکھ بچا کر ایک ڈنڈا کھینچ لیتا۔ ماسٹر نثار اس کا بڑا خوبصورت گلی ڈنڈا گھڑ دیتا اور ہم گرمیوں کی شکر دوپہروں میں انجمن پارک یا لیگز ہنڈلا گراؤنڈ میں جا کر گلی ڈنڈا کھیلا کرتے۔

جمعے کے روز ہم دھلے ہوئے کپڑے پہن کر مسجد قمر الدین ہال بازار میں جا کر جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ میرا لباس عام طور پر سفید ٹھاسے کی قمیض، کلکتے کی چارخانہ دار دھوتی اور سلیپر پر مشتمل ہوتا لیکن ماسٹر نثار کی سج دھج نرالی ہوتی تھی۔ وہ چاند خاں ہزاری کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک کنگھی سے تیل میں چپکے بال سنوارتا اور لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی شلوار کے بل درست کرتا رہتا اور پھر یوں سنبھل سنبھل کر میرے ساتھ چلتا، گویا تنی ہوئی رسی پر چل رہا ہو۔ مسجد میں جا کر ہم حوض کے کنارے بیٹھ کر وضو کم کرتے اور حوض میں تیرتی سرخ مچھلیاں کو زیادہ دیکھا کرتے۔ انگریزی کا ایک لفظ وہ بہت بولا کرتا تھا۔ یہ لفظ تھا۔ ماسٹر نثار اردو میں اس کو "نیور مین" بولا کرتا تھا۔ ایک بار پستے گوجر کی دکان میں ماسٹر نثار میرے ساتھ بیٹھا پستے گوجر کو ہیر سنا رہا تھا کہ گلی میں سے جلی مراثی کا گزر ہوا۔ وہ دکان کے سامنے رک گیا۔ کچھ دیر گردن جھکا کر ہیر سنتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا "پتر! راگ داری کا حلیہ خراب نہ کرو۔ تم راگ داری کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ بس لوگوں کے سر مونڈا کرو۔"

جلی مراثی اتنا کہہ کر چل دیا۔ پستے گوجر کو اور مجھے اس کی یہ بات بڑی بری لگی۔ پستا گوجر گھونسہ اٹھا کر جلی مراثی کے پیچھے بھاگنے لگا تو ماسٹر نثار نے اس کا بازو تھام کر کہا "پہلوان! نیور مین۔"

ماسٹر نثار کو تھیٹر میں پارٹ کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے اس نے ایک صندوقچی میں نقلی مونچھیں، نقلی داڑھی، سرخی پاؤڈر، گتے کا شاہی تاج جس پر تارے لگے تھے اور مور کا پنکھ جڑا تھا۔ نقلی موتیوں کے ہار وغیرہ جمع کر رکھے تھے۔ ہم دونوں کبھی کبھی اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں بچوں کو جمع کر کے ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کا ناٹک کھیلا کرتے تھے لنگے اور دوپٹے ہم اپنے اپنے گھروں سے چوری چھپے صندوق کھول کر نکال لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر میں سنتوکھ سر کی گراؤنڈ میں ایک تھیٹریکل کمپنی اتری جس نے شکنتلا کا کھیل کھیلا۔ میں اور

ماسٹر نثار بڑے شوق سے یہ کھیل دیکھنے گئے۔ ٹکٹ کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے چنانچہ ہم لسوڑے کے ایک درخت پر چڑھ کر اندر پنڈال میں کود گئے اور ایک طرف قناتوں کے پاس دبک کر بیٹھے کھیل دیکھتے رہے۔ اگلے روز ہم نے وہی کھیل اپنی ڈیوڑھی میں کھیلا۔ صبح ہی سے ہم نے کاپیوں میں سے کاغذ پھاڑ کر اور قلم دوات سے جلی حروف میں "شکنتلا" کے اشتہار لکھ کر مکانوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیئے تھے۔ شام کو ہم نے ڈیوڑھی میں تخت پوش بچھا کر سٹیج بنایا۔ بانس جوڑ کر آگے پردہ گرا دیا۔ محلے کے بچے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ماسٹر نثار راجہ دشمنت بنا اور میں اس کا وزیر۔ ہم نے سیڑھیوں میں بیٹھ کر چہروں پر نقلی مونچھیں لگائیں۔ خوب سرخی پاؤڈر تھوپا۔ ماسٹر نثار نے سر پر مور کے پنکھ والا گتے کا تاج رکھ لیا۔ میں نے اپنی بڑی بہن کا دوپٹہ سر پر پگڑی کی طرح باندھ لیا۔ ہمارے ایک دوست نے سٹیج پر آ کر پردہ ہٹا دیا۔ اور شکنتلا کا کھیل شروع ہو گیا۔ ماسٹر نثار دشمنت کے روپ میں تیر کمان لئے جنگل میں کھڑا تھا اور میں وزیر بنا ہاتھ باندھے سر جھکائے ساتھ کھڑا اُسے کہہ رہا تھا "مہاراج! ہرن اسی جنگل میں گیا ہے۔"

ماسٹر نثار گرج کر بولا "مگر کہاں ہے ہرن! کہاں ہے ہرن؟ اگر ہرن نہ ملا تو ہم تیری گردن کاٹ کر رکھ دیں گے۔"

میں نے ایک طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا، "وہ رہا ہرن مہاراج!"

جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ڈیوڑھی کا دروازہ تھا جس کا نصف پٹ کھلا تھا میرا اتنا کہنا تھا کہ ماسٹر نثار نے فوراً کمان کے ساتھ تیر جوڑ کر چلا دیا۔ تیر بچوں کے سروں کے اوپر سے ہو کر گزرا اور ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر سیدھا پستے گوجر کو لگا جو شراب کے نشے میں دُھت سامنے والے مکان کی دیوار کے پاس پیشاب کر رہا تھا۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ میں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ میں نے ماسٹر نثار کو کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ماسٹر تیر پستے گوجر کے لگ گیا ہے بھاگ چلو۔"

ماسٹر نثار نے گردن اکڑائی اور مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا "نیور مین۔"

محلے میں ایک دم شور برپا ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں بھگدڑ مچ گئی اور ہم دونوں بھاگ کر حاجی اللہ دتا ترکھان کے گھر میں جا کر چھپ گئے جو اُس وقت تنور کی روٹی کے ساتھ خربوزے

بیج اور چھلکوں کے کھا رہا تھا۔ اُس نے چونک کر کہا: "اوئے کی شور مچا کے آئے او اوئے۔"

ماسٹر نثار نے کہا: "اُستاد جی، ہمیں بسا گوجر مارتا ہے۔"

"اوئے کیوں مارتا ہے بسا؟"

"کہتا ہے مجھے کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی سے پانی لا دو۔ بھلا اُستاد جی شام کو ہم وہاں کیسے جا سکتے ہیں۔"

"بسا گوجر شودائی ہو گیا ہے۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ یہاں۔"

عید میلادالنبی کے جلوس میں ہم نے ایک ایک سبز جھنڈا تھام رکھا ہوتا۔ اور ہماری یہی کوشش ہوتی کہ جلوس ہمارے محلے سے ہو کر ضرور گزرے۔ اور پھر جلوس جب ہمارے محلے میں سے ہو کر گزرتا تو ہم بڑے فخر کے ساتھ کنکھیوں سے اپنی گلی کے بچوں کو دیکھتے جو دکانوں کے پھٹوں پر کھڑے رشک سے ہمیں تک رہے ہوتے۔ کٹڑہ مہان سنگھ سے سکتری باغ تک دھوپ میں جلوس کے ساتھ چلتے چلتے ہمارے چہرے سرخ ہو کر پسینے میں شرابور ہو جاتے لیکن ہمیں بھی تھکان یا گرمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔

کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک بڑا گنجان درخت تھا جس کی پھیلی ہوئی شاخیں زمین کو چھوتی تھیں۔ میں اور ماسٹر نثار گلی کے لڑکوں کے ساتھ یہاں جنٹ براہمن کھیلا کرتے تھے۔ میں طارزن کی طرح ایک ٹہنی کو پکڑ کر چھلانگ لگاتا اور جھولتا ہوا زنائے کے ساتھ دوسری ٹہنی پر جا پہنچتا۔ ماسٹر نثار ٹہنیوں کے بیچ کسی دوشاخے پر بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھ جاتا اور پھر راجہ اندر کی طرح گردن اکڑا کر ایک دم پکار اٹھتا۔ "یہ آج میرا تخت کیوں ہل رہا ہے؟" پھر خود ہی مصاحب بن کر ادب سے گردن جھکا کر کہتا: "حضور آپ کا شاہی تخت جنوں کی گردنوں پر رکھا ہے جو آپ کو سبز پری کے محل کی طرف لے جا رہے ہیں۔"

ماسٹر نثار راجہ اندر کے روپ میں مسکراتا اور پھر ایک ہاتھ اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔

ہاؤم۔ راجہ ہوں میں قوم کا   اندر میرا نام۔ ہاؤم
سبز پری پر عاشق ہوں میں   عشق ہے میرا کام۔ ہاؤم

برسات کے دنوں میں ہم دونوں نہر کے کنارے کنارے لمبی سیریں کرتے۔ لبالب نہر

میں تیرتے ہوئے سبز، زرد، سرخ، آموں اور امرودوں کو چھلانگیں لگا کر پکڑتے، نہر کی پلیا پر کھڑے ہو کر مٹھیاں چوم کر پانی میں کود جاتے اور مردہ تاری لگایا کرتے۔ کبھی غوطہ لگا کر نہر کی تہہ سے مٹھی بھر گیلی ریت اٹھا کر لاتے اور اُس سے اپنے دانت مانجھتے کیونکہ ہم نے بڑوں کو یہی کرتے دیکھا تھا۔

جنوری فروری کی سردی میں جب باغ اُجڑ جاتے تو ہم امرود کے باغوں میں نکل جاتے اور درختوں پر لگے اکا دکا امرود توڑ توڑ کر آدھا کھاتے اور آدھا پھینک دیتے۔ بارش شروع ہو جاتی تو ہم ٹاہلیوں کے گرتے پتوں میں بھیگتے گھر واپس آ جاتے۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم اسی کمپنی باغ کے درختوں پر کھیلتے۔ پلیا پر سے نہروں میں چھلانگیں لگاتے اور ڈیوڑھی میں سرخی پاؤڈر تھوپے "شکنتلا" کھیلتے رہیں گے اور وقت کبھی نہیں گزرے گا۔ لیکن وقت گزرتا چلا گیا۔ اور پھر وقت جب ایک اہم موڑ پر سے گزرا تو ہم سے امرتسر، کمپنی باغ، ہال بازار، سکتری باغ، بجلی والی نہر اور مسجد خیر الدین ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ جب ہم کمپنی باغ کی نہروں میں چھلانگیں لگاتے پھر رہے تھے اور ماسٹر نثار آنکھیں بند کئے ڈھولک بجاتے ہوئے "لیلیٰ مجنوں" کے گانے گا رہا تھا۔ اُس وقت برصغیر پاک و ہند کے مسلمان لیڈر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکتِ پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے جہاں مسلمان عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں ہمیں معلوم ہی نہیں تھا —— چنانچہ ایک روز جو ہم نہر سے ڈبکی لگا کر نکلے تو امرتسر میں چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ آگ لگی تھی، بم پھٹ رہے تھے۔ دھواں ہی دھواں تھا۔ لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ آگ ہی آگ تھی۔ لبالب بھری ہوئی ٹھنڈے پانیوں کی نہریں سوکھ گئی تھیں۔ باغ اُجڑ گئے تھے۔ ٹھنڈی کھوئی کے پانی میں انسانوں کا گرم خون آن ملا تھا۔ مسجدوں کے حوض خشک ہو گئے تھے۔ ہم نے امرتسر چھوڑ دیا۔ امرتسر نے ہمیں چھوڑ دیا۔

خستہ حال زخمی، بیمار، نیم جاں مہاجروں کے لٹے پٹے قافلے لاہور کی سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے ہر طرف ایک افراتفری، ہیجان اور پریشانی کی فضا طاری تھی۔ بہن بھائی سے، ماں بیٹے سے، بیٹا باپ سے اور خاوند بیوی سے بچھڑ گیا تھا۔ لاہور سٹیشن پر کٹی ہوئی گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ وقت گزرتا چلا گیا ماسٹر نثار سے نہ مل سکا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی گاؤں کی طرف نکل گئے ہیں۔

پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے دس گیارہ برس گزر گئے۔ ایک روز میں انار کلی بازار سے گزر رہا تھا کہ میں نے بازار کے کونے پر ایک دکان کے باہر ماسٹر نثار کو سڑک پر بیٹھے ایک الماری کو مرمت کرتے دیکھا۔ اُس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ سوکھ کر سیاہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ کپڑے میلے، بوسیدہ اور پیوند لگے تھے۔ وہ برمے سے تختے میں سوراخ ڈال رہا تھا۔ اور اس کے سفید بالوں میں لکڑی کا بورا پڑا تھا۔ میں چپکے سے اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی زرد ویران آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پھر وہ میرے گلے لگ گیا اور ہلکے ہلکے سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "ماسٹر نثار! یہ کیا حال بنا لیا تم نے اپنا؟"

ماسٹر نثار میلی قمیض سے آنکھیں پونچھ کر دھیرے سے مسکرایا اور خشک آواز میں بولا:

"ہائے حمید! انیور مین!"

امرتسر کی میاں پوترو

امرتسر کی ایک سرد رات ـــــ کمپنی باغ کے درخت۔ جنوری کی دھند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک کہر آلود خاموشی ہے جو سنسان شہر کے گلی کوچوں میں اتر آئی ہے۔ ابھی شہر میں بجلی نہیں آئی۔ لیمپوں کی روشنی کہیں کہیں سردی میں ٹھٹھر رہی ہے۔ آسمان پر ستارے سفید برف کے شفاف ٹکڑوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ روڑاں والی مسجد کے دالان کی گلابی سلیں یخ ہو رہی ہیں۔ امرتسری بچے، بوڑھے، جوان گرم لحافوں میں دبکے گہری نیند سو رہے ہیں۔ مکانوں کے کواڑ بند ہیں۔ گھروں کی منڈیریں، ممٹیاں، کبوتروں کی کابکیں، ٹین کے چھپر، بیل کی پٹڑیاں اور بھائیوں والے باغ میں امرودوں کے اجڑے ہوئے درخت اوس میں بھیگ رہے ہیں۔

آدھی رات گزر گئی ہے۔ ٹھٹھرتی رات شہر کے ہونٹوں پر اپنا برف آلود ہاتھ رکھ کر خواب میں کھو گئی ہے۔ بازار بکرواناں کے ایک دو منزلہ مکان میں دیئے کی لو مدھم ہو رہی ہے۔ چھ سات برس کی ایک بچی لحاف اوڑھے سو رہی ہے۔ ساتھ والی چارپائی پر ایک عورت لحاف کے اندر کانگڑی لیے دم بخود بیٹھی ہے۔ فیروزی شال میں لپٹا اس کا چہرہ ساکت ہے۔ کان کسی آواز پر لگے ہیں۔ یہ آواز اس نے ابھی ابھی سنی تھی۔ ادھیڑ عمر کی یہ سرخ و سپید عورت لحاف کے اندر کانگڑی لیے سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی چارپائی کو ہلایا ہو۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اور پھر اس نے ایک آواز سنی۔ ڈراؤنی، رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز، جسے سن کر امرتسر پتھر ہو جاتا تھا۔ جس کی دہشت نے ایک طویل عرصے تک امرتسر کی سنسان راتوں کو آسیب زدہ بنائے رکھا۔ یہ آواز دور سے آتی سنائی دیتی تھی اور کسی عورت کی آواز تھی۔ زمین کی گہرائیوں سے نکل کر بالکل آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتی ہوئی ایک کرب انگیز چیخ کی آواز ـــ اس بین کرتی آواز کے ساتھ دد

الفاظ بڑے صاف سنائی دیتے تھے۔ کشمیری زبان کے دو الفاظ۔

میاں پوترو ـــــــ میاں پوترو

یعنی میرے بچے ـــــ میرے بچو!"

ان الفاظ کی کانپتی ہوئی بازگشت نے شہر کی سرد ویران رات کو اور زیادہ ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ جیسے کوئی عورت بال کھولے قبرستان کی قبروں میں ماتم کرتی چلی آ رہی ہو۔

نیچے گلی میں موت کا سناٹا ہے۔ لحد کی خاموشی ہے۔ وہ عورت سانس روکے چارپائی پر بیٹھی ہے اس کے دونوں ہاتھ لحاف کے اندر کانگڑی پر جمے ہوئے ہیں۔ طاق میں دیا جل رہا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ آواز پھر سنائی دے گی۔ اور وہی مرگ کی لو ماتمی آواز پھر بلند ہوتی ہے۔ گو اس بار بھی دور سے آئی تھی شاید صدر کے تالاب یا چٹا کٹڑہ کی جانب سے۔ عورت کانگڑی لحاف کے اندر سے نکال کر چارپائی کے ساتھ فرش پر رکھ دیتی ہے۔ اور طاق میں جلتا دیا پھونک مار کر بجھاتی ہے۔ دروازے۔ اور گلی والی کھڑکی کی کنڈی چڑھا کر بچی کو اپنے ساتھ لگا کر لحاف اوپر کر لیتی ہے۔ وہ گھر میں اکیلی ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ کانگڑی کی راکھ میں دبے ہوئے انگارے دھیمی چمک دینے لگے ہیں۔ اس کا خاوند کشمیری شالیں خریدنے سری نگر گیا ہوا ہے۔ یہ بچی اس عورت کے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ بچی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

وہ اندھیرے میں ڈر کر پھوپھی سے کہتی ہے۔

آپی ـــــ!

عورت کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

شی۔!

بچی سہم کر اپنی پھوپھی کے ساتھ لگ جاتی ہے عورت کی آنکھیں اندھیرے میں پوری کھلی ہیں جیسے وہ اس بھیانک آسیبی آواز کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے کان گلی کی سنسان خاموشی پر لگے ہیں اور پھر اچانک وہی آواز ایک بار پھر سنائی دیتی ہے۔ عورت کا دل اچھل کر اس کے حلق کے قریب آ جاتا ہے۔ پہلے وہ آواز شہر کے دوسرے کنارے سے آئی تھی اور اب ۔ اب وہ آواز گلی میں بلند ہوتی تھی جیسے کسی عورت نے گلی میں، مکان کے بند دروازے کے ساتھ منہ لگا کر چیخ ماری ہو۔

میاں پوترو ـــــ! تم چھپے کہو۔!

دمیرے بچو! سردی لگتی ہے؟

بچی کو سینے سے لگائے وہ عورت لحاف میں لپٹی برف کی مانند منجمد ہو جاتی ہے۔ خوف اور دہشت سے اسے پسینہ آ گیا ہے۔ وہی ڈراؤنی آواز گلی میں ایک بار پھر بلند ہوتی ہے۔ اب وہ عورت ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھتی ہے۔ خوف سے کانپتی ہوئی بچی کو لحاف کے اندر دبا کر کانگڑی اٹھاتی ہے۔ کھڑکی کے پاس آ کر کنڈی اتارتی ہے اور کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر کانگڑی کی آگ گلی میں الٹ دیتی ہے اور تیزی سے کھڑکی کو کنڈی لگا کر لحاف میں آ کر بچی کو سینے سے لگا لیتی ہے۔ سرخ انگارے گلی میں گرتے ہیں تو کسی عورت کی بھیانک چیخیں بلند ہوتی ہیں اور پھر یہ چیخیں گلی سے نکل کر شہر کی سنسان فضاؤں میں بہت دور چلی جاتی ہیں پھر شہر کے دوسرے کنارے پر جا کر ان چیخوں کی وحشتناک آوازیں گم ہو جاتی ہیں۔

یہ منظر جو میں نے بیان کیا اور جسے آپ نے پڑھا آج سے کم و بیش ساٹھ ستر برس قبل امرتسر کی ایک سرد رات کا منظر تھا۔ اور وہ بچی جو اپنی پھوپھی کے ساتھ لحاف میں خوف کے مارے دبکی ہوئی تھی۔ میری والدہ تھی۔ جنہیں میں بی جی کہا کرتا تھا۔ سرخ و سپید۔ بھاری جسم باوقار خاتون ـــ گول چاند ایسا پُر جلال چہرہ جہاں بیٹھی ہوتیں اردگرد کی فضا ایک سنجیدگی اور جذب کی کیفیت میں ڈوب جاتی۔ کم سخن اور کم آمیز۔ سب سے زیادہ مجھ سے پیار کیا اور زندگی بھر سب سے کم مجھ سے بات کی۔

امرتسر میں تھے تو راتوں کو ہمیں "میاں پوترو آ گئی" کہہ کر ڈرایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بچوں کو سرِ شام ہی بستروں کی طرف ہانک دیا جاتا۔ ہم گلی کی طرف بھاگتے۔ اور وہیں ہمیں اٹھا اٹھا کر بستروں پر پٹخ دیتیں۔

سو جا۔ نہیں تو میاں پوترو آ جائے گی۔

اور ہم اس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بستر میں سمٹ جاتے جس نے زرد آنکھوں والی سیاہ خونخوار بلی کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا ہو۔ میاں پوترو امرتسر کی چڑیل تھی۔ اس کا نام ہی سن کر ہم کانپ جاتے اور ہمارے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ جاتی تھی۔ امرتسر کی مائیں بہنیں شریر اور نہ سونے والے بچوں کو میاں پوترو کی آواز نکال کر ڈراتی تھیں اس آواز کے ساتھ ہی ایک چڑیل کی شکل سامنے آ جاتی کہ جس کے بال کھلے ہیں۔ دونوں پاؤں الٹے ہیں۔ دانت باہر نکلے ہیں اور وہ بانہیں پھیلائے ہماری طرف بڑھ رہی ہے خوف کی ایک سنسناہٹ سی خون میں اترتی اور ہم سو جاتے یا بے ہوش ہو جاتے۔

آپو جی یعنی میری والدہ نے میاں پوترو چڑیل کی آواز سنی تھی۔ چنانچہ ایک بار جب میں نے ان سے پوچھا۔۔۔

"آپو جی! آپ نے میاں پوترو کی آواز سنی تھی؟" تو انہوں نے مجھے وہ سارا منظر سنایا جسے میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

"میں بہت چھوٹی تھی اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی کہ کچھ یاد نہ ہو۔ میاں پوترو کی آواز پہلی بار میں نے اپنی پھوپھی کے پاس لیٹے ہوئے سنی پھوپھی کا خیال تھا کہ میں سو رہی ہوں میں جاگ رہی تھی اور میں نے صاف صاف میاں پوترو چڑیل کی آواز سنی۔ پہلی بار آواز شہر کے ایک کنارے سے آئی۔ بڑی زور سے آئی شاید چڑیل بلاقی شاہ کے قبرستان میں تھی پھر اچانک ہماری گلی میں مکان کے باہر سے آواز آئی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ آواز تو جیتے جاگتے انسانوں کو پتھر کر دیتی تھی کہتے ہیں جس گلی میں آدھی رات کو میاں پوترو کی آواز آتی تھی وہاں اگلے روز ضرور کوئی نہ کوئی مرگ ہو جاتی تھی۔ بڑے کاکا جی کہا کرتے تھے کہ جوانی میں ان کے محلے میں ایک بار آدھی رات کو میاں پوترو چڑیل پھر گئی اگلے دن گلی میں سے چار جنازے اٹھے بڑی پھوپھی نے ایک بار میاں پوترو کی آواز سنی تو وہیں دم دے دیا آدھی رات کو شاید پانی پینے اٹھی ابھی کمرے میں گھڑے کے پاس ہی آئی تھی کہ گلی میں سے میاں پوترو کی ڈراونی آواز بلند ہوئی بس وہیں دھڑام سے گری اور دم دے دیا اللہ بخشے وزیر خالہ کہا کرتی تھی۔ میری ماں نے گلی میں میاں پوترو کی آواز سنی تو اٹھ کر کھڑکی کھولی اور کانگڑی کی ساری آگ گلی میں الٹ دی اور کہا سردی لگتی ہے تو لے آگ اور مر جا۔ شاید اسی لئے میری پھوپھی نے بھی اس رات گلی میں کانگڑی الٹ دی تھی کیونکہ یہ چڑیل، میاں پوترو ہمیشہ پوہ، ماگھ کی ٹھٹھرتی ویران اندھیری راتوں کو نکلا کرتی تھی اور ہر بار میاں پوترو کی آواز لگانے کے بعد یہ ضرور کہتی۔ "وونی ترٹھے لکن نے مجھے سردی لگتی ہے۔) ہماری آپو جی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن میں انہیں اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ گلابی فرد میں لپٹی مجھے میاں پوترو کی کہانی سنا رہی ہیں بچپن میں اس چڑیل کا نام سن کر میں بھی پتھر ہو جاتا میں روتا تو میری بڑی بہن مجھے میاں پوترو کی آواز نکال کر ڈراتی اور میں جہاں کا تہاں ہو کر آنکھیں بند کر لیا کرتا۔

بڑا ہوا تو راتوں کو اندھیری گلیوں سے گزرتے ڈر لگتا کہ کسی مکان کے دروازے کے پیچھے سے اچانک میاں پوترو نہ نکل آئے، تپتی ویران دوپہروں میں سچائیاں والے امرودوں کے باغ

میں ایک سناٹا چھایا ہوتا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ دوپہروں میں چڑیلیں پیچھے سے نام لے کر آواز دیا کرتی ہیں ایک بار میں باغ میں گرے پڑے کچے امرود کھا رہا تھا کہ اچانک یوں لگا جیسے کسی عورت نے میرا نام لے کر آواز دی ہے، امرود میرے ہاتھ میں رہ گیا اور ایک پل کے لئے میں پتھر بن گیا، پھر جو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تو شریف پورے والے پھاٹک پر آ کر دم لیا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو، لیکن میاں پوترو کا خوف ہر امرتسری لڑکے کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔

کچھ حقیقت پسند امرتسریوں کا بیان ہے کہ اصل میں میاں پوترو ایک کشمیرن تھی۔ جو امرتسر میں کوتوالی کے پاس اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ کوتوالی کی پرانی عمارت گرائی گئی تو اس کے دونوں بچے ملبے تلے آ کر مر گئے اپنے بچوں کے غم میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی اب وہ امرتسر کے گلی کوچوں میں پاگلوں کی طرح پھرا کرتی اور اپنے بچوں کو آوازیں دیا کرتی۔ یہ حقیقت پسندانہ بیان کم از کم مجھے پسند نہیں تھا میاں پوترو کو ایک چڑیل کے روپ میں ہی دیکھنا پسند کرتا تھا ہمارے ساتھ والے محلے چیل منڈی میں میرا ہم عمر اختر نام کا ایک خوبصورت گورا چٹا لڑکا رہتا تھا۔ دس گیارہ برس کا ہو گا کہ اچانک لاری کے نیچے آ کر مر گیا اس کی ماں بھاری بھرکم انتہائی سنجیدہ مزاج کشمیری خاتون تھی اور ہمارے گھر اکثر میری آپو جی کو ملنے آیا کرتی تھی۔ بیٹے کی موت کے صدمے نے اسے دیوانہ کر دیا۔ وہ سفید برقع کا نقاب اٹھائے گلیوں میں پھرنے لگی کسی بھی لڑکے کو دیکھتی تو پیچھے سے آواز دیتی۔

"وے اختر"

لڑکے ڈر کر بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے مجھے بھی پیچھے سے آواز دی۔ میں ڈر کر بھاگ گیا۔ یا تو اس ماں کی ماری کو شہر کا ہر لڑکا اپنا لخت جگر اختر نظر آتا تھا اور یا اسے اختر کہیں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے وہم ہو گیا کہ یہی عورت اصل میں میاں پوترو چڑیل ہے اور میں اس کے سامنے سے بھاگنے لگا۔ ایک روز دوپہر کو میں نے دیکھا کہ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ میں نے ریل کی پٹڑی سے جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی اور چالیس کھوؤں کی جانب بھاگ گیا۔ میرے دادا جان رودھا سنگھ بزرگ تھے۔ سبز چائے اور درختوں پھولوں سے محبت کرتے تھے۔ ان کا بیشتر وقت محلے والے باغ میں گزرتا۔ مولسری کے ایک درخت کے نیچے دری بچھا کر ٹیپ کرتے رہتے کسی وقت کوئی چڑیا ان کے کندھے پر آ کر بیٹھ جاتی تو ان کے ٹیپ کرتے ہاتھ ایک دم ساکت ہو جاتے جب چڑیا اڑ جاتی تو وہ کہا

کر پیچھے پڑ کرنے لگتے۔ رومانٹک ہونے کی وجہ سے ہی شاید انہیں بھی میاں پوترو کے بارے میں حقیقت پسندانہ توضیح پسند نہیں تھی۔ جب کبھی میں ان سے میاں پوترو کے بارے میں بات کرتا تو وہ سبز چائے کی پیالی میں پھونک مار کر ایک گھونٹ پیتے اور سفید مونچھوں پر بڑی نفاست سے انگلی پھیر کر کہتے۔

"میاں پوترو کشمیر کی چڑیل ہے۔ ابا کا نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ پہلے ٹن مرگ میں رہتی تھی۔ جب وہاں بہت لوگ مرنے لگے تو ایک روز وہاں سے کوچ کر کے امرتسر آگئی۔ دوپہروں میں باغوں میں نہ جایا کرو۔"

"مگر وہاں ابا جان! میاں پوترو تو رات کو نکلتی ہے۔"

"تمہارے خالو کہہ رہے تھے کہ ایک آدمی تپتی دوپہر میں کمپنی باغ میں سے گزر رہا تھا کہ میاں پوترو نے آواز دی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہیں کھڑے کھڑے گر کر مر گیا۔" مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں دوپہروں میں کمپنی باغ میں نہ جاؤں۔ کمپنی باغ ہی میرا گھر میرا ہوٹل اور میرا اسکول تھا۔ گھر سے بھاگ کر، کامریڈ ہوٹل کے دوستوں سے بھاگ کر، سکول سے بھاگ کر میں اگر کہیں جاتا تھا تو کمپنی باغ میں۔ آج میرا کمپنی باغ مجھ سے بچھڑ چکا ہے شاید اسی لئے میں اب گھر سے کبھی نہیں بھاگتا سوچتا ہوں بھاگ کر جاؤں بھی تو کہاں پہلے تو صرف ایک ہی سڑک تھی جو سیدھی کمپنی باغ کو جاتی تھی اور اب میرے ارد گرد سڑکوں کا جال بچھا ہے مگر ان میں سے ایک بھی سڑک کمپنی باغ کو نہیں جاتی وحدت الوجود سے کثرت الوجود میں آگیا ہوں اللہ مجھے توحید کی توفیق دے پچھلے دنوں ایک عزیز ویزا لے کر امرتسر گئے تو مجھ سے پوچھا تمہارے لئے امرتسر سے کیا لاؤں؟ میں نے کہا کمپنی باغ کا کوئی پھول لے آئیے گا۔ انہوں نے واپسی پر مجھے سنبل کا ایک سرخ پھول لا کر دیا یہ پھول وہ کمپنی باغ کی ایک روش سے اٹھا کر لائے تھے وہ پھول میرے پاس پڑے پڑے سیاہ ہو گیا ہے رنگ اڑ گیا ہے مگر کمپنی باغ کی مہک اس میں سے اب بھی آتی ہے۔

لیکن ان دنوں تو گرمیوں کی ٹھنڈی صبحیں تپتی دوپہریں اور شامیں کمپنی باغ کی چھوٹی نہر میں نہاتے گزرتی تھیں۔ میاں پوترو کا خوف مجھے کمپنی باغ میں بہت ہی کم آتا تھا شاید میاں پوترو بھی اس خوبصورت باغ میں آ کر درخت بن جاتی تھی ایک روز شام کو میں نہر سے نہا کر نکلا تو پردہ کلب کی طرف آگیا یہاں ناشپاتی کے بے شمار درخت پھلوں سے بھرے ہوئے تھے باغ میں شام کا سرمئی

اندھیرا پھیلنے لگا تھا برسات کے دن تھے ٹھنڈی کھوئی والے آموں کی طرف سے کوئل کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے سوچا دو چار ناشپاتیاں توڑ کر لے جاؤں پردہ کلب کے عقب میں رکھوالوں کی جھونپڑی تھی کسی وقت رکھوالے کی آواز بلند ہو جاتی تھی میں جھاڑیوں میں سے نکل کر پردہ کلب میں آگیا۔ ناشپاتی کے درختوں کی کچھ شاخیں کلب کے لان میں جھکی ہوئی تھیں۔ زردی مائل سبز ناشپاتیاں توڑ کر نیکر کی جیب میں بھریں اور واپس مڑ رہا تھا کہ اچانک ایک ہاتھ نے پیچھے سے میری قمیض پکڑ کر کھینچی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پلٹ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

پردہ کلب کی جھاڑیوں کو چیرتا ہوا باہر نکلا اور مچھلیوں والے تالاب کے اوپر سے ہو کر جا رہا تھا کہ ایک سفید برقعے والی عورت نے اچانک میرے سامنے آ کر کہا۔

"وے اختر"!

اس کے بعد کی مجھے کوئی خبر نہیں کہ میں کیسے ٹھنڈی کھوئی اور وہاں سے اپنے گھر پہنچا دو روز میں بخار میں مبتلا رہا۔ تیسرے روز آپو جی کو ڈرتے ڈرتے یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا۔

"وہ ضرور میاں پوترو تھی۔ خبردار جو تو اب کبھی کمپنی باغ گیا۔"

بخار سے اٹھا تو ایک روز امرود توڑنے گمٹی منڈی والے قبرستان میں نکل گیا یہ قبرستان ہمارے محلے کٹڑہ مہاں سنگھ کے پاس ہی تھا امرتسر کے قبرستانوں میں بھی لوگوں نے پھلوں کے باغ لگا رکھے تھے لوکاٹ، امرود آلوچہ، ناشپاتی، فالسہ اور شہتوت کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُگے تھے۔ بیچ بیچ میں قبریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ بڑے بہشتی تھے امرتسر کے آسودگانِ خاک بھی ایک چھوٹی سی نہر گمٹی منڈی والے قبرستان کے پہلو سے ہو کر گزرتی تھی اور پیچھے درختوں سے ٹپکے ہوئے پھل اس نہر میں تیرتے چلے آتے اور ہم پانی میں اتر کر انہیں نکال کر کھایا کرتے تھے۔ عید کی صبح کو ہم منہ اندھیرے قبروں پر جا کر موم بتیاں روشن کرتے اگر بتیاں جلاتے اور گیندے گلاب کے پھول بکھیرتے اور درختوں سے کیسری رنگ کی لوکاٹیں اور کچے پکے امرود توڑ کر بھی کھاتے۔

میں دروازہ مہاں سنگھ سے نکل کر تکیہ سنی سہ در کی طرف چلا ساون کی گھٹا نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی تکیئے کے قریب سے گزرا تو بوڑھی مائی کی سریلی آواز سنائی

دی۔ وہ گویا پکار رہا تھا۔

ایہہ بدل جو گئے سنے
دھوئیں میرے دل والے
اسمانیں چھائے سنے

امرتسر کی گھٹاؤں کے بادل واقعی دلوں سے اٹھ کر آسمان پر چھایا کرتے تھے یہ دھواں نہ دل سے اٹھتا ہے نہ جاں سے اٹھتا ہے اور نہ ہی باورچی خانوں سے اٹھتا ہے اگر کہیں سے اٹھتا ہے تو ادنی بس والوں کی گاڑیوں سے۔ برج بھولا سنگھ کو پیچھے چھوڑ کر میں اس چھوٹی سی سڑک پر آگیا جو قبرستان کو جاتی تھی۔ دائیں بائیں پھلوں کے باغ شروع ہو گئے۔ طوطوں کی قطاریں امرود کے درختوں کو جا رہی تھیں میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو گیا ہوا میں قبروں پر سلگتی اگربتیوں کے ساتھ ساتھ امرودوں کی خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ اچانک میری نظر ایک سیاہ ناگ پر پڑی جو مجھ سے پچاس، ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک قبر میں سے آدھا باہر نکلا پھن اٹھائے کھڑا جھوم رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے میں اسی جگہ خوف زدہ ہو کر ساکت ہو گیا۔ سانپ کا پھن چوڑا تھا اور اس کا رخ میری طرف تھا اگرچہ وہ مجھ سے کافی دور تھا۔ پھر بھی میں نے پیچھے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا جب کافی پیچھے چلا گیا تو دل میں ایک احمقانہ سی خواہش پیدا ہوئی کہ عقب سے جا کر سانپ کو دیکھا جائے میں ندی پھلانگ کر لوکاٹ کے درختوں میں سے ہوتا ہوا سانپ والی قبر کے عقب میں جا نکلا میں اب بھی اس قبر سے کوئی چالیس پچاس گز کے فاصلے پر تھا مجھے سانپ کہیں نظر نہ آیا خدا جانے کہاں چلا گیا تھا بچپن کا شوق فضول اور جرأت رندانہ مجھے کشاں کشاں قبروں میں آگے ہی آگے کھینچتی لے گئی گھاس اور جنگلی پھولوں میں چھپی ہوئی قبریں خاموش تھیں۔ سرہانے کے پتھروں اور بنیوں سے موم بتیوں کی پگھلی ہوئی موم چمٹی تھی میں رک گیا اب مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ اگر یہیں کسی قبر سے کالا سانپ نکل آیا تو کیا ہوگا میں پیچھے کو دوڑا اور ندی پر آ کر دم لیا۔ ندی کے گدلے پانی میں ایک کچا آم تیرتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے پانی میں اتر کر اسے اٹھایا اور مزے سے کھاتا ہوا امرودوں کے جھنڈ کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر اپنے مرحوم دوست اختر کی دیوانی والدہ پر پڑی اس نے میلا کچیلا سفید برقع اوڑھ رکھا تھا نقاب اٹھا تھا اس کے سفید بالوں کی ایک لٹ لٹک رہی تھی اور وہ اپنے لخت جگر کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ پھر ایکا ایکی

اس نے بین کرتے ہوئے ایک دلدوز چیخ ماری۔

ایک چیخ گویا میرے اندر سے بھی نکلی اور میں دہشت زدہ ہو کر وہاں سے دوڑا میں درختوں سے بچتا جھاڑیاں پھلانگتا بھاگا چلا جا رہا تھا کہ کسی شے سے ٹھوکر کھا کر تھوہر کی کانٹے دار جھاڑی میں گر پڑا بے شمار کانٹے میرے بدن میں چبھ گئے۔ میرے جسم کو درد نے جیسے جکڑ لیا میں پھر بھی بھاگتا چلا گیا قبرستان کی حدود سے باہر نکلا تو ایک سادھو نے مجھے روک لیا۔ شاید اس نے میرے جسم میں چبھے کانٹوں کو دیکھ لیا تھا۔

"ٹھہر جاؤ، یہ تھوہر کے کانٹے ہیں اگر دیر کر دی تو یہ بدن کے اندر چلے جائیں گے۔"

سادھو نے مجھے کنوئیں کے پاس پیپل کے درخت تلے بٹھا لیا اور بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک ایک کر کے میرے کانٹے نکالنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں تھوہر پر کیسے گر پڑا۔ میں نے کہا۔

"میاں پوترو نے ڈراں تے۔"

پھر میں نے اسے بتایا کہ میاں پوترو چڑیل میرے مرحوم دوست اختر کی ماں کا روپ بدل کر قبرستان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سادھو کی باتیں مجھے یاد نہیں رہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اس نے کمال دردمندی کے ساتھ میرے جسم کے سارے کانٹے نکال دیئے تھے اور پھر مسکراتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے چل دیا تھا۔ میں سادھو کا چہرہ بھی بھول گیا ہوں لیکن اس کے ہاتھ کے لمس میں جو انسانی ہمدردی اور دکھ درد میں کسی انسان کے کام آنے کا جذبہ موجزن تھا اس کی گرمی میں آج بھی اپنے جسم میں محسوس کرتا ہوں۔

میں نے ڈر کے مارے گھر آ کر کسی کو یہ واقعہ نہ سنایا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میاں پوترو میرے مرے ہوئے دوست اختر کی ماں کے روپ میں آگئی ہے اور یہی ممتا کی ماری راتوں کو سنسان گلیوں میں مکان کے باہر نہ کھڑی ہو اور مجھے آواز دے کر پتھر نہ بنا دے لیکن اختر کی ماں کو پھر کسی نے اپنے محلے میں نہیں دیکھا تھا وہ ادھر آتی ہی نہیں تھی۔ دیوانگی کی حالت میں قبرستانوں، ویرانوں میں گھوما کرتی تھی۔ دیوانگی کی حالت میں قبرستانوں، ویرانوں میں گھوما کرتی تھی۔ اور یا پھر میرے خیال کے مطابق سردیوں کی سنسان راتوں میں شہر کی گلیوں میں اپنے پیارے بیٹے کو بین کرتی آواز میں بلایا کرتی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ ہم بڑے ہوئے تو امرتسر کے گلی کوچوں سے میاں پوترو کی رو غائب ہو چکی

تھی۔ صرف اس کی ایک دہشت ناک یاد باقی تھی اور مائیں اب بھی اپنے بچوں کو میاں پوترو کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ آپو جی کی زبانی معلوم ہوا کہ میاں پوترو واپس کشمیر جا چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اختر کی دیوانی ماں بھی اپنے مردہ بیٹے کی تلاش میں ویرانوں اور قبرستانوں میں ماری ماری پھرتی، اُسے پکارتی، اس کی یاد میں بین کرتی کہیں گم ہو گئی۔ کہیں کھو گئی۔ شاید اسے اس کے لختِ جگر نے اپنے پاس جنت میں بلا لیا تھا۔ سب مائیں جنت میں جاتی ہیں۔ اور جن کے کمسن بچے وہاں پہنچ جائیں وہ تو اپنی ماؤں کے لئے جنت میں لعل و گہر کے محل بنا کر ان کا انتظار کرتے ہیں۔

ضرور میاں پوترو بھی جنت میں گئی ہو گی۔ کیا ہوا جو وہ چڑیل تھی۔ آخر وہ بھی ایک ماں تھی. جس کے بچے پرانی کوتوالی کی عمارت کے نیچے آ کر مر گئے تھے۔ وہ بھی تو راتوں کو اپنے بچھڑے ہوئے بچوں کو رو رو کر آوازیں دیا کرتی تھی۔

"میرے بچو! میرے بچو!"

وقت کا پہیہ کچھ اور گھوما۔ پاکستان بن گیا۔ امرتسر ہم سے بچھڑ گیا۔ سب کچھ وہیں رہ گیا صرف یادیں ہمارے ساتھ آ گئیں۔ ان میں میاں پوترو چڑیل کی یاد بھی ہے۔ امرتسر کی مائیں شاید اب اپنے بچوں کو میاں پوترو کا نام لے کر نہ ڈراتی ہوں لیکن ان کے دلوں میں میاں پوترو کی یاد آج بھی زندہ ہو گی۔ میاں پوترو چڑیل کی یاد میرے دل میں بھی زندہ ہے مگر مجھے اب اس سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ اب میں بچہ نہیں رہا۔ شاید اس لیے کہ اب تو امرتسر کی چڑیلیں بھی خوبصورت لگتی ہیں۔

پھر بھی کبھی کبھی لاہور شہر کی کسی سڑک، کسی گلی، کسی باغ کسی قبرستان میں سے گزرتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی عورت نے پیچھے سے آواز دی ہو۔

"میرے اختر!"

اور میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اس لیے نہیں کہ میں پتھر نہ ہو جاؤں بلکہ اس لئے کہ جس میاں پوترو نے مجھے آواز دی ہے کہیں وہ میری شکل دیکھ کر پتھر نہ ہو جائے۔

امرتسر کا ایک درویش

امرتسر کے ہال دروازے سے باہر نکل کر جب آپ داہنی جانب کو ہوں تو پیر تیاہر ولی کے مزار کے پہلو میں ایک نالے کا چھوٹا سا پُل عبور کر کے سامنے انجمن پارک کا ریتلا میدان آ جاتا ہے۔ یہ میدان ریلوے کے اُونچے پُل کی ڈھلانوں کے سائے میں ہے۔ ان ڈھلانوں پر سڑک کی اترائی کے ساتھ ساتھ لوہے کا جنگلہ لگا ہے جس پر یوکلپٹس کے گھنے درختوں کا سایہ پھیلا ہوا ہے۔ کونے میں ایک چھوٹی سی مسجد ہوا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک کنواں اور اکھاڑہ بھی تھا۔ انجمن پارک امرتسر کی سیاسی اور سماجی زندگی کی آماجگاہ تھی۔ یہاں اگر ایم اے او کالج اور ڈی اے وی کالج کے معرکہ خیز کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے تو مجلس احرار مسلم لیگ اور نیلی پوشوں کے ہنگامہ پرور جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔ کرکٹ میچوں میں ایم اے او کالج کے دینیات کے استاد حافظ نور شاہ صاحب زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے اور تسبیح کا ورد کرتے ہوئے دعا پڑھ پڑھ کر مروت حسین شاہ کو باؤلنگ کرتے ہوئے دور سے پھونکیں مارا کرتے جب ہندو کالج کی وکٹ اڑتی تو حافظ نور شاہ اپنے خاکی کوٹ اور خاکی کلہ پگڑی میں بانہیں پھیلا کر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے اور دوبارہ دھڑا دھڑ تسبیح اور دعاؤں کا ورد شروع ہو جاتا۔ مجلس احرار اور مسلم لیگ کے جلسوں میں لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر اسلام زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے اور ڈٹ کر تیل کے قیمے والے پکوڑے اور نان چھولے کھاتے۔ کیا مجال جو کسی کے گلے میں خراش تک بھی پڑتی۔

دلی بمبئی سے کوئی سرکس امرتسر آتا تو انجمن پارک کے میدان میں آ کر اترتا۔ تمبو، تنبو تن جاتیں۔ جھولداریاں لگ جاتیں خاردار جنگلوں کی دوسری طرف زنجیروں سے بندھے ہوئے قوی ہیکل ہاتھی گھاس کے ڈھیروں کے پاس جھومتے نظر آتے۔ پنجروں میں بند شرارتی بندروں کی خوخو کی

آوازیں آتیں کبھی کبھی کسی بوڑھے شیر کی نحیف سی "ہوں ہاں" بھی سنائی دے جاتی۔ سرکس کے درمیانی میدان میں ادھر اُدھر بیتیں گاڑنے اور جانوروں کو چارہ ڈالنے میں معروف دکھائی دیتے۔ ہم رات کو سرکس میں کرتب دکھانے والوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں خاردار جنگلوں کے پاس کھڑے رہتے مگر وہ لوگ سوائے رات کے دن کو کبھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ انجمن پارک کے مشرق میں سبیل نور تھی جس کی ٹونٹیوں سے ہم منہ لگا کر پانی پیا کرتے تھے اور جس کی اونچی چھت پر مناروں کے قریب کھڑے ہو کر ہم سرکس والوں کے چھپے ہوئے شیر کو دیکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ مغربی جانب گندے نالے کے پار پرل ٹاکیز کی پرانے طرز کی اونچی لمبی عمارت کھڑی تھی۔ اسے جہان سنگھ کا منڈوا بھی کہتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ تھیٹر تھا۔ اور الفریڈ تھیٹریکل اور کورنتھین تھیٹریکل کمپنیاں اس کی سٹیج پر آغا حشر کے کھیل کھیلا کرتی تھیں۔ اندر سے اس کی گیلری یوروپ کے تھیٹر گاہوں کی طرح بڑی منقش اور قدیم سٹائل کی تھی۔ سینما کو عروج حاصل ہوا تو اس کی سٹیج پر پردہ لگا کر رنجیت مووی ٹون کا "بھولا شکار" "طوفان میل" "روپ بسنت" پربھات سینے ٹون کی "سیرندھیری" "استریوں کا راج" اور "پڑوسی" ایسی فلموں کی نمائش شروع ہو گئی نیو تھیٹرز کی "دھوپ چھاؤں" "منزل" "ڈاکو منصور" اور "دیوداس" کی نمائش بھی اسی سینما ہاؤس میں ہوئی تھی۔ امرتسر کا یہ بڑا پرانا اور سب سے پہلا تھیٹر ہاؤس تھا۔

گندے نالے کی اس جانب ڈنڈے شاہ کا تکیہ اور تھوڑی سی آبادی تھی۔ اس آبادی کے مکانوں کی کھڑکیاں اور اکثر کے دروازے گندے نالے کے داہنے کنارے پر کھلتے تھے۔ تکیہ ڈنڈے شاہ میں جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے پکی اینٹوں کی دو چار قبریں، ایک اکھاڑے اور دھریک اور نیم کے سایہ دار درختوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔ ہاں ذرا پرے مسجد ڈُھر کے قریب ہی ایک اونچے چبوترے پر کسی بزرگ کا مزار ضرور تھا جس کے درخت پر سبز اور سفید جھنڈے ہوا میں پھڑپھڑایا کرتے تھے۔

امرتسر کے جس درویش کی میں یہاں کہانی بیان کرنے لگا ہوں اُن کا مکان بھی اسی تکیہ ڈنڈے شاہ کی آبادی میں تھا۔ مکان کیا تھا بس گندے نالے کے کنارے کچی پکی اینٹوں کی ایک کوٹھڑی تھی جس پر کھپریل ڈال کر گارا پھیر دیا گیا تھا۔ اُس درویش کا نام حافظ شفیع تھا۔ اور اس جھونپڑی نما مکان

میں غالباً اُن کی بوڑھی والدہ صاحبہ رہا کرتی تھیں حافظ صاحب والدہ کی بے حد خدمت کیا کرتے۔ حافظ صاحب بڑے زندہ دل محفل پرست، پرہیزگار، ہنس مکھ اور قناعت پسند درویش تھے۔ پان تمباکو قوام والا کھاتے۔ تمباکو بالکل نہ پیتے۔ چائے خود بنا کر اور اُس میں زعفران ڈال کر پیتے اور دوستوں کو پلاتے۔ تھوڑی تھوڑی طبابت بھی جانتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مریض آ جاتا تو اُسے اپنے پاس سے دوائی خرید کر اور گھوٹ کر بھی دیتے حافظِ قرآن تھے اور نماز پنج وقتہ ادا کرتے تھے۔ دبلا پتلا چھریرا بدن ستواں ناک، باریک ہونٹوں کے پیچھے بھنی ہوئی مونگ پھلی کے دانوں ایسے ہموار دانت فرنچ کٹ مختصر سی داڑھی اور باریک مونچھیں۔ نرم چمکیلے سیاہ بالوں کے پٹے گھر میں دُھلی ہوئی بغیر استری کی قمیض اور شلوار، پاؤں میں باٹا کی چپل۔ سردیوں میں لوئی کی بکل مار کر ساری سردیاں گزار دیتے ہرن ایسی بڑی بڑی آنکھوں میں سُرمے کی لکیر اور ہونٹوں پر ہر دم کھیلتی زندہ دلی کی مسکراہٹ۔ یہ تھے ہمارے درویش دوست حافظ شفیع۔

انہوں نے مسجد شیخ خیر الدین مرحوم میں ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ یہ ہال بازار میں میوہ منڈی کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ مسجد خیر الدین میں داخل ہوتے ہی ایک چھتی ہوئی ڈیوڑھی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس ڈیوڑھی میں ہر موسم میں ٹھنڈا ٹھنڈا اندھیرا چھایا رہتا۔ کونے والے ستون پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس ستون کے پہلو میں ایک حجرہ تھا جس میں حافظ شفیع کا ڈیرا تھا۔ حجرے میں ایک صف بچھی تھی۔ کونے میں ایک جازم پر صندوقچی رکھی تھی۔ الماری میں شرع، فقہ اور حدیث شریف کی پرانی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ ایک دُھسہ۔ دو جوڑے قمیض شلوار اور ایک پرانا بستر۔ یہ حافظ شفیع کی کل کائنات تھی۔ میں سردیوں میں عشا کی نماز کے بعد حافظ صاحب سے ملنے اُن کے حجرے میں جاتا۔ مسکرا کر سر کو والہانہ انداز میں جھٹکتے اور کہتے۔

"سبحان اللہ!"

یہ اُن کا تکیہ کلام تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب انہیں والدہ کے انتقال کی خبر ملی تو اُس وقت بھی انہوں نے سر کو آہستہ سے جھٹک کر کہا تھا۔

"سبحان اللہ!"

میں لکڑی کی پرانی صندوقچی کے پاس جازم پر کشمیری فرد کی بکل مار کر بیٹھ جاتا۔ حافظ

صاحب فوراً دھواں کھائے سماوار میں کوئلے ڈالتے۔ کاغذ جلا کر اس میں آگ سلگاتے اور پانی میں چائے کی پتی ڈال دیتے۔ جب حجرے کی فضا میں چائے کی پتی ڈال دیتے۔ جب حجرے کی فضا میں چائے کی مہک اڑنے لگتی اور سماوار کی ٹونٹی بھاپ دینے لگتی تو الماری میں سے سبز پتوں والے چینی پیالے نکالتے۔ ایک نسواری شیشی کا ڈھکن بڑی احتیاط سے کھول کر اُسے سونگھتے اور آنکھیں بند کر کے سر ہلا کر کہتے۔

"سبحان اللہ"

پھر مجھے سنگھاتے اور کہتے۔

"بٹ صاحب اسے کہتے ہیں اصلی زعفران"

تھوڑا تھوڑا زعفران وہ دونوں پیالیوں میں ڈالتے۔ اور چائے کی محفل گرم ہو جاتی حافظ صاحب رومی اور شیخ سعدی کے فارسی شعر سنانے لگتے۔ وہ رومی اور سعدی کے عاشق تھے میں نے بہت کم لوگوں کو اتنی محبت سے زعفرانی چائے پیتے اور رومی و سعدی کے شعر پڑھتے دیکھا ہے۔ چائے کے بعد وہ کسی لڑکے کو بھیج کر چوک سے پان منگواتے۔ بڑے سلیقے سے پان منہ میں رکھ کر جیب سے رومال نکال کر ہونٹوں کے کنارے پونچھتے اور جھوم کر کہتے۔

"سبحان اللہ! قوام چوک والا ہی بنا سکتا ہے"

اگر میں یہ کہوں کہ حافظ شفیع کو زندگی اور خدا کی نعمتوں سے پیار تھا اور وہ ان چیزوں کی قدر کرتے تھے تو یہ تکلف ہوگا۔ دراصل حافظ صاحب زندگی اور خدا کی نعمتوں کا ایک حصّہ تھے۔ وہ کسی اچھائی یا نیکی کے کام کو اصول سمجھ کر سرانجام نہیں دیتے تھے بلکہ یہ فعل خود بخود اُن سے ہو رہا تھا۔ اور اصول بنتے چلے جا رہے تھے۔ اصل میں وہ زمانہ ہی اچھے افعال کا تھا۔ اصولوں کی تبلیغ کا نہیں تھا۔ حافظ صاحب معمولی سے معمولی کام کو بھی اس طرح کرتے جیسے وہ کسی بہت بڑی ایجاد کی بنیاد رکھ رہے ہوں وہ سڑک پر اس مزے سے چلتے جیسے دلدلوں میں سے نکل کر پہلی بار پکی سڑک پر قدم رکھ رہے ہوں۔ بانگ اس طرح لہک لہک کر کرتے گویا ایک مدت کی خاموشی کے بعد انہیں پہلی بار زبان ملی ہو۔ چائے یوں شوق سے پیتے جیسے وہ اُن کی آخری پیالی ہو اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بس یہی کوئی تیس پینتیس برس کے ہوں گے ایک بال بھی سفید نہیں تھا۔

پتلے دُبلے بدن میں ہرن ایسی چُستی تھی جیسے خون میں محنت اور حلال کی کمائی گردش کر رہی تھی۔ مسجد میں آئی ہوئی روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد جھونپڑی پر کسی دوسرے نے قبضہ جمانا چاہا تو آپ نے اپنا بستر سر پر اٹھایا اور "سبحان اللہ" کہہ کر مسجد خیرالدین میں آ کر ڈیرہ جما لیا۔ اُن کی شرع، حدیث شریف اور فقہ کی باتوں کے اسرار و رموز میری ناپختہ سمجھ سے باہر تھے۔ میں اُن کی درویشانہ مسکراہٹ، اور اچھی اچھی باتوں کا شیدائی تھا۔ رمضان شریف میں وہ تحصیل پورے والی مسجد میں تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ ایک بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ مسجد تحصیل پورے کی مسلمان آبادی میں ایک گلی کے کونے پر تھی۔ حجرے میں دو تین مولوی صاحبان بیٹھے ڈاڑھیوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر بڑے جوش و خروش سے باتیں کر رہے تھے میں نے بھی کندھوں پر مدینے شریف کا بسنتی رومال ڈال رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ایک مولوی صاحب نے حافظ شفیع سے پوچھا۔

"یہ برخوردار بھی حافظِ قرآن ہیں کیا؟"

اور حافظ شفیع نے بلا جھجک کہا۔

"جی ہاں! جی ہاں! سبحان اللہ"

بعد میں جب میں نے پوچھا کہ حافظ صاحب آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟ تو سر ہلا کر بولے

"سبحان اللہ! خدا جھوٹ نہ بلوائے"

میں پہلی صف میں حافظ شفیع کے پیچھے کھڑا ہو کر تراویح پڑھتا۔ تراویح کے بعد جب انہیں دودھ سے بھرا ہوا گلاس ملتا تو پہلے آدھا مجھے پلاتے اور جھوم جھوم کر کہتے۔

کیوں خواجہ صاحب! اسے کہتے ہیں خالص دودھ میں نے اُن کی جیب میں دو تین آنوں کے سوا کبھی ایک پائی نہ دیکھی تھی۔ انہیں فالتو پیسے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ حجرے میں وہ بچوں کو فارسی اور قرآن شریف پڑھاتے مگر اُن سے کچھ نہ لیتے۔ مسجد خیرالدین کا فرش دھوتے۔ برآمدوں میں جھاڑو دیتے۔ سقاوے صاف کرتے۔ نماز کے وقت بچوں کے ساتھ مل کر صفیں بچھاتے لیکن مسجد میں گلی محلے سے جو طرح طرح کے کھانے آتے اُن میں سے ایک لقمہ تک نہ لیتے۔ جو تھوڑی بہت طبابت انہوں نے سیکھ رکھی تھی بس اُسی پر

قناعت تھی۔ دو چار آنے کی دوائیں روز بک جاتی تھیں۔ تنور سے دال روٹی منگوا کر ہم حجرے میں بیٹھ کر کھا لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر سماوار میں چائے کے لئے کوئلے سلگانے لگتے۔

ایک بار ہال بازار کے مشہور لکھ پتی تاجر نند لعل کا اکلوتا لڑکا کندن لعل سخت بیمار پڑ گیا۔ وہ میرا ہم جماعت بھی تھا۔ اُس کے پیٹ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی اور حالت روز بروز تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی نند لعل اپنے بیٹے کندن لعل کے لیے انتہائی پریشان ہو گیا۔ اُس نے گھر پر امرتسر، جالندھر اور لاہور کے نامی گرامی ڈاکٹروں کو جمع کر لیا۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ یہ سارے ڈاکٹر مل کر بھی کندن لعل کی بیماری کو دور نہ کر سکے۔ اُس کی حالت بگڑتی چلی گئی میں نے کندن لعل کے پتا جی سے کہا کہ حافظ صاحب کو بھی دکھا لیں کیا خبر اللہ شفا دے دے۔ لالہ جی خود حافظ صاحب کو لے کر گھر آئے۔ کندن لعل کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ دنوں ہی میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور نقاہت کے عالم میں ایک شاندار پلنگ پر لیٹا نحیف سانس لے رہا تھا۔ اُس کی ماتا جی سرہانے سر جھکائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ میز پر بڑی بڑی قیمتی دوائیں پڑی تھیں۔ لوہے کی الماریوں اور آہنی سیفوں میں ہزاروں روپے کے زیورات بند پڑے تھے مگر کندن لعل کو کوئی نہ بچا سکتا تھا۔

حافظ صاحب کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر ماتا جی نے سفید ساڑھی کا گھونگھٹ سا نکال لیا۔

حافظ شفیع نے بسم اللہ پڑھ کر کندن لعل کی نبض ٹٹولی اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر مسکرائے اور نند لعل سے بولے۔

"فکر نہ کریں لالہ جی! بچہ اچھا ہو جائے گا۔ سبحان اللہ!"

پھر جیب میں سے ٹین کی ایک ڈبیا نکال کر اُسے کھولا۔ اس میں سے ننھی منھی چھ پڑیاں نکال کر میز پر رکھیں اور کہا۔

دو دو گھنٹے بعد پانی کے ساتھ ایک پڑیا دیتے جائیں۔ اللہ شفا دے گا خدا کی قدرت کہ اگلے روز کندن لعل کی حالت سنبھل گئی۔ حافظ شفیع نے مزید چھ پڑیاں بھجوا دیں۔ تیسرے روز کندن لعل پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا چوتھے روز وہ اپنے گھر میں چل پھر رہا تھا اور پانچویں دن وہ

اپنے والد کی دکان پر بیٹھا تھا۔ لالہ نند لعل اُسی روز اپنے لختِ جگر کو لے کر حافظ صاحب کے پاس حجرے میں حاضر ہوا۔ میں بھی وہیں شال کی بکل مارے صف پر بیٹھا تھا۔ حافظ صاحب سماوار میں کوئلے سلگا پنکھے سے ہوا کر رہے تھے لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر بندگی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ دو زانو ہو کر بڑے ادب سے صف پر بیٹھ گئے۔ حافظ شفیع نے مسکرا کر کہا۔

"خدا نے آپ کے بچے کو شفا دے دی۔ سبحان اللہ"

لالہ نند لال بچھا جا رہا تھا۔ بڑے انکسار سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"حافظ جی! میں آپ کی دوا کے پیسے دینے آیا ہوں۔ انہیں قبول کیجئے" اس کے ساتھ ہی لالہ جی نے جیب سے سو سو روپے کے بیس نوٹ نکال کر حافظ شفیع کے قدموں میں رکھ دیئے۔ حافظ شفیع نے نوٹوں کو دیکھا۔ پھر لالہ جی کو دیکھا اور سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"مگر لالہ جی! میری دوا تو تین آنے کی تھی"

میں وہ منظر ساری زندگی نہیں بھول سکتا کہ کس طرح امرتسر کا لکھ پتی تاجر لالہ نند لعل حافظ شفیع کو دو ہزار روپے قبول کرنے پر اصرار کر رہے تھے اور حافظ شفیع کس بے نیازی سے صرف تین آنے لینے پر بضد تھے دو ہزار روپے ۱۹۴۵ میں بیس ہزار سے کم نہ تھے۔ آخر لالہ جی کو سارے نوٹ واپس لینے پڑے اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے تین آنے نکال کر حافظ جی کے قدموں میں رکھ دیئے۔ اُس وقت لالہ جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے فرطِ عقیدت سے حافظ شفیع کے پاؤں کو چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے پر لگائے۔ جب لالہ جی چلے گئے تو حافظ شفیع نے پنکھا صف پر پھینک کر دروازے میں سے سر باہر نکال کر دیکھا کہ لالہ جی مسجد سے نکل گئے ہیں! پھر جو پلٹے تو اُن کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ بچوں کی طرح مسرور ہو کر بولے۔

"سبحان اللہ! آج کی روٹی کا بندوبست ہو گیا بٹ صیب"

آج کی روٹی ــ یعنی دو پیسے کی دو روٹیاں اور پیسے کی دال ـــــ کسی وقت ہم دونوں کمپنی باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ راستے میں کوئی جنازہ مل جاتا تو حافظ شفیع کلمہ شریف

پڑھ کر اس طرف لپکتے اور کندھا دے کر ساتھ ہو لیتے میں بھی اُن کے ساتھ ہو جاتا۔ محلے میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو حافظ شفیع بن بلائے ہی وہاں پہنچ جاتے۔ دریاں بچھا رہے ہیں۔ قناتیں لگا رہے ہیں۔ دسترخوان جھاڑ رہے ہیں۔ مٹکوں میں پانی ڈلوا رہے ہیں براتیوں کو پانی پلا رہے ہیں تھال بھر بھر کر پلاؤ اندر لے جا رہے ہیں اور جب برات چلی جاتی تو عمر تنور والے کی دکان پر آ کر دو روٹیاں اور دال لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیتے۔ صبح صادق کو اٹھ کر مسجد میں اذان دیتے مسجد کے صحن میں جھاڑو دیتے اور منبر کو اپنے بسنتی رومال سے جھاڑتے۔ رمضان شریف میں سحری کے وقت محلے میں ہر گھر پر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتے اور صاحب خانہ کا نام لے کر اُسے جگاتے۔ افطاری کے وقت مسجد میں انواع و اقسام کے پھلوں اور کھانوں کے ڈھیر لگ جاتے مگر حافظ شفیع کو میں نے ہمیشہ نمک اور کھجور سے ہی روزہ افطار کرتے دیکھا۔ افطاری کے بعد میرے ساتھ ادا کرتے۔ تنور پر جا کر دال روٹی کھاتے اور پھر مجھے ساتھ لے کر تراویح پڑھانے تحصیل پورے والی مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ سارا رستہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے رومی اور سعدی کے شعر سناتے۔ زعفرانی چائے کے فوائد پر لہک لہک کر باتیں کرتے۔ سبحان اللہ! کیا لوگ تھے!

حافظ شفیع سے امرتسر میں میری آخری ملاقات ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو شریف پورے کے باہر ریلوے لائن پر ہوئی۔ امرتسر کے در و دیوار فسادات کی آگ میں جل رہے تھے۔ شہر پر ہندو سکھ فوج نے قبضہ کر رکھا تھا اور امرتسر کے مسلمان مہاجرین سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں شریف پورے سے پاکستان کی طرف جا رہی تھیں ہر شخص پریشان اور بے حال تھا۔ چہروں کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں ویران ہو رہی تھیں۔ کسی کا بیٹا شہید ہو گیا تھا تو کسی کا باپ۔ کسی کے بھائی کی لاش بے گور و کفن شہر کی کسی سڑک پر پڑی رہ گئی تھی۔ تو کسی کی بہن محلے کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر عزت کی موت مر گئی تھی۔ امرتسر جل رہا تھا۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جاری تھا۔

شریف پورے والی ریلوے لائن کے آس پاس مہاجرین کا سیلاب امڈ آیا تھا بلوچ رجمنٹ کے جوان مشین گنیں سنبھالے جالندھر اور بٹالے کی طرف پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے۔

شریف پورے کے آس پاس کی آبادی کو مہاجرین کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ شہر میں رہے سہے مسلمانوں کے پریشان حال قافلے یہاں جمع ہو رہے تھے۔ رات رات بھر شہر کی طرف سے ہندو اور سکھ فوجی اس کیمپ پر فائر کھول دیتے۔ سارے کیمپ پر ایک دہشت کی فضا طاری تھی۔ ہمارے خاندان کے تقریباً سبھی افراد پہلی گاڑی میں لاہور روانہ ہو چکے تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں کس لئے اکیلا شریف پورے میں رہ گیا تھا۔ بہر حال میں ریلوے لائن کے پاس دوسرے ہزاروں مہاجرین کے ساتھ پتھروں پر بیٹھا پاکستان جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا اتنے میں امرتسر ریلوے سٹیشن کی جانب سے چھک چھک کرتی خالی گاڑی آئی اور ہمارے پاس آ کر رُک گئی۔ بس اس کے بعد کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی کے اندر، باہر اور چھت پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح ہجوم میں گھس گھسا کر ایک ڈبے میں سوار ہو کر کسی کے سامان پر بیٹھ گیا میں ایک آدمی کی ٹانگ اور دوسرے آدمی کے بازو میں سے کھڑکی کے باہر کا کچھ منظر دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف ایک شور، ایک ہنگامہ اور ایک قیامت برپا تھی۔ اتنے میں میں نے حافظ شفیع کو دیکھا۔ وہ ایک میلا سا تھیلا کندھے پر ڈالے ایک طرف سگنل کے کھمبے کے پاس کھڑے تھے انہوں نے دو ایک بار گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش بھی کی مگر لوگوں نے انہیں دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ایک بار پھر چپ چاپ سے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے اور میں انہیں آواز نہ دے سکتا تھا گاڑی چل پڑی۔ نیچے کچھ لوگ بھاگ کر سوار ہونے لگے۔ میں نے دُور سے حافظ شفیع کو دیکھا۔ انہوں نے بھی لپک کر ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کی لیکن ایک آدمی نے جو پائیدان پر لٹکا ہوا تھا حافظ جی کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔ گاڑی اب شریف پورے سے آگے نکل آئی تھی۔ شریف پورہ کیمپ سے پاکستان آنے والی یہ آخری گاڑی تھی۔ اس کے بعد جو گاڑی بھی آئی اُسے کاٹ دیا گیا۔ کچھ دُور تک میں حافظ شفیع کو دیکھتا رہا۔ وہ ریلوے لائن کے قریب اکیلے کھڑے، تھیلا کندھے پر ڈالے چپ چاپ پاکستان کو جانے والی گاڑی کو تک رہے تھے۔ اُس وقت میں اُن کے پاس نہیں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ایک بار ضرور سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا ہو گا۔

"سبحان اللہ"

امرتسر کا اسد جو

نام اُس کا اسد جُو تھا۔

سردیوں میں وہ محلے کی ایک جھکی ہوئی چھت والی بوسیدہ اور اندھیری دکان میں ہریسہ بیچتا اور گرمیوں میں کوئی کام نہ کرتا عام طور پر وہ اس چلچلاتی دھوپ اور گرم لُو والے موسم میں کشمیر چلا جاتا جہاں امیرا کدل کے کسی قریبی گاؤں میں اُس کی رشتے میں کوئی پھوپھی رہا کرتی تھی۔ ستمبر کے شروع دنوں میں وہ کشمیر سے واپس امرتسر آتا تو اُس کا رنگ سرخ ہوتا وہ اپنے ساتھ کشمیر کے امبری سیب، بادام اور دو ایک لوئیاں ضرور لاتا۔ لوئیاں وہ محلے میں ہی کسی کے ہاتھ بیچ دیتا اور بادام اور سیب ہمسایوں میں بانٹ دیا کرتا۔ ایک بار ابا جی نے اسد جُو سے بھورے رنگ کی ایک لوئی خریدی اور اُسے منڈوا کر ہم بھائیوں کے کوٹ بنوا دیئے وہ اس قدر گرم تھے کہ پوہ ماگھ کی سردی میں ہمیں اُن میں گرمی محسوس ہوا کرتی۔ کئی سالوں تک اُن کوٹوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ اسد جُو اپنے لمبے کوٹ کی جھولا نما جیب میں دو تین لال لال کشمیری سیب نکال کر ابا جی کو دیتا اور کہتا۔

"خلیفہ! ایہہ خاص تیرے لئی تحفہ ای۔"

یہ امبری سیب جس کمرے یا دکان میں کاٹے اور چھیلے جاتے وہاں کی فضا اُن کی ٹھنڈی اور انتہائی شیریں خوشبو سے مہک اُٹھتی۔ اسد جُو صدری کی اندرونی جیب میں سے لکڑی کے دستے والا پرانا چاقو نکال کر سیب کی ایک قاش کاٹتا اور مجھے دے کر کہتا۔

"اھے کھا ادھے مے دے۔"

اسد جُو کا لہجہ ٹھیٹ کشمیری تھا۔ وہ کشمیری زبان بڑی روانی سے بولتا تھا۔ امرتسر کے کشمیریوں

کو کشمیر کی وادی سے ہجرت کئے ایک دو پشتیں گزر گئی تھیں۔ اور اب اُن کے گھروں میں صرف، نانیاں دادیاں یا بڑے بوڑھے ہی تھوڑی بہت کشمیری بولتے تھے لیکن اسد جُو کشمیر میں ہی پیدا ہوا۔ وہیں اُس نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ امیرا کدل والے اپنے گاؤں سے بوریا بستر اُٹھا کر امرتسر آگیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ اُسے کشمیر سے آئے اٹھارہ انیس برس ہو چکے تھے جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اُس وقت اسد جُو کی عمر پچاس برس سے دو ایک سال اوپر ہی تھی مگر اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ سرخ و سفید رنگ، اونچا لمبا چوڑے شانے، گھنی سیاہ بھنویں، تیز چمکدار عقابی آنکھیں۔ داڑھی صفاچٹ، رعب دار بھری بھری مونچھیں چوڑے کانوں کی سُرخ لویں، گویا ابھی خون ٹپک پڑے۔ پاؤں میں پمپ شو اور کبھی پشاوری چپل ہوتی۔ شلوار قمیض کے اوپر صدری پہن کر دُھسّہ یا شال اوڑھ لیتا۔ سر پر روس کے قازقوں والی چھت دار سموری ٹوپی چوڑے رُخ پہنتا تھا۔ دور سے یوں لگتا جیسے زارِ روس کی فوج کا کوئی پرانا تاتاری سپاہی چلا آرہا ہے۔ آواز کرخت اور پاٹ دار تھی۔ کبھی کبھی سردیوں میں پہلی جنگِ عظیم کے فوجیوں کی برانڈی سے بنی ہوئی جیکٹ پہن کر نیچے فلالین کا گرم پاجامہ پہن لیتا۔ سگریٹ بالکل نہ پیتا تھا۔ مگر حُقّے کا بڑا رسیا تھا۔ ہریسے کی دکان پر نے ہر وقت منہ میں لگی رہتی۔ تمباکو نے دانت خراب کر دیئے تھے۔ سر درمیان میں سے گنجا تھا۔ ارد گرد کے بالوں اور مونچھوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

سردیوں میں جس بوسیدہ دکان میں وہ ہریسہ بیچتا وہ ہمارے محلے میں پکی گلی کے سامنے تھی۔ دکان کے باہر ایک پرانا زنگ خوردہ بورڈ لگا تھا جس پر فارسی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

"یک پاؤ ہریسہ صبحگاہی
بہتر از ہزار مرغ و ماہی"

ہریسہ بنانے میں اُس کا شہر میں کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس کی دکان بڑی گندی اور گھٹی گھٹی سی تھی۔ چھت کی کڑیوں پر دھوئیں کی کالک جمی تھی اور جالے لٹک رہے تھے۔ کونے میں پانی کے دو مٹکے ہنڈولوں پڑے رہتے۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں اور جانے کس شے کی بوتلیں ٹنگی رہتیں۔ اندر داخل ہوتے ہی بائیں طرف ڈیڑھ فٹ اونچا اور کوئی چھ سات مربع فٹ چوڑا چبوترا تھا جس کے کناروں کی اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ اس چبوترے کے بیچ میں مٹی کا بڑا سا مٹ گڑا تھا جس کا

چبوترے کی سطح کے برابر رکھا نیچے بنی تھی۔ اس مٹ میں جانے کتنے سیر بکرے کا گوشت پینے کی دال اور انواع و اقسام کے مسالے ڈال کر اسد جو بھی کی ہلکی ہلکی آنچ پر رات بھر بڑے سے ڈنڈے سے گھوٹتا رہتا۔ رات کے پچھلے پہر ہریسہ پک کر تیار ہو جاتا اور اذان کے وقت گاہک آنا شروع ہو جاتے۔ اسد جو پو پھٹے کی ٹھٹھرتی سردی میں دکان کے پٹ جوٹے دھواں بھری دکان اندر گرم حمام بنی ہوتی۔ اسد جو آستینیں چڑھائے کفگیر سے جھک کر مٹ میں سے ہریسہ نکال کر فرائی پین میں ادرک ڈال گھی کا تڑکا لگاتا اور گاہک کے برتن میں پلٹ کر اوپر دو کباب رکھتا اور گرم مسالے کی چٹکی چھڑک دیتا۔ اکثر گاہک اپنا گھی ساتھ لاتے۔ میں بھی منہ اندھیرے کاکا ممدو کی دکان سے گرم گرم قلچے لے کر پیالی میں گھی لئے اسد جو کی دکان پر پہنچ جاتا سردی سے میرے دانت بج رہے ہوتے۔ لیکن اسد جو کی دکان کا پٹ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے کندھوں کے اوپر گرم لوئی ڈال دی ہو۔ دہکتی انگیٹھی کے آگے بیٹھے اسد جو کا چہرہ سرخ ہو کر پسینے میں چمک رہا ہوتا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کبابوں کے دیگچے پر صافی پھیر کر کہتا۔

"آگئی میری چھوٹی خلیفہ جی"

دکان کی چھت دھوئیں کے بادلوں میں چھپی ہوتی اور اندر گرم مسالوں کی تیز مہک پھیلی ہوتی میری آنکھوں میں پانی آجاتا اور تھوڑی ہی دیر بعد مجھے گرمی لگنے لگتی۔ لیکن ابا جی کا حکم تھا کہ مٹکے سے نکال کر جب ہریسہ سرد ہوا میں گھر لایا جاتا ہے تو اس کا اثر اڑ جاتا ہے۔ وہ خود اکھاڑے سے لوٹتے ہوئے وہیں بیٹھ کر ہریسہ کھاتے تھے۔ اسد جو میرے لئے ہریسہ نکال کر فرائی پین میں اسے گھی کا تڑکا لگاتا پھر میرے پیالے میں ڈال اس پر دو کباب رکھ کر گرم مسالے کی ہوائی چھوڑتا اور مجھے تھما کر کہتا۔

"منو کھاندی تے جان بناوندی چھوٹی خلیفہ جی"

چبوترے میں دھنسے بھاپ چھوڑتے ہریسے سے بھرے ہوئے مٹ کے آگے بیٹھا، بڑی بڑی مونچھوں اور پسینہ بھرے سرخ و سپید چہرے اور چوڑے شانوں والا اسد جو بڑی گرم جوشی سے ہریسہ نکال کر فرائی پین میں ڈال رہا ہوتا لالٹین کی روشنی میں اس کا بھوت نما سایہ کچی دیوار پر لہرا رہا ہوتا اور مجھے یوں لگتا جیسے وہ کوئی الف لیلےٰ کا جن ہے جو بھوتوں کو کھانا کھلا رہا ہے

ہریسہ کھا کر جب میں دھوئیں بھری بند دکان کی گرم فضا سے باہر نکلتا تو دسمبر جنوری کی یخ بستہ سردی میں بھی مجھے پسینہ آ رہا ہوتا۔

سورج نکلنے سے پہلے اسد جو کا سارا ہریسہ ختم ہو جاتا۔ پھر وہ اپنے لئے رکھی ہوئی ہریسے کی پتیلی ٹوٹی، ماری میں سے نکال کر اسے کم از کم تین چھٹانک گھی کا تڑکا لگاتا اور تین چار قلچوں کے ساتھ ڈٹ کر کھاتا۔ اس کے بعد وہ بوہڑ والی مسجد میں جا کر صبح کی نماز ادا کرتا اور مسجد کے حجرے میں لوئی اوڑھ کر سو جاتا۔ پھر میں سکول سے واپس آتا تو اسد جو کو شاد سنار کی دکان پر آمادہ بیٹھے دیکھتا۔ شاد سنار کی دکان پر پڑھے لکھے اور باذوق لوگوں کی ایک منڈلی آ کر بیٹھا کرتی تھی۔ ان میں گورے چٹے بھاری بدن اور بڑے خوبصورت ہموار موتیوں ایسے دانتوں والا بابو محمد حسین بٹ تھا۔ جو ریلوے میں ملازم تھا۔ بٹ صاحب کے گھر میں انگریزی پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میں جب بھول جاتا تو میرا کان مروڑ کر غصے میں کہتے۔

"کیا جھک مار رہے ہو"

جھک کے لفظ کو وہ پنجابی میں "جھنج" کہتے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ یہ لفظ ادا کرتے تو مجھے یوں لگتا جیسے ان کے منہ میں جھاگ بھرا ہوا ہے۔ وہ ہمارے مکان کے سامنے والی مسجد کے سقاوے میں نہایا کرتے تھے۔ وضو کرنے والی ٹونٹیوں کے آگے تھڑے پر بیٹھ کر پہلے تو مسواک کرتے۔ پھر کالی نوس ٹوتھ پیسٹ سے خوب جھاگ نکال نکال کر دانتوں کو صاف کرتے۔ وہ دانتوں کی صفائی اور صحت کا بے حد خیال رکھا کرتے تھے۔ آج کل غالباً وہ ملتان کے ریلوے آفس میں ہیں۔ سنا ہے کہ ان کے سارے دانت جھڑ گئے ہیں۔ ایک روز ماسٹر رفیق نعت خواں جیسے اپنا رنگ گورا کرنے کا بڑا شوق تھا۔ سقاوے میں نہا رہا تھا اور [illegible] نہیں لیتا تھا۔ بٹ صاحب تو تولیہ کندھے پر ڈالے حوض پر کھڑے بے چین ہو رہے تھے۔ جب ماسٹر رفیق تیسری بار صابن لگانے لگا تو بٹ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔

"ماسٹر رفیق اگر تم شملے میں اس طرح پانی ضائع کرتے تو تم پر حکومت ٹیکس لگا دیتی"

بٹ صاحب کو کلاسیکی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ شاد کی دکان پر [illegible] ٹوپی والے

مرنجاں مرنج شریف النفس بابو سعید احمد بھی یہ کرتے دو تین کہانیاں انگریزی میں ٹائپ کر کے بھی بھجوا رکھی تھیں جنکا کوئی جواب نہ آیا تھا۔ غالباً ضلع کچہری میں سٹینوگرام تھے شادی نہیں کی تھی۔ بیوہ بہن کے بچوں کی پرورش کر رہے تھے۔ بڑی شائستگی سے باتیں کرتے فسادات میں جب سکھوں نے کرپانیں سونت کر اُن کے گھر پہ حملہ کیا تو بابو سعید احمد ہاتھوں پر اُن کے وار روکتے رہے۔ اُن کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں اور کنپٹی سے لے کر کان کی لَو تک ایک گہرا زخم پایا۔ اس خوش ذوق منڈلی کا تیسرا رکن ایک ہندو تھا۔ جس کو یہ لوگ دت صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ رات بھی گورا چٹا، بھرے بھرے جسم والا ہندو لالہ تھا جس کے اوپر والے چار دانت ذرا اُونچے تھے جو بات کرتے ہوئے صاف نظر آتے۔ ایک دانت پر سونا چڑھا تھا۔ یہ شخص پکا راگ گا بھی لیتا تھا۔ کمل جھریا اور استاد عبدالکریم خان کا عاشق تھا۔ شاید بمبے والے کھوہ سے اپنے دوستوں کو ملنے شاد سنار کی دکان پر آیا کرتا۔

شاد سنار خود بڑا خوش ذوق، مرنجاں مرنج اور کم گو انسان تھا۔ حقہ بہت پیتا تھا۔ لاکھ میں جڑے ہوئے سونے کی چھلائی کر رہا ہو یا اخبار پڑھ رہا ہو حقے کی نے منہ میں دبی رہتی۔ تمباکو والے پان درجنوں کے حساب سے کھاتا تھا۔ سامنے اللہ بندے پان والے کی دکان تھی۔ اللہ بندہ پان سگریٹ بھی بیچتا اور گود میں رکھے لکڑی کے تختے پر ڈرائنگ کاغذ چپکائے پنسل سے اتاترک کی تصویر بھی بنا رہا ہوتا۔ کام کرتے کرتے حقے کی نے ہٹا کر شاد سنار آواز دیتا۔

"او یار اللہ بندے پان ہی کھلا دو۔"

اسد جُو ان خوش ذوق خوش مزاج لوگوں کی منڈلی کا ایک اہم جزو تھا۔ یہ لوگ عام طور پہ تیسرے پہر شاد کی دکان پر جمع ہو جاتے زیوروں سے بھری ہوئی چھت تک گئی لوہے کی الماری کے آگے بچھی ہوئی چاندنی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شاد پان منہ میں دبائے حقہ پی رہا ہوتا۔ قریب ہی بابو محمد حسین بٹ بابو سعید احمد اور دت بیٹھے بڑی گرم جوشی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہوتے کسی وقت دت ہاتھ کا زرت کر کے کوئی تان اڑا دیتا اور سبھوں کے سر جھوم جاتے۔ آہنی الماری کے پہلو میں اسد جُو چوکی پر بیٹھا سماوار کو خوب چمکا کر اس میں چائے کی پتی ڈال کر آگ سلگا رہا ہوتا۔ جب چائے پک جاتی تو سب مل کر بڑے شوق سے پیتے برسات ہو

گرمی ہو یا پالا پڑ رہا ہو۔ یہ خوش ذوق منڈلی تیسرے پہر شاد سنار کی دکان پر ضرور اپنی محفل جماتی۔ کبھی کبھی میں بھی بازار میں چور سپاہی کھیلتے کھیلتے ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ مجھے اُن کی باتیں یاد نہیں لیکن اُن کے باتیں کرتے ہنستے مسکراتے، قہقہے لگاتے، تانیں اڑاتے اور کسی تان پر جھوم جھوم کر سر ہلاتے چہرے ضرور یاد ہیں۔ چائے کی پیالیاں اُن کے ہاتھوں میں ہوتیں آنکھیں چائے کی گرمی اور گفتگو کی مسرت سے چمک رہی ہوتیں۔ اسد جُو بھی پیالی ہاتھ میں تھامے بڑی عقیدت سے اُن لوگوں کی باتیں سن رہا ہوتا۔ وہ اُن کی باتوں میں حصہ نہیں لیتا تھا مگر اُن کی ہر بات پر سر ضرور ہلا دیتا تھا۔ شام پڑے جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو شاد سنار الماری میں زیورات بند کرنے شروع کر دیتا اسد جُو دکان کے پھٹے پر ایک طرف بیٹھ کر سماوار میں سے چائے کی گیلی پتی نکال کر پیچھے پھینکتا۔ پھر اُسے راکھ سے مانجھ کر خوب چمکاتا اور دھلی دھلائی پیالیوں کے ساتھ لگے روزنگے سے الماری میں بند کر دیتا۔

عید میلادالنبی کے جلوس میں اسد جُو اپنی تاتاری ٹوپی میں چاند تارے کا تمغہ لگا سبز رنگ کا ہلالی پرچم ہاتھوں میں تھام لیتا۔ وہ جلوس کے آگے آگے عقابی آنکھیں بالکل سامنے گاڑے، چہرہ ساکت کئے، تنے تنے قدم اٹھاتے جرنیلوں ایسی شان سے چل رہا ہوتا۔ اُس کی ٹانگوں کی برجس رانوں پر سے پھولی ہوتی۔ کمر میں چمڑے کی پیٹی کے ساتھ تلوار لٹک رہی ہوتی۔ گلتھے پھڑک رہے ہوتے رخسار جوشِ اسلام سے تمتما رہے ہوتے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا اور بار بار اپنا منہ اوپر اٹھا کر اسد جُو کے مونچھوں بھرے لال لال چہرے کو دیکھا کرتا مجھے وہ کوئی سپہ سالار لگتا جو اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ دشمنوں پر دھاوا بولنے جا رہا ہو۔ ایک بار میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بلایا تو اسد جُو نے نظریں سامنے رکھے بائیں مونچھ کو پھڑپھڑا کر اتنی زور سے "ہوں ہوں" کہا کہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

محلے میں کوئی بیاہ شادی ہوتی تو اسد جُو کو شوربے کی دیگ پر بٹھلایا جاتا کیا مجال جو کسی کے پیالے میں مقدار سے بڑھ کر شوربہ چلا جائے یا ایک بوٹی بھی فالتو پڑ جائے۔ اسد جُو آستینیں چڑھائے ذرا ترچھی رکھی شوربے کی دیگ کے آگے پیڑھی پر بیٹھا ہوتا بڑا چمچ اسکے ہاتھ میں ہوتا۔ بڑے نپے تلے انداز میں پیالیاں شوربے سے بھرے جاتا۔ کوئی اچھی بوٹی دکھائی دیتی تو اُسے سب کے

سامنے منہ میں ڈال لیتا اور رومال سے مونچھیں پونچھ کر کہتا۔

"مَیں تے میرا تھرما ہوندا سی۔"

کسی روز وہ سرِ شام ہی دکان بڑھانے کے بعد بڑے کاکے کے تنور پر آجاتا۔ تنور کے پاس ہی بازار کے رُخ پر بچھے ہوئے پرانے تخت پوش پر وہ ٹانگوں پر لوئی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ محلے کے بچے اور بچیاں اُس کے آگے رومال بچھا دیتیں۔ کاکا تنور سے گرم گرم تافتانے گردے اور قلچے نکال نکال کر اسد جُو کے آگے پھینکے جاتا اور اسد جُو گا بکوں کو نمٹائے جاتا کوئی بچی شور مچاتی۔

"اسد جُو پیسے مجھے دو۔ پہلے میں آئی تھی۔"

اسد جُو مونچھوں کے پیچھے ہنستا اور بچی کے سر پر آہستہ سے دھوپ مار کر کہتا۔

"تینوں وی دے دیندی۔"

پھر وہ تنور پر رکھے حقے کی نے منہ میں ڈال کر اندر تکڑی میں میدے کے پیڑے تولتے ہوئے گامی کو آواز دیتا۔

"جلدی کر دی سی جلدی گامی۔"

فسادات میں جب محلے میں ہر طرف بے چینی پھیل ہوئی تھی اسد جُو کا سماوار ضرور گرم ہوتا تھا۔ پھر فسادات زیادہ شدت اختیار کر گئے۔ شاد سنار کی دکان پر تالہ پڑ گیا۔ وہ ہندو علاقے سے ہمارے محلے میں آتا تھا۔ دت نے بھی آنا بند کر دیا۔ شاد کی دکان پر سجنے والی زندہ دل محفلیں اُجڑ گئیں اسد جُو سماوار لے کر اپنی بوسیدہ چھت والی دکان میں چلا گیا۔ اُس نے امیرا کدل چلے جانے کی سوچی کی لیکن فسادات کی آگ راستے میں دیوار بنے کھڑی تھی۔ سارا محلہ ویران ہو گیا۔ چاروں طرف آگئیں بھڑک اٹھیں۔ چوک چوک میں قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ اسد جُو گلی کے بند دروازے پر ساری ساری رات پہرہ دیتا۔ ہمارے ساتھ وہ بھی گلی میں بند ہو گیا تھا۔ کرفیو کی دہشت زدہ راتوں میں دُور سے نعروں کی آوازیں اور گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں سنائی دیا کرتیں۔ ایک رات میں گلی میں ہی اپنی خالہ کے مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے چاچا قادری شال باف کی دکان کے تھڑے پر اسد جو کو بیٹھے دیکھا۔ بجھے ہوئے سماوار پر ایک ہاتھ رکھے وہ دکان کے بند دروازے سے ٹیک لگائے کھوئی کھوئی آنکھوں سے خلا میں تک رہا تھا۔ فضا میں تڑا تڑ فائر کی آوازیں

گونج رہی تھیں مجھے یوں لگا جیسے اداس اور غمگین اسد جو۔ اکیلا اور بے یار و مددگار اسد جو ——— بنی بادام کے شگوفوں سے لدی ہوئی وادیوں، اپنے ہنستے مسکراتے دوستوں اور اُن کی پُر جوش محفلوں کی سوگوار یاد میں گم ہے۔ چائے کی پیالی خالی چھوڑ کر محفل سے اُٹھ کر چلے جانے والوں اور پھر کبھی واپس نہ آنے والوں کے قدموں کے نشان کو ویران نگاہوں سے تک رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے اسد جُو کو پھر نہ دیکھا۔ کبھی کبھی دل میں ایک امنگ سی پیدا ہوتی ہے کہ کہیں سے اسد جُو کو ڈھونڈ کر لاؤں۔ اُسے اُس کے پیاری پیاری صورتوں والے دوستوں میں لا کر بٹھا دوں اور کہوں اے اچھے لوگو! اچھی اچھی باتیں کرو۔

اسے اسد جُو سماوار میں چائے کی پتی ڈال دے۔ اور جب کھولتی چائے خوشبو دینے لگے تو ایک پیالی مجھے بھی دینا۔

لیکن اسد جُو کھو گیا ہے۔ اُس کا سماوار کھو گیا ہے۔

امرتسر کا ایک گیٹ کیپر

آج میں آپ کو امرتسر کے ایک گیٹ کیپر کی کہانی سناتا ہوں۔

یہ کہانی امرت ٹاکیز سے شروع ہو کر لاہور کی فلیمنگ روڈ اور لاہور ہوٹل کے ارد گرد آکر ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے اس دردناک کہانی کے اجزائے ترکیبی کو امرت ٹاکیز میں مرتب ہوتے پروان چڑھتے، چلتے پھرتے دیکھا اور پھر لاہور ہوٹل اور فلیمنگ روڈ کے گلی کوچوں میں ان اجزا کے پرخچے اڑتے دیکھے۔ انہیں خاک و خون میں غلطاں دیکھا۔ میں اس کہانی کو امرتسر کے ایک پرانے سینما گھر امرت ٹاکیز سے شروع کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ شعلۂ جواب راکھ بن چکا ہے پہلے پہل اسی آتش کدے سے اٹھا تھا۔

ہال بازار امرتسر میں ایک بازار چوک گول ہٹی سے ہم والے بازار کی طرف مڑتا تھا۔ اسے کٹڑہ کھنیا لعل کہتے تھے۔ کٹڑہ کھنیا لعل کے چوباروں میں طوائفیں بیٹھا کرتی تھیں۔ دن بھر اس بازار کے لکڑی کے چھجے دار مکانوں کی کھڑکیوں پر چقیں پڑی رہتیں۔ شام ہوتے ہی بازار کی رونق شروع ہو جاتی چقیں اوپر اٹھ جاتیں کھڑکیوں میں کہیں بجلی کے قمقمے اور کہیں لالٹینیں روشن ہو جاتیں اور ان کی روشنی میں طوائفیں خوب بن سنور کر، سج دھج کر سرخی پاؤڈر تھوپے چوکیوں یا کرسیوں پر آکر بیٹھ جاتیں وہ بت بنی شو کیسوں میں رکھے ہوئے پلاسٹک کی گڑیوں کی طرح چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ کبھی گردن پھیر کر نیچے بازار میں آوازے کسنے والے تماش بینوں کو دیکھتیں ذرا سا مسکرائیں اور پھر بت بن کر بیٹھ جاتیں۔ کوئی پان چبا رہی ہوتی۔ کوئی سگریٹ پی رہی ہوتی۔ جس وقت کوئی طوائف اچانک اٹھ کر کھڑکی سے غائب ہو جاتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ کوٹھے پر تماش بین آگیا ہے۔ یہ تماش بین منہ سر چھپا کر کوٹھے کی اندھیری سیڑھیاں اوپر چڑھ جاتے اور تھوڑی دیر بعد جب

منہ سر چھپائے نیچے اتر کر بازار کے ہجوم میں گم ہو جاتا تو کوٹھے والی طوائف دوبارا پاؤڈر سرخی تھوپے کھڑکی میں آکر بیٹھ جاتی۔ مبو کی بیٹھک۔ روڑیاں والی گلی کے سامنے اسی بازار میں تھی۔ گوری چٹی، بڑا خوبصورت جسم سنہری بال اور نیلی نیلی نشیلی آنکھیں۔ اس کی بیٹھک کے نیچے اکثر تماش بینوں کا ہجوم رہتا اور عید بیساکھی پر تو مبو کو سر کھجانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ میں اُن دنوں ساتویں یا آٹھویں جماعت پڑھتا کرتا تھا اور ایم اے او سکول جاتے یا آتے ہوئے میں منہ اوپر اٹھا کر مبو کو ضرور دیکھ لیا کرتا مبو دن کو بھی بن سنور کر کھڑکی میں بیٹھا کرتی۔ مجھے وہ نیلی آنکھوں والی رومن شہزادی لگتی ہے جو اپنے سنہری بال کھولے، شاہی بجرے میں بڑی تمکنت سے جیسے دریائے نیل کے پرسکون پانیوں پر سیر کر رہی ہو اس کی ناک میں فیروزی ننھا سا نگینہ دن کو دھوپ میں اور رات کو بجلی کی روشنی میں دمک رہا ہوتا۔ بلاشبہ مبو کٹڑہ کھنیا لعل کی سب سے نازک اندام اور حسین طوائف تھی۔ پاکستان بننے کے کچھ ہی سال بعد میں نے اس رومن شہزادی کو ہیرا منڈی کی ایک گلی میں دیکھا کہ اس کا شاہی بجرا الٹ چکا تھا۔ محل کی زرنگار خواب گاہوں میں آگ لگ چکی تھی سنہری بالوں میں سفید راکھ اڑ رہی تھی۔ گورا چہرہ سوکھے ہوئے پرانے چمڑے کی طرح سکڑ گیا تھا۔ اور وہ آنکھیں جو کبھی نیلی اور شفاف ہوا کرتی تھیں اب گندے جوہڑ کے زنگار لگے پتھر کی طرح ہو گئی تھیں۔ عیاشی کے شعلوں نے اس کے جسم کے آتشدان کو وقت سے پہلے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اب یہ آتشدان ٹھنڈا تھا۔ اس کی اکھڑی ہوئی اینٹوں میں بجھی ہوئی سرد راکھ تھی اور دیوار پر دھوئیں کے جالے لٹک رہے تھے۔

مختار بیگم عرف داری امرتسر والی کی بیٹھک بھی اسی بازار میں تھی۔ یہ بیٹھک فرینڈز ہوٹل سے ایک مکان چھوڑ کر تھی۔ یہی وہ چوبارا تھا جہاں آغا حشر کاشمیری کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ان دنوں آغا حشر غالباً کلکتے جا چکے تھے۔ داری امرتسر والی کی بیٹھک کے بغل میں امرت ٹاکیز تھی۔ سامنے بورا اور دانے دار کھانڈ بتاشے اور کھانڈ کے کھلونے بنانے والوں کی دکانیں تھیں۔ ذرا پرے دال پوریاں دی ہٹی تھی یہ ایک ہوٹل تھا اس ہوٹل کے باہر ایک اونچا لمبا شیشے کا شوکیس تھا جس میں کرسمس فادر کی شکل کا ایک بوڑھا ہاتھ میں سرخ سوڈا واٹر کی بوتل اور گلاس لئے کھڑا رہتا اس کے اندر کچھ ایسے کل پرزے لگے تھے کہ وہ

اُس کا بوتل والا ہاتھ گلاس کی طرف جاتا اور پھر واپس آجاتا۔ ہم سکول آتے جاتے اس کرسمس فادر کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ بیساکھی پر جب باہر سے دیہاتی سکھ آتے تو یہاں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ میں نے کئی بار اس ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ گدّے دار اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر سوڈا واٹر اور ملک شیک پیا اور سنگِ مرمر کی گول گول ٹھنڈی میزوں پر بانہیں ٹکا کر قہقہے لگائے ہیں۔ کونے میں شوکیس کے پاس کاؤنٹر پر بیٹھا ایک موٹا لالہ سہگل کانن، جوتھیکا رائے اور کملا جھریا کے ریکارڈ بجایا کرتا۔

بالم آئے بسو میرے من میں

اور پھر کملا جھریا کی گائی ہوئی مشہور غزل

مجھے جس دم خیالِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
صراحی جھومتی ہے وجد میں پیمانہ آتا ہے

اِن دنوں یہ ریکارڈ بے حد مقبول تھے اور لوگ انہیں سُن سُن کر سر دھنا کرتے تھے ہاں۔

تو میں امرت ٹاکیز کی بات کر رہا تھا جو اسی بازار میں تھی۔ امرتسر کا یہ سب سے پرانا سینما ہال تھا۔ سینما ہال کیا تھا بس ریل کا ایک لمبا چوڑا ڈبہ تھا جس کے آخر میں جا کر پردہ لگا تھا۔ اس کی مشین کے چلنے کی آواز باہر بازار تک آیا کرتی اور ہم اکثر فلموں کے گانے اور مکالمے بازار میں کھڑے ہو کر سنا کرتے تھے۔ پرکاش فلم کی پاسنگ شو والا یا موہن ٹون کی "ہنٹر والی" جس کی پہلوان ہیروئین مس نادیا سرکس میں ہنٹر فرفر چلتی دکھائی جاتی تھی۔ ماسٹر شیراز کی چاند پر زندہ۔ ہریش چندر۔ جنتی نشانی۔ ایک دن کی بادشاہت اور چار حصوں پر مشتمل فلم حاتم طائی فلم شام چھ بجے شروع ہوئی اور ساری رات چلتی رہی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ۲/۲ آنے والی تھرڈ کلاس کے بینچ پر اکڑوں بیٹھا بت بنا حاتم طائی کو جنات کا مقابلہ کرتے کوہِ ندا میں کالی بلاؤں سے لڑتے اور "یا اللہ مدد" کا نعرہ لگا کر دریائے آگ عبور کرتے دیکھتا رہا۔ جب فلم ختم ہوئی تو امرتسر شہر پر صبحِ صادق کی جھلکیاں نمودار ہو رہی تھیں اور سینما کے گیٹ کے باہر والد صاحب ہنٹر لیے ہم دونوں بھائیوں کے انتظار میں بڑی گرمجوشی سے ہنٹر کو بار بار ہوا میں شڑاپ شڑاپ کی آوازوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔

امرت ٹاکیز کے سینما ہال میں پاپڑ اور مسالے دار چنوں کی تیز مہک ہر دم پھیلی رہتی انٹرول میں پھیری والے رشک کے پاپڑ مسالے دار چھولے، گنڈیریاں والے اور پان سگریٹ کا اس قدر شور مچاتے کہ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے اپنے ساتھیوں سے چیخ چیخ کر اور بعض اوقات صرف اشاروں میں ہی باتیں کرتے۔ امرت ٹاکیز کا انٹرول کا عرصہ گزارنا دریائے شور عبور کرنے کے برابر تھا۔ امرت ٹاکیز کی ڈیوڑھی میں دونوں جانب دیواروں پر چالو فلم اور آنیوالی فلموں کے فوٹو چوکٹوں میں لگے رہتے۔ ہم ان تصویروں کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے اور پھر شام کو یا دوپہر کو گھر سے پیسے چرا کر اور یا بہنوں سے چھین کر فلم دیکھنے آجاتے۔ واپسی پر ہنٹر سے خوب ٹھکائی ہوتی مگر اگلے روز پھر سینما ہال کی تھرڈ کلاس میں موجود ہوتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار سینما ہال میں بڑا رش تھا اور میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ سٹیج پر لیٹ کر فلم دیکھی تھی۔ ایک بار اسی سینما ہال میں ملکہ ترنم نور جہاں نے جو ان دنوں بے بی نور جہاں تھی سٹیج پر زندہ ناچ گا کر دکھایا تھا۔ یہ ناچ گانا میں نے آگ بجھانے والی لال لال بالٹیوں کے پاس ایک کھڈے میں بیٹھ کر دیکھا تھا۔

جبکہ جس کم نصیب گیٹ کیپر کی میں کہانی سنانے والا ہوں وہ اسی امرت ٹاکیز کے مین گیٹ کا گیٹ کیپر تھا۔ بازار سے سینما کی چوڑی اور ریل کے ڈبے ایسی ڈیوڑھی میں داخل ہوں تو اُس کے آخر میں لکڑی کا ایک جنگلا آجاتا تھا۔ یہ جنگلا سینما کا پہلا دروازہ تھا۔ یہاں سے سامنے سینما کے کیبن جہاں مشین لگی تھیں دکھائی دیتے تھے۔ یہاں سے ٹکٹ کٹوا کر گویا آپ سینما کے باقاعدہ تماشائی کی حیثیت سے سینما کے برآمدوں میں سے گزر کر ٹکٹ کے مطابق اپنی کلاس میں داخل ہو سکتے تھے۔ لکڑی کے اس جنگلہ نما گیٹ پر ایک گیٹ کیپر لوہے کی کالی کرسی پر بیٹھا رہتا۔ تیس پینتیس کی عمر کالی اچکن، کالے پمپ شو، سفید لٹھے کی بے داغ شلوار، سر پر سرخ مخملی ترکی ٹوپی، گندمی چہرے پر بڑے ہلکے ہلکے چیچک کے داغ، پُرسکون دھیمی شربتی آنکھیں، تیکھا سا ناک، نقشہ ذرا لمبوترا چہرہ، دُبلا پتلا مناسب قد کاٹھ۔ میں نے اُسے کبھی مسکراتے یا کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ میں لکڑی کے جنگلے پر ایک طرف چڑھ کر کھڑا ہو جاتا اور سینما ہال میں داخل ہونے والوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو یہ شوق ہوتا کہ اگر پوری فلم دیکھنے کے پیسے نہیں تو کم از کم اُس کا ایک آدھ سین ہی مفت میں دیکھ لیں۔ لیکن یہ سینما والے کبھی کبھی چلتی فلم

میں ہال کا سامنے والا فسٹ کلاس کا دروازہ لوگوں کی آتش شوق کو بھڑکانے کے لیئے چوپٹ کھول دیا کرتے تھے۔ یہ دروازہ دو ایک منٹ کے لیئے کھلا رہتا اور پھر بند کردیا جاتا عام طور پر یہ دروازہ فلم کے کسی مارکٹائی والے سین پر کھلا کرتا۔

ترکی ٹوپی والے اچکن پوش گیٹ کیپر نے ہمارے جنگلے پر کھڑے ہونے پر کبھی اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ فلم دیکھنے والوں کا ٹکٹ لے کر کاٹتا۔ آدھا انہیں دیتا۔ آدھا لکڑی کی صندوقچی میں ڈال دیتا اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھا رہتا۔ جب کبھی رش ہوتا تو وہ اٹھ کر گیٹ کے پاس کھڑا ہو جاتا اور نظریں جھکائے جلدی جلدی ٹکٹ کاٹ کاٹ کر لوگوں کو گذارے جاتا۔ کسی وقت مشین مین کیبن سے اُسے کوئی آواز دیتا تو وہ ہاتھ ہلا کر اُسے کوئی اشارہ کرتا اور پھر اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔ امرت ٹاکیز کا مالک ادھیڑ عمر کا ڈاڑھی مونچھ صاف چٹ ایک ہندو لالہ امرت لعل تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے شراب کے ہلکے ہلکے نشے ہی میں رہتا۔ ڈیلا ڈھیلا ڈھالا زرد چہرہ سر پر گول ہندو والی کالی ٹوپی دھوتی، بوسکی کی قمیض اور سیاہ پمپ میں وہ جھومتا جھامتا مسکراتا ہوا سینما ہال میں ادھر سے اُدھر منڈلایا کرتا۔ دو تین خوش پوشش آدمی ضرور اُس کے آگے پیچھے ہوتے تھے۔ ایک بار میرے سامنے یہ ہندو لالہ جنگلے کے پاس آکر رک گیا۔ گیٹ کیپر لوہے کی کرسی پر سے احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالے نے اپنی خمار آلود پلکیں اٹھائیں اور گیٹ کیپر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

۔ شاہ جی! کبھی مجھ سے بھی کوئی بات کر لیا کرو۔ کوئی تکلیف تو نہیں؟۔

گیٹ کیپر نے نظریں جھکائے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

۔ آپ کی مہربانی ہے لالہ جی۔

اُس روز مجھے معلوم ہوا کہ گیٹ کیپر کو شاہ جی کہتے ہیں اور اُس کی آواز باریک ہے اور یہ کہ وہ بولتا بھی ہے۔ اور مسکراتا بھی ہے۔ کبھی کبھی دوپہر کو ایک میلے سے سفید برقعے والی بوڑھی عورت جنگلے کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی گیٹ کیپر روٹی کا ڈبہ لے کر صندوقچی کے قریب ہی رکھ لیتا۔ بچی خیبت سے اسکے ساتھ آکر لگ جاتی۔ وہ بچی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا اور اچکن کی جیب سے ایڈورڈ کے زمانے کا تانبے کا پیسہ نکال کر دیتا۔ بچی خوشی سے پھولی نہ

سماتی۔ گیٹ کیپر بچی کے ماتھے پر پیار کرتا۔ بوڑھی عورت اُس سے دو ایک باتیں کرتی جسکا جواب وہ ہوں یا ہاں میں دیتا۔ جاتے ہوئے برقعہ پوش بوڑھی عورت گیٹ کیپر کے کندھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتی اور دعائیں دیتی بچی کو ساتھ لے کر سینما ہال کی ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتی۔ میں سوچا کرتا کہ یہ عورت بوڑھی عورت گیٹ کیپر کی ماں ہے اور وہ بچی اس کی بیٹی ہے۔ حقیقت کیا تھا؟ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میں خود اُن دنوں بارہ چودہ برس کا تھا۔ میرے لیئے زندگی کا بازار ابھی کھلا ہی تھا۔ ماہ و سال کے چبوتروں پر لوگوں نے ابھی اپنی اپنی دکانیں سجانی شروع ہی کی تھیں۔ زندگی کا بھرپور طاقتور، تازہ اور پُرجوش خون میری رگوں میں آگ بن کر دہک رہا تھا۔ اور میں بہار کی خوشبو بھری مست خوش فکر اور لاابالی ہوا کے جھونکے کی طرح امرتسر کے بازاروں، باغوں، نہروں اور کھیتوں میں اُڑتا پھر رہا تھا۔ خالص دودھ مکھن گھی، ہوا اور امرتسری پانی کی طاقت میں ہرن کی طرح چوکڑی بھرتی نگاہ میں کوئی صورت نہ ٹھہرتی تھی۔ ہر لمحے، ہر پل نئے نئے ستارے طلوع ہو رہے تھے۔ لیکن کچھ لوگ، کچھ مناظر، کچھ ستارے ایسے تھے جنہوں نے اُس وقت میری توجہ اپنی طرف کھینچی اور جنہیں میں آج تک نہیں بھلا سکا۔ یہ گیٹ کیپر بھی انہی لوگوں، انہی مناظر اور اُن ہی دھیمے دھیمے چمکنے والے ستاروں میں سے تھا۔

روٹی کا ڈبہ صندوقچی کے پاس رکھ کر وہ ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہو جاتا۔ خدا جانے وہ کب روٹی کھاتا تھا؟ خدا جانے وہ روٹی کھاتا بھی تھا یا نہیں! میں نے اُسے کبھی کچھ کھاتے پیتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ سینما گھر کے دوسرے گیٹ کیپر سارا دن چرتے رہتے اور گولیاں بکتے رہتے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ دینے والے کی کھڑکی پر جب میں لوگوں کے سروں پر سے چھلانگیں لگا کر پہنچتا تو دیوار کے چوکس سوراخ میں سے وہ مجھے ہمیشہ پاپڑ کھاتا دکھائی دیتا تھا۔ سبحان اللہ! امرتسر کے پاپڑوں کا بھی جواب نہیں تھا ـــــ مگر یہ اچکن پوش خاموش گیٹ کیپر کبھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ میری اپنی کرتے کی جیب گڑ والی ریوڑیوں سے بھری رہتی تھی تک گیٹ کے جنگلے پر چڑھا مزے مزے ریوڑیاں کھاتے چلتی فلم میں سینما ہال کا دروازہ چوپٹ کھلنے کا انتظار کیا کرتا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر خاموش گیٹ کیپر لوہے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا اپنی نرم پُرسکون نگاہوں سے بازار کی طرف دیکھتا رہتا۔ اُس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا

تھا کہ لڑکے! یہاں کیوں کھڑا ہے۔ چل بھاگ اپنے گھر جا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے نیاز ہے۔ گویا ایک بھورے رنگ کا پتھر ہے جو لاکھوں مربع میل کے صحرا میں موسموں کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے چپ چاپ پڑا ہے۔ اُسے کسی سے گلہ نہ تھا۔ کسی سے شکایت نہ تھی۔

ایک روز دوپہر کو میں گیٹ کے جنگلے پر اسی طرح کھڑا تھا کہ اُس کی چھوٹی بچی روٹی لے کر آئی۔ روٹی کا ڈبہ تھام کر اُس نے صندوقچی کے پاس رکھا۔ بچی کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔ پھر جھک کر پوچھا۔ بچی نے جواب دیا۔

" اب آرام ہے۔

معلوم ہوا کہ گیٹ کیپر کی ماں بیمار ہے۔ چنانچہ بچی روٹی لے کر آئی ہے۔ اُس نے بچی کو ایڈورڈ کا پیسہ دیا اور فلم دیکھنے کے لیے اوپر کیبن میں بھیج دیا۔ وہ خوشی خوشی اُوپر چلی گئی۔

اگر میں اُس انوکھے گیٹ کیپر کا ہم عمر ہوتا تو ضرور اُس سے دوستی کرتا اُس سے پوچھتا کہ وہ کس بے زبان غم کو سینے میں دبائے بیٹھا ہے؟ کیا اُس کی بیوی اُسے چھوڑ کر چلی گئی ہے جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا؟ کیا اُس کا کوئی بھولا بھالا بچہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے جس سے وہ پہروں میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا۔؟ اُس کی ننھی مُنّی قلقاریاں سُنا کرتا تھا؟ اگر یہ نہیں تو پھر اُس کی زندگی سے بھرپور باتیں اور پُرجوش قہقہے کون چھین کر لے گیا ہے؟ ـــــ لیکن میں کم عمر تھا۔ مجھے تو اُس وقت یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لوگ باتیں کیا کرتے ہیں۔ بھلا میں کسی کی خاموشی کے بارے میں کیا جان سکتا تھا؟ خاموشی ـــــ جو لاکھوں پُراسرار آوازوں کو جنم دیتی ہے۔ جو ہر آواز کا آغاز اور انجام ہے اس کے باوجود اُس شور مچاتے شہر کی آوازوں میں اُس کم سخن چپ چاپ گیٹ کیپر کی خاموشی مجھے بڑی پُراسرار اور عجیب لگتی تھی۔ میں نے امرتسری قبرستان کے گورکنوں اور مسجدوں میں اذان دینے والوں کو اتنا خاموش طبع اور مرنجاں مرنج نہ دیکھا تھا جیسا وہ تھا اور وہ تو شہر کے پرانے اور بارونق سینما گھر کا مین گیٹ کیپر تھا گہما گہمی اور شور و غل کے دروازے پر کھڑا رہ کر بھی وہ خاموش تھا۔ ایک دریائے شور تھا جسے وہ عبور کر رہا تھا مگر اُس کا اپنا دامن تر نہیں ہوا تھا۔ ایک بار سینما میں دنگا فساد ہو گیا۔

کچھ لوگ شراب پی کر زبردستی سینما ہال میں گھسنا چاہتے تھے۔ گیٹ کیپر نے انہیں روکا تو ایک شرابی نے اُسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ گیٹ کیپر یوں سکون سے کھڑا رہا گویا اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں دوسرے شرابی نے زور سے ایک مکا گیٹ کیپر کی آنکھ پر مارا یا وہ چکرا کر فرش پر گر گیا۔ اُس کی رومی ٹوپی دور جا پڑی اتنے میں دوسرے گیٹ کیپر اور پولیس آگئی اور انہوں نے دنگا فساد کرنے والوں کو گرفتار کر لیا۔ اچکن پوش گیٹ کیپر اس دوران میں زمین پر سے اُٹھا۔ اپنی رومی ٹوپی کو آہستہ آہستہ جھاڑ کر سر پر رکھا۔ جیب سے رومال نکال کر آنکھ کے اوپر بھنووں پر سے بہتے خون کو پونچھتے ہوئے دوبارا گیٹ پر ڈیوٹی دینے آن کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ پہلے کی طرح پُرسکون اور خاموش تھا وہاں نہ کوئی غصہ تھا نہ ملال ہاں حیرت کا ایک ہلکا سا احساس ضرور تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو۔ یہ ابھی ابھی جو چیز میری بھنووں سے آکر ٹکرائی تھی کیا تھی!

کئی روز تک اُس کی داہنی آنکھ سُوجی رہی۔ وہ ڈیوٹی پر سے ایک شو بھی غیر حاضر نہ ہوا۔ اُس کی بوڑھی ماں ضرور گھر میں اُس کی سُوجی ہوئی آنکھ کو ٹکور کرتی ہوگی اور اُس کی بھولی بھالی بچی نے ضرور پوچھا ہوگا۔ " ابو جی! اب مجھے خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ شاید وہ پیدا ہی پتھر کھانے اور چپ رہنے کے لیے ہوا تھا۔ شاید اُس کی پوری زندگی گلی کے اونچے نیچے پتھروں کی کرچوں سے عبارت تھی جہاں سے وہ لوگوں کے دُکھوں کی صلیب اٹھائے کانٹوں کا تاج پہنے گزر رہا تھا اور لوگ اُس پر پتھر برسا رہے تھے مبارک ہیں وہ لوگ جو پتھر کھا کر بھی پتھر برسانے والوں سے نفرت نہیں کرتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جس رات کے پچھلے پہر اذان کے وقت میں حاتم طائی کے چار پارٹ دیکھ کر امرت ٹاکیز کے سینما ہال سے باہر نکلا تو منیجر کے کمرے میں چق کے پیچھے بتی جل رہی تھی اور خاموش گیٹ کیپر فرش پر جانماز بچھائے قبلہ رُو بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں ہم میں سے کچھ شرارتی لڑکوں نے کُتّے کے ایک پلّے کو زور سے ڈنڈا مارا۔ وہ درد سے کراہتا چق کے نیچے سے منیجر کے کمرے میں گھس گیا۔ جب ہم پلّے کی کھوج میں اندر گئے تو دیکھا کہ پلّا جانماز پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اُس نے نظر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور انگلی کے اشارے سے منع کیا کہ جانور کو نہ مارو۔ ہم لوگ باہر آگئے اور

دوسرے سے ہنستے مذاق کرتے چل دیتے۔ مجھے آج بھی گیٹ کیپر کی تھکی تھکی آنکھیں، اُس کا انگلی کے اشارے سے بھی جانور کو مارنے سے روکنا اور پلّے کا اُس کی گود میں مزے سے بیٹھنا یاد ہے۔

زندگی کے سینما ہال میں وقت کی فلم بھی بڑی تیزی سے چلتی چلی گئی اور اُس کے پارٹ ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ میں اسی عمر میں ہندوستان کے دُور دراز شہروں میں آوارہ گردی کو چل نکلا۔ جب کبھی امرتسر واپس آتا تو اُس خاموش گیٹ کیپر کو اُسی طرح گیٹ کے پاس لوہے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھے ٹکٹ کاٹتے دیکھتا اور پھر کسی دور دراز شہر کی آوارہ گردی کو نکل جاتا۔ دوسری جنگِ عظیم میں میں برما میں پھنس گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو فسادات شروع ہو گئے۔ رام باغ اور کٹڑہ کنہیا لعل کی طوائفیں بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلی گئیں یہاں زیادہ تر مکان اور دکانیں ہندوؤں کی ملکیت تھیں مسلمانوں نے انہیں آگ لگا دی۔ کٹڑہ کنہیا لعل سارے کا سارا آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک روز کرفیو کھُلا تو میں نے اس کٹڑے میں سے گزرتے ہوئے امرت ٹاکیز کو دیکھا۔ اُس کا سینما ہال جل کر خاک ہو گیا تھا۔ دیواروں کا ڈھانچہ کھڑا تھا گیٹ بھی جل گیا تھا۔ مجھے خاموش گیٹ کیپر کا خیال آ گیا۔ خدا جانے فسادات کے اس خونیں ہنگاموں میں وہ بے ضرر کم سخن انسان کہاں ہو گا۔ کیا وہ اُس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی سلامت ہوں گی اُس کے تو اگر خنجر بھی گھونپ دیا گیا تو وہ کسی کا ہاتھ نہیں روکے گا۔ کسی سے کچھ نہ کہے گا۔ ہلکی سی آہ تک نہیں بھرے گا۔ اور چپ چاپ گلی یا بازار میں گِر کر مر جائے گا۔

فسادات بھی ختم ہو گئے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا اور مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے اَن دیکھی منزلوں کو چل پڑے۔ نئے وطن کی نئی سرگرمیوں اور نئے مسائل نے بہت کچھ وقتی طور پر بھلا دیا۔ میں بھی امرت ٹاکیز کے خاموش گیٹ کیپر کو بھول گیا۔ چھ سات برس بعد اچانک میں نے اس گیٹ کیپر کو لاہور کے پیلس سینما کے باہر دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ سر کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ اچکن۔ لٹھے کی صاف ستھری شلوار اور پمپ شو غائب ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہی دھیما دھیما درد اور سکوت تھا ہونٹوں پر لبِ خاموشی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر سینما کے سامنے ہاتھ میں میٹھی خطائیوں کا تھال لئے کھڑا تھا۔ سر پر میلی کچیلی رومی ٹوپی تھی اب میں اُسے کبھی کبھی لاہور کی سڑکوں یا سکولوں کے باہر میٹھی خطائیاں بیچتے دیکھ لیا کرتا۔ کئی بار دل چاہا کہ

اُس کے پاس جا کر کوئی بات کروں۔ اُس سے اُس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی کی خیریت پوچھوں مگر جانے کیوں میں بھی چپ چاپ اُس کے قریب سے گزر جاتا۔ ہر بار جب وہ مجھے ملتا تو اُس کی حالت پہلے سے خراب ہوتی۔ کپڑے زیادہ میلے کچیلے اور چہرہ پہلے سے زیادہ زرد ہوتا۔ وہ خطائیوں کا تھال لئے سر جھکائے گلیوں میں سے گزر جاتا۔ کوئی بچہ اُسے روکتا تو وہ رُک جاتا۔ پیسے دو پیسے کا سودا بچے کو دیتا اور خاموشی سے آگے گزر جاتا۔

پھر ایک روز میں نے اُسے خطائیوں کے تھال کے بغیر دیکھا۔ وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ لگا سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت وہ گردن پھیر کر دائیں بائیں یوں دیکھتا جیسے اُس کی کوئی شے گم ہو گئی ہو۔ سر کے سفید بال اور داڑھی بڑھ آئی تھی۔ رومی ٹوپی غائب تھی اور ٹوٹی ہوئی چپل پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔ مجھے اُس سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ یوں لگا گویا اُس کی تباہ حالی کا میں ذمے دار ہوں۔ وقت لاہور کی سڑکوں پر شور مچاتا، گرد اُڑاتا بھاگتا اُڑتا چلا گیا۔۔۔ ایک دن میں نے اُسے ایبٹ روڈ پر دیکھا۔ اُس کے پاؤں سے چپل غائب تھی۔ چہرا مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ پاجامے کا ایک پائنچہ پھٹ گیا تھا۔ وہ کوڑے کے ایک ڈھیر پر جھکا ہوا تھا اور کاغذوں کے چیتھڑے نکال نکال کر اپنے گندے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس رہا تھا۔

اب میں نے فلیمنگ روڈ پر رہائش اختیار کر لی تھی۔ دو ماہ بعد میں نے امرتسر کے اس بے زبان گیٹ کیپر کو لاہور ہوٹل کے پاس بیٹھے کاغذ نکال نکال کر جیبوں میں بھرتے دیکھا۔ اِس کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ لمبے لمبے سفید بالوں میں لاہور کے ہر بازار ہر گلی کوچے کی مٹی بھری تھی داڑھی مونچھوں کے خاکستری بالوں میں زرد مٹی رنگ کا سوکھا ہوا بے جان چہرہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔ سفید آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ پاس ہی گندے مندے کاغذوں سے بھری ہوئی گٹھڑی رکھی تھی۔ وہ کوڑا کرکٹ بھی کرید رہا تھا اور اونگھ بھی رہا تھا۔

میں نے آخری بار اُسے اُسی بازار میں ایک مسجد کے باہر دکان کے تھڑے پر گندے چیتھڑوں کے گٹھڑے سے ٹیک لگائے اونگھتے ہوئے دیکھا۔ میں قریب سے گزرا تو اُس نے ایک پل کے لیے اپنی سُوجی ہوئی پلکیں اُٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ایک پل کے لئے رُک گیا۔ ایک پل کے لیے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ اُسی طرح پتھر بنا اپنی وحشت زدہ آنکھوں سے

مجھے دیکھتا رہا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ مٹی اور چیتھڑوں کا جو گندا میلا ڈھیر سا دکان کے تھڑے پر رکھا ہے کیا یہ وہی کم سخن، اچکن پوش خوش لباس گیٹ کیپر ہے۔ جو آج سے عرصہ پہلے شہر کے ایک سینما گھر کے گیٹ پر لوہے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا ٹکٹ کاٹا کرتا تھا اور جسے ایک دن بوڑھی ماں اور بھولی بھالی معصوم بچی روٹی دینے آیا کرتی تھی؛ اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سفید بالوں اور چہرے کی دکھ بھری لکیروں والا آدمی وہی چھوٹا سا لڑکا ہے جو کبھی بڑی بے فکری سے میرے پاس گیٹ کے جنگلے پر چڑھا جیب سے ریوڑیاں نکال نکال کر کھایا کرتا تھا؛ ہم دونوں یہی سوچ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وقت کی برق رفتار گاڑی ہم دونوں کو زندگی کے ویران سٹیشن پر اکیلا چھوڑ کر بہت دور نکل چکی تھی۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور میں آگے چل دیا۔ اس کے بعد پھر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ خدا جانے اب وہ کہاں ہے! اُس کی دکھی ماں اور معصوم بچی کہاں ہے؛ وہ یقیناً اب بڑی ہو گئی ہوگی۔ کاش۔ میں کبھی اُس سے مل کر، اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

بیٹی! تیرے باپ کو اب روٹی دینے کون جاتا ہے؟

امرتسر کا ایک جواری

محلے میں لوگ اُسے گاما سنگھاڑیا کے نام سے پکارتے تھے۔ لمبا قد، چھریرا بدن، گندمی رنگت، سرسوں کے تیل میں چمکتے ہوئے سیاہ لہریلے بال گنجان کالی بھنوؤں کے سائے میں خواب آلود نسواری آنکھیں اور چوڑے نتھنوں والا چپٹا ناک دو گھوڑا بوسکی کی کالردار قمیض پر چمکتے سونے کے بٹن، سفید لٹھے کی دھوتی، پیٹنیٹ کا سیاہ پمپ شو اور کندھے پر لال صافہ۔۔۔

گاما سنگھاڑیا کالی کنی والی ریشمی دھوتی کا پلو سونے کی انگوٹھیوں والی انگلیوں میں تھامے، منہ میں تمباکو والا پان رکھے بڑی آن بان کے ساتھ محلے میں ٹہلا کرتا۔ کبھی طفیل سنار کی دکان پر بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ کبھی کاکا محمد دے سے ہنسی مذاق ہو رہا ہے اور کبھی ہماری دکان کے تخت پوش پر پاؤں رکھے میرے والد سے مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ کپڑوں پر گرد کا ہلکا سا نشان بھی پڑ جاتا تو گلی کے نلکے پر صافے کی کنی پانی میں بھگو کر دیر تک پان کے داغ کو رگڑتا رہتا۔ بڑا صاف ستھرا اور صفائی پسند آدمی تھا۔ جس روز اُس نے کوکین والا پان کھایا ہوتا اُس روز وہ سندر سنگھ حکیم کی دکان پر کھمبے سے ٹیک لگا کر مست ہو کر بیٹھا رہتا اور پہروں کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔ منہ میں پان دبائے چہرے پر سدا کھیلنے والی بچوں ایسی مسکراہٹ لئے وہ آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا اور دھوتی کا پلو اٹھا کر منڈی ہوئی پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہتا اور وہ دنیا میں اکیلا تھا۔ نہ باپ، نہ ماں، نہ بہن اور نہ بھائی۔ عمر چالیس کے قریب تھی۔ شادی نہیں کی تھی۔ ہماری گلی میں ایک مسجد کے پچھواڑے کوٹھڑی میں رات کو کسی وقت آ کر پڑا رہتا تھا۔

گاما سنگھاڑیا جواری تھا شرابی تھا۔ وہ ان معنوں میں محلے کا بدمعاش تھا کہ جو کھیلتا تھا

شراب پیتا تھا۔ کوکین کھاتا۔ اور کثر وہ کہنیا لعل میں جاکر بتو کنجری کا مجرا سنتا تھا۔ اس کی دھوتی کی ڈھب میں کمانی دار چاقو بھی رہتا تھا۔ وہ سٹہ بھی لگاتا تھا۔ ہماری دکان میں چاچا امیر نامی ایک ادھیڑ عمر کا سوکھا لمبا شخص بیٹھتا تھا۔ جو پولیس سے چوری چھپے سٹے کی پرچیاں لکھا کرتا۔ نسواری فرد کی ٹکل مارے وہ بھٹی کی اوٹ میں بوریے پر بیٹھا چوکس آنکھوں سے پولیس کے آدمیوں سے خبردار رہا کرتا۔ سارے محلے والوں کو علم تھا کہ چاچا امیر سٹہ لکھتا ہے چراغ ارائیں بازار میں کسی سپاہی کو آتا دیکھتا تو دکان پر پیڑے تولتے ہوئے چاچا امیر کو ہوشیار کر دیتا۔

"چاچا! کالا آدمی آیا ای۔"

کالا آدمی انہوں نے پولیس کے سپاہی کا نام رکھ چھوڑا تھا۔ چاچا امیر یہ سنتے ہی اپنی چھوٹی سی پنسل اور سٹے کی پرچیاں فوراً جاشوں والی ٹوکری میں چھپا دیتا اور خود بھٹی کے پاس آکر بڑی ہی بے نیازی سے ہاتھ تاپنے لگتا کبھی کبھی گاما سنگھاڑیا بھی دکان میں آکر کوئی حرف یا دڑا لگا دیتا۔ سٹے کا گھڑا چوک ملک بُت میں دُلّے پٹھان کی بیٹھک پر رات کے نو بجے کھلا کرتا تھا۔ ساڑھے نو بجے چاچا امیر دُلّے پٹھان کی بیٹھک سے بھگتان لے کر دکان پر آجاتا۔ گاما سنگھاڑیا دور سے آواز لگاتا۔

"چاچا! منڈی دا کیہ بنیا اے اَج؟"

گامے سنگھاڑیے کا اگر حرف یا دڑا نکل آتا تو وہ روپے دھوتی کے ڈھب میں سنبھال کر بالے ہندو کی بیٹھک پر شراب پینے اور جوا کھیلنے چل دیتا۔ اگر حرف نہ نکلتا تو مسکرا کر میرے والد سے کہتا۔

"خلیفہ! سٹہ بڑا کُتا کم اے۔ لاؤ آدھ سیر دودھ ہی پلاؤ۔"

گاما سنگھاڑیا بدمعاش تھا۔ کیونکہ وہ جوا کھیلتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور کمانی دار چاقو ہر وقت ڈھب میں رکھتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اُس کی زبان سے گالی نہیں سنی تھی۔ محلے میں اُس نے کبھی کسی سے لڑائی نہیں کی تھی۔ کبھی شراب پی کر شور نہیں مچایا تھا۔ وہ گلی میں یوں سر جھکا کر گزرتا جیسے اپنے گھر کے آنگن ہی سے گزر رہا ہو۔ ہر ایک سے نرم اور میٹھے لہجے میں بات کرتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار اُس نے بہت پی رکھی تھی اور سندر سنگھ حکیم کی دکان کے

پھٹے پر چوکڑی مار کر بیٹھا دیو داس کا یہ گانا گا رہا تھا۔

بالم آئے بسو مورے من میں

میں اپنی دکان میں دودھ کی کڑاہی میں کفگیر پھیرتے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا گامے سنگھاڑیے کی آنکھیں شراب کے نشے میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس کی گردن بار بار ڈھلک جاتی تھی رات کے غالباً دس گیارہ بجے تھے۔ گرمی بہت تھی۔ اچانک گاما سنگھاڑیا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی ٹانگوں پر کالے چیونٹے چڑھ گئے تھے۔ اُس نے بازار میں کھڑے کھڑے اپنی ریشمی دھوتی اتار کر اور اُسے جھاڑتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"خلیفہ! کاڈے ای کاڈے۔"

میرے والد نے فوراً گدی سے اٹھ کر گامے سنگھاڑیے کی دھوتی باندھی اور کہا۔

"گھیا شرم کر۔"

گاما ہنستا رہا اور بچوں کی طرح بازار میں کھڑا میرے والد سے دھوتی بندھواتا رہا۔ پھر وہ گاتا اور لڑکھڑاتا ہوا بالے ہندو کی بیٹھک کی طرف چلا گیا۔ اگلے روز جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس نے شراب کے نشے میں بازار میں دھوتی اتار دی تھی تو اُسے اس قدر ندامت ہوئی کہ وہ تین چار روز تک محلے میں نہ آیا اور بتو کنجری کی بیٹھک پر ہی رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد میں نے گامے سنگھاڑیے کو کم از کم اپنے محلے میں شرابی حالت میں نہیں دیکھا۔

گامے سنگھاڑیے کو سانپ پکڑنے میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ میں نے یہ منظر کئی بار دیکھا کہ گاما بازو پھیلائے سانپ کو دُم سے پکڑے جھٹکے دیتا گلی یا بازار میں چلا آرہا ہے پیچھے بچوں کا ہجوم ہے۔ عورتیں کھڑکیوں میں چقوں کے پیچھے آن کھڑی ہوئی ہیں۔ پھر گاما دو ایک بار سانپ کو دائرے کی شکل میں گھما کر زور سے زمین پر دے مارتا۔ سانپ مر جاتا ہم لوگ اُسے سُتلی سے باندھ کر گلی گلی گھسیٹے پھرتے اور پھر محلے کے باہر ہاتھی گراؤنڈ میں جاکر زمین میں دبا دیتے۔ گلی محلے میں کسی کے گھر سانپ نکلتا فوراً گامے سنگھاڑیے کو بلا لیا جاتا۔ گاما اس قسم کی سیٹی کی آواز منہ سے نکالتا اور لکڑی زمین پر مارتا کونے کھدرے میں چھپا ہوا سانپ باہر نکل آتا۔ گاما بڑی چابکدستی اور ہوشیاری سے لپک کر اُس کی دُم پکڑتا اور ایک جھٹکے میں سے

اُٹھا کر جھٹکے دیتا باہر لے آتا ہماری دکان میں رات کو وہ کبھی کبھی سانپوں کی بڑی مزے دار کہانیاں سنایا کرتا۔ اس بات پر اُس کا پختہ یقین تھا، کہ سانپ سو سال گزر جانے کے بعد جُون بدل سکتا ہے۔ یعنی چرند پرند، حیوان، وہ جس شکل میں چاہے نمودار ہو سکتا ہے۔ مستری عبداللہ جو ہر بات پر اعتراض کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا کہتا۔

"گامیا! اتنا جھوٹ نہ بولو۔ خلیفے کی دکان کی چھت پہلے ہی کمزور ہے"

گاما مسکراتے ہوئے اپنی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔

"مستری! مجھے تو تم بھی سانپ نظر آ رہے ہو۔"

سانپوں کے علاوہ گامے سنگھاڑیے کو بجرے یعنی بٹیرے پالنے کا بھی شوق تھا۔ چیت وساکھ کے دنوں میں وہ بٹیرے کی مادہ پنجرے میں بند کر کے باغوں میں چلا جاتا اور ایک دو نر بجرے پکڑ کر لے آتا۔ وہ انہیں خوب دانہ پانی کھلاتا۔ اُن کی بڑی ٹہل سیوا کرتا۔ صبح حلوہ پوری کا ناشتہ کرتا تو بجروں کو بھی تھوڑا تھوڑا حلوہ ضرور کھلاتا۔ پھر وہ ایک بجرے کو سدھانا شروع کر دیتا۔ اس بجرے کو سدھانا شروع کر دیتا۔ اس بجرے کو وہ اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر بٹھا کر بازار میں آ کر کھڑا ہو جاتا۔ دوسرے ہاتھ میں تھامے ہوئے موتیئے کے سفید پھول کو وہ زور سے ہوا میں اُچھالتا۔ بجرا تیر کی مانند لپک کر اوپر اُڑتا اور ہوا میں اُڑتے ہوئے پھول کو چونچ میں پکڑ کر واپس گامے کی ہتھیلی پر آن بیٹھتا۔ بچے زور زور سے تالیاں بجاتے اور گاما سنگھاڑیے کا گندمی چہرہ خوشی کی مسکراہٹ سے لال ہو جاتا۔

گرمیوں کے موسم میں گاما سنگھاڑیا کبھی آم لگا لیتا اور کبھی قلفیاں بیچنے چل نکلتا اُس زمانے میں آج کل کی طرح ریڑھیوں پر قلفیوں کی بے عزتی نہیں ہوا کرتی تھی۔ رات کو ہی گاما من سوا من دودھ کی ربڑی بنا کر انہیں قلفیوں اور گولڈ فلیک یا کیپسٹن کے گرم پانی میں دُھلے دھلائے شفاف ڈبوں میں بھرنا شروع کر دیتا ان میں پستہ اور بادام کی ہوائیاں چھوڑتا۔ روح کیوڑہ ڈالتا۔ میں اُن بند قلفیوں اور ڈبوں کے کناروں پر گندھا ہوا میدہ چپکائے جاتا۔ جب ساری قلفیاں بھر جاتیں تو گاما مٹی کے ایک بڑے سے مٹکے میں برف اور نمک کوٹ کر اُس کی ایک تہہ جماتا اور اُس کے اوپر قلفیاں جما کر برف کی دوسری تہہ لگا دیتا۔ جب مٹکا بھر جاتا تو وہ اُس کا منہ بند کر کے کُھلی چھت

پر احتیاط سے رکھ دیتا۔ دوسرے دن چلچلاتی دھوپ میں گلی کے آخر میں اُس کی آواز سنائی دیتی۔

"قلفی کھوئے بی دام والی"

بوسکی کی قمیض، سلک کی دھوتی اور کالے پمپ شو پہنے، پرنا مونڈھے پر ڈالے گاما سنگھاڑیا دھوتی کا پلو تھامے بڑی شان سے آگے آگے چل رہا ہوتا۔ گلی کی دھوپ میں اُس کے گندمی ماتھے پر آیا ہوا پسینہ سر کے تیل لگے بال قمیض کے طلائی بٹن اور پمپ شو کی نوک چمک رہی ہوتی۔ پیچھے پیچھے مزدور سر پر قلفیوں سے بھرا ہوا مٹکا اور چوکی اٹھائے آ رہا ہوتا ہمارے مکان کے باہر آ کر وہ آواز لگاتا۔

"چل بھئی میرے پورن بھگت نے باؤ میرے آجا"

مجھے وہ ہمیشہ باؤ میرے کہتا اور میری چھوٹی بہن محمودہ کو جس کی عمر چھ برس کی تھی پورن بھگت کے نام سے پکارتا۔ کیونکہ پورن بھگت کی طرح اُس کے کٹے ہوئے بالوں کے پٹے گردن پر پڑے رہتے تھے۔ ہم گامے سنگھاڑیے کو چاچا کہہ کر بلایا کرتے تھے کیونکہ ہمارے والد سے اُس کی دوستی اور پیار بھائیوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ میں اور میری چھوٹی بہن محمودہ اُس کی آواز سنتے ہی اپنی اپنی تھالی لئے بھاگم بھاگ سیڑھیاں اترتے گلی میں آجاتے۔ گلی میں گاما سنگھاڑیا، چوکی پر بیٹھا، مٹکے میں ہاتھ ڈال کر قلفیاں ٹٹول رہا ہوتا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

"او آ گئے میرے پورن بھگت تے میرا باؤ۔"

مٹکے میں سے دو بڑی قلفیاں نکال کر وہ انہیں سادہ پانی کے تسلے میں دو تین ڈبکیاں دیتا۔ پھر بڑی نفاست سے چاقو سے کر قلفیوں کے کناروں پر جما ہوا میدہ کھرچتا۔ ایک ہاتھ میں پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں قلفی تھام کر وہ اس مہارت اور نرمی سے اُسے دو تین جھٹکے دیتا کہ قلفی اپنے ٹین کے خول سے ثابت کی ثابت نکل کر پلیٹ میں آجاتی اور روح کیوڑے پستہ بادام کی لپٹیں آنے لگتیں۔ گاما شیشے کے بیام میں سے چمچے نکال کر اُس کے اوپر ڈالتا اور پلیٹ ہمارے ہاتھ میں دے کر پیار سے کہتا۔

"کھاؤ میرے پتر بیو"

گاما سنگھاڑیا اپنی مرضی اور اپنی خوشی کے لئے کام کرتا تھا۔ کام سے اُس کا مقصد نہ

تو روزی کمانا ہوتا تھا اور نہ کسی کو خوش کرنا۔ بس یونہی جب کبھی گرمیوں میں طبیعت چاہتی تو قلفیاں جما لیتا اور کبھی آم خریدنے منڈی جا نکلتا۔ چھ سات روز کام کرنے کے بعد پھر وہی بجرا انگوٹھے پر بٹھائے بازار میں آ جاتا اور اُس کے کرتب دکھا دکھا کر خود بھی خوش ہوتا اور بچوں کو بھی خوش کرتا۔

جس روز وہ آم لگاتا اُس روز مجھے اپنے ساتھ میوہ منڈی ضرور لے جاتا میں نیکر قمیص پہنے ننگے پاؤں بڑا خوش خوش گامے کی انگلی تھامے اُس کے ساتھ ہو لیتا۔ میوہ منڈی کا ایک دروازہ ہال بازار اور دوسرا رام باغ والی پولیس گارد کی طرف لگتا تھا۔ ہم گارد والے دروازے سے میوہ منڈی میں داخل ہوتے۔ منڈی میں آڑھتیوں اور خریداروں کا شور مچا ہوتا۔ زمین پر کیچڑ میں کچلے ہوئے پھل پڑے ہوتے۔ گندے مندے پھلوں کی تیز بُو کے ساتھ ہی ساتھ کسی وقت تازہ آموں کی میٹھی اور گرم مہک بھی آ جاتی آڑھتی اپنے اپنے آموں کی کھاریاں کھولے کھڑے چیخ چیخ کر بولی بول رہے ہوتے خریدار ارد گرد کھڑے کھاری میں ہاتھ ڈال ڈال کر آموں کے دانے ٹٹولتے۔ ایک آدھ آم چوستے۔ پھر یا تو پرنے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی بول دیتے اور یا آگے دوسری ٹکڑی کی طرف چل دیتے۔ گاما سنگھاڑیا بھی ہر ٹکڑی میں کھڑا ہو کر سودے کی دیکھ بھال کرتا۔ کھاری میں سے وہ ہمیشہ دو آم نکالتا۔ ایک وہ خود چوستا یا چاقو نکال کر کاٹتا اور دوسرا چپکے سے میرے ہاتھ میں تھما دیتا جسے میں جلدی سے اپنی نیکر کی جیب میں ٹھونس دیتا مجھے یاد ہے۔ جب میں منڈی سے واپس گھر آتا تو میری نیکر کی جیبیں لال پیلے چھوٹے بڑے آموں سے بھری ہوئی ہوتیں تھیں۔ گاما مجھے تاکید کرتا۔

"پورن بھگت کو بھی دینا۔"

گامے سنگھاڑیئے کا آم بیچنے کا انداز بھی اپنا تھا۔ مٹی کے بڑے مٹکے میں وہ پانی اور برف ڈال کر اُسے دسہری اور مالدیو آموں سے بھر دیتا ہماری دکان کے آگے ایک بینچ پڑا رہتا تھا گاما اس بینچ پر صاف ستھرے کپڑے پہن کر عطر لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھ جاتا۔ برف لگے رنگ آموں سے بھرا ہوا مٹکا اور چینی کی شفاف پلیٹیں پاس ہی رکھی ہوتیں گاہک کو وہ اپنی مرضی سے آم نکال کر اُسے کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کر دیتا دو چار روز میں یہ شوق

بھی پورا ہو جاتا اور گاما پھر بجرا اور موتیے کا پھول لے کر چوک میں نکل آتا۔

پھر اچانک محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ گامے سنگھاڑیئے نے شادی کر لی ہے یہ شادی کیسے ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ ان باتوں کا مجھے بالکل علم نہیں ہے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ گامے سنگھاڑیئے نے مسجد کے پچھواڑے والی اپنی کوٹھڑی چھوڑ کر بازار میں دھرم سالہ کی بغل میں ایک چوبارہ کرائے پر لے لیا اور وہاں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ میں اُن دنوں چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا اور ہماری دکان کے بالکل سامنے طفیل زرگر کی دکان تھی لوہے کی اونچی لمبی بھٹی کے سامنے وہ سفید چاندنی پر رکھے ہوئے گاؤ تکیے پر بیٹھا حقہ پیتا یا پنکھے سے مکھیوں کو اڑاتا رہتا تھا۔ میں دن میں ایک گھنٹہ اُس سے حساب پڑھتا اور تقریباً سارا دن اُس کی چلمیں بھرا کرتا۔ وہ مجھے چلم دے کر کبھی کاکا عبدو کے تنور پر اور کبھی کسی کے گھر آگ لینے بھیج دیتا۔ ایک روز میں گامے سنگھاڑیئے کے گھر چلم ہاتھ میں تھامے آگ لینے گیا تو چولہے کے پاس بیٹھی ایک گوری چٹی صحت مند عورت نے مجھے پیار کیا اور خود چمٹے سے چلم میں آگ دھرنے لگی۔ اس نے مخمل کا نسواری رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں کلکتے کے سلیپر تھے۔ گلے میں سونے کا ہار تھا۔ اور لال لال گالوں پر سبز رنگ کے خال کے نشان تھے۔ مجھے وہ بڑی اچھی لگی۔ یہ گامے سنگھاڑیئے کی بیوی تھی۔ اب میں طفیل زرگر کی چلم تھامے گامے سنگھاڑیئے کے گھر ہی آگ لینے جاتا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ گامے سنگھاڑیئے کی بیوی بڑی شان سے بال کھولے چارپائی پر بیٹھی رس گلے کھا رہی ہے اور گاما اُس کے سر میں بادام روغن کی مالش کر رہا ہے جانے کیوں مجھے اُس وقت گاما سنگھاڑیا اچھا نہ لگا ____ مگر گاما سنگھاڑیا اب بڑا اچھا ہو گیا تھا محلے کا ہر آدمی اُس کی کایا پلٹ پر حیران اور خوش تھا۔ اس نے جوا اور شراب چھوڑ دی تھی۔ وہ ہر روز بازار میں کوئی نہ کوئی سودا لگاتا۔ کمانی دار چاقو اُس نے میرے والد کو دے دیا تھا۔

"خلیفہ! اب اس کا کوئی کام نہیں رہا۔"

آنکھیں وہ پہلے ہی نیچی کر کے گلی میں سے گزرتا تھا اب وہ سر جھکا کر گزرنے لگا۔ اُس نے محلے کی مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن پڑھنا بھی شروع کر دیا اور کبھی کبھی نماز بھی پڑھتا

وہ اپنی بیوی کی بے حد خدمت کرتا۔ جو کماتا اُس کے آگے رکھ دیتا۔ اُسے قسم قسم کی پوشاک پہناتا خود اُس نے بوسکی کی جگہ عام پاپلین وغیرہ پہننی شروع کر دی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد اُس نے داڑھی کا خط بھی بنوالیا۔ گاما سنگھا ٹیشے کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دن بھر وہ گلی گلی گھوم پھر کر قلفیاں یا پھل بیچتا اور شام کو حلال کی کمائی بیوی کے قدموں پر ڈال دیتا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ گاما سنگھاڑیا دن بھر کا تھکا ہارا سودا بیچ کر گھر آیا تو چوبارے کی کوٹھڑی اور صندوق چوپٹ کھُلے تھے۔ سارے کپڑے اور زیور غائب تھے۔ اُسکی بیوی گامے سنگھاڑیئے کو دغا دے کر محلے کے ایک کوچوان کے ساتھ بھاگ گئی تھی دو روز تک گاما سنگھاڑیا اپنے چوبارے سے نیچے نہ اترا۔ تیسرے روز وہ نیچے بازار میں آیا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اُس نے بازار کے گرم حمام میں جاکر داڑھی منڈوائی۔ میرے والد سے آکر کمائی دار چاقو لیا پاسے ہندو کی بیٹھک پر جاکر جوئے میں کچھ رقم جیتی۔ ڈٹ کر شراب پی اور امرتسر شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک میں نے گامے سنگھاڑیے کو امرتسر میں نہ دیکھا۔ والد صاحب ایک بار اپنے دوستوں سے بات کر رہے تھے تو معلوم ہوا کہ گاما بمبئی کی طرف نکل گیا ہے

پاکستان بننے کے بعد میں ایک روز ہیرا منڈی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے گامے سنگھاڑیے کو نواڑی کی دکان کے آگے بنچ پر بیٹھے دیکھا۔ اُس کے بال سفید ہو چکے تھے چہرہ بجھا بجھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ وہ گردن جھکائے سر کو آہستہ آہستہ جھٹک رہا تھا۔ میں نے قریب جاکر سلام کیا تو اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر سرخ نشیلی آنکھیں سکیڑ کر مجھے تکنے لگا پھر ہلکی سی اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"میں تہانوں پچھانیا نئیں باؤ جی"

مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں باؤ میدا ہوں چاچا جی"

گاما سنگھاڑیا اتنا سن کر ایک پل کے لئے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اچانک بنچ پر سے اٹھا دونوں بانہیں پھیلا کر مجھے سینے سے چمٹا لیا اور سسکیاں بھر کر بچوں کی طرح رونے لگا میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ماگھے ہفتے میں والد صاحب کو پیغام لے کر اُسکے پاس گیا تو پتہ چلا کہ گاما سنگھاڑیا فوت ہو چکا ہے۔ میں اُداس اور بوجھل دل لئے واپس آگیا۔ بجرا موتیے کے پھول کی تلاش میں کائنات کی وسعتوں میں کھو گیا تھا۔

امرتسر کا پروفیسر مُندری

گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر کے سامنے نیچ ناتھ ہائی سکول کے میدان میں پروفیسر مُندری نے زمین پر ایک کافی بڑا دائرہ کھینچا ہے اور خود اُس کے بیچ میں بیٹھا زمین پر رکھی ڈبی کے اوپر دونّی کھڑی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیجئے دونّی کھڑی ہو گئی۔ پروفیسر مُندری نے دو تین بار شانے اُچکائے ہیں اور آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ اٹھا کر یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔ ؎

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے

اِدھر اُدھر سے بچے آکر دائرے کی لکیر پر بیٹھنے لگے ہیں۔ کچھ بڑے بھی آن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ پروفیسر شعر پر شعر پڑھ رہا ہے۔ کھڑی دونّی کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے۔ کبھی جھک کر دونّی کے قریب انگلی لے جاتا ہے اور پھر "چھو" کہہ کر یوں پیچھے پلٹتا ہے جیسے دونّی سانپ ہو۔ اس قسم کی حرکتوں سے وہ لوگوں کے ذوقِ تجسس کو ہوا دے رہا ہے۔ کافی لوگ جمع ہو گئے ہیں، چنانچہ پروفیسر مُندری ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے پہلے انگلی سے زمین چھوتا ہے پھر وہی انگلی کان پر لگا کر کہتا ہے۔

"یا مالک! کسی نیک کے منہ لگانا ——— لو بھئی قسم ہے سب کو اپنے ماں باپ کی ایک بار زور سے تالی بجاؤ"

مجمع تالیوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ پروفیسر مندری کہتا ہے۔

"بچہ لوگ زور سے کہو، شُوم جائے"

بچے زور سے بولتے ہیں۔ "شوم جائے"

"یا مولا علی! تیرے نام کا آسرا ہے۔ بھائیو! میرے پاس ٹمن کی اس ڈبی میں سوائے

مُندریاں یعنی انگوٹھیوں کے اور کچھ نہیں۔ آپ پوچھیں گے اس مُندری میں خاص شے کیا ہے؟ تو بھائیو، اِس مندری میں اور دُوسری مُندریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اِن مُندریوں یعنی انگوٹھیوں میں میرے پیر و مُرشد کی کرامت ہے۔ کیا کرامت ہے؟ ابھی سب کو معلوم ہو جائے گا۔ بھائیو! میں کوئی بے ایمان آدمی نہیں۔ ایک شریف گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ مجھے روپے کا لالچ نہیں۔ یہ کام میں صرف خدمتِ خلق کے لئے کر رہا ہوں، کیونکہ میرے پیر و مُرشد کا یہی حکم ہے۔ بچّہ لوگ ایک بار پھر زور سے تالی بجاؤ۔

سامنے بچّے زور سے تالیاں بجانے لگتے۔ پروفیسر مُندری بچوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

"بولو بھی، جو لڑکا گھر سے جھاڑ کر آیا ہے وہ میدان میں آجائے"

ایک لڑکا میدان میں پروفیسر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ پروفیسر نے ٹین کی ڈبّی میں سے پیتل کی ایک دو پیسے والی انگوٹھی نکالی۔ انگوٹھی میں لال نگ چمک رہا ہے۔ یہ انگوٹھی اُس نے لڑکے کے انگوٹھے میں ڈال کر لڑکے کا ہاتھ اس طرح اُس کی آنکھ پر رکھ دیا کہ انگوٹھی کا نگینہ اُس کی آنکھ کے بالکل سامنے آجائے۔ پروفیسر نے اپنے بائیں ہاتھ کے شکنجے میں لڑکے کا ماتھا جکڑ لیا ہے۔ اب پروفیسر اور لڑکے کا مکالمہ یوں ہوتا ہے۔

پروفیسر۔ کچھ نظر آرہا ہے؟

لڑکا۔ اپنی آنکھ نظر آرہی ہے۔

پروفیسر۔ کہو ہٹ جاؤ۔

لڑکا۔ ہٹ جاؤ۔

پروفیسر۔ آنکھ کا عکس ہٹ گیا؟

لڑکا۔ نہیں۔

پروفیسر۔ (لڑکے کے ماتھے کو اُنگلیوں کے شکنجے میں زور سے جکڑتے ہوئے) اب بتاؤ۔ ہٹ گیا!

لڑکا۔ (اُنگلیوں کے شکنجے سے پریشان ہو کر) ہٹ گیا۔

پروفیسر۔ (خوش ہو کر) کہو جھاڑو والا آئے۔

لڑکا۔ جھاڑو والا آئے۔

پروفیسر۔ جھاڑو والا آگیا؟

لڑکا۔ (اُنگلیوں کے شکنجے سے ڈر کر) آگیا۔

پروفیسر۔ کہو جھاڑو والے صفائی کرو۔

لڑکا۔ جھاڑو والے صفائی کرو۔

پروفیسر۔ صفائی کر گیا؟

لڑکا۔ ہاں۔

پروفیسر۔ کہو دری والے دری لاؤ۔

لڑکا۔ دری والے دری لاؤ۔

پروفیسر۔ دری بچھ گئی؟

لڑکا۔ ہاں دری بچھ گئی۔

پروفیسر۔ کہو کُرسی والے کُرسی لاؤ

لڑکا۔ کُرسی والے کُرسی لاؤ

پروفیسر۔ کُرسی بچھ گئی۔

لڑکا۔ بچھ گئی۔

پروفیسر۔ کُرسی لوہے کی ہے یا لکڑی کی؟

لڑکا۔ (ذرا ہچکچاتے ہوئے) جی؟

پروفیسر۔ (ماتھا زور سے دبا کر) اب غور سے دیکھ کُرسی لکڑی کی ہے یا لوہے کی؟

لڑکا۔ لکڑی کی۔

پروفیسر۔ اس میں ہیرے چمک رہے ہیں نا؟

لڑکا۔ ہاں چمک رہے ہیں۔

اب پروفیسر مندری لوگوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

"ہندو ہو تو سری کرشن جی مہاراج کو۔ سکھ ہو تو بابا گورو نانک جی کو مسلمان ہو تو حضرت سلیمان علیہ السلام

کو، اور اچھوت ہو تو سری بالیگ جی کو بلائے ——— لڑکے تیرا نام کیا ہے؟"

لڑکا :- غلام حسین۔

پروفیسر :- (ماتھا مزید دبا کر) تو کہو یا حضرت سلیمان جی!

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی!

پروفیسر :- مہربانی کر کے تشریف لائیں اور اس کرسی پر آکر بیٹھ جائیں۔

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی! مہربانی کر کے تشریف لائیں اور اس کرسی پر آکر بیٹھ جائیں۔

پروفیسر :- بابا جی آئے ہیں؟

لڑکا :- جی!

پروفیسر :- (انگلیوں کا شکنجہ کستے ہوئے) بابا جی آئے ہیں؟

لڑکا :- ہاں جی آگئے ہیں۔

پروفیسر :- کہو یا حضرت سلیمان جی السلام علیکم!

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی السلام علیکم!

اب پروفیسر مُندری لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہتا:

"اس بھرے مجمع میں سے کسی کو کوئی بھی سوال پوچھنا ہو۔ شادی نہیں ہو رہی، مقدمہ جیتوں گا یا ہاروں گا، کاروبار چلے گا یا نہیں، جو بھی سوال پوچھنا ہو ہاتھ کھڑا کر دے:"

کئی لوگ ہاتھ کھڑے کرتے ہیں۔ پروفیسر بڑے انکسار سے مسکرا کر کہتا ہے "باری باری بھائیو! میں حضرت سلیمان جی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا"

پھر وہ ایک آدمی کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھتا ہے۔

"ہاں جی بزرگو! آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ میرا لڑکا بڑے ہسپتال میں بہت سخت بیمار ہے اُسے آرام آئے گا کہ نہیں؟"

"آپ کا اسم شریف بزرگو؟"

"اللہ دتا۔"

پروفیسر دو تین بار کندھے اُچکاتا ہے اور پھر لڑکے کے ماتھے پر انگلیوں کا دباؤ ڈال کر کہتا ہے۔

پروفیسر :- حضرت سلیمان جی سے پوچھو۔ بابا جی!

لڑکا :- بابا جی!

پروفیسر :- اللہ دتا جی کا لڑکا جو بڑے ہسپتال میں پڑا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا؟

لڑکا :- اللہ دتا جی کا لڑکا جو بڑے ہسپتال میں پڑا ہے ٹھیک ہو جائے گا؟

پروفیسر :- اگر ٹھیک ہو جائے گا تو بابا جی شہادت کی انگلی کھڑی کر دیں اگر ٹھیک نہیں ہوگا تو سر ہلا دیں۔

لڑکا :- اگر ٹھیک ہو جائے گا تو بابا جی شہادت کی انگلی کھڑی کر دیں۔ اگر نہیں ٹھیک ہوگا تو سر ہلا دیں۔

پروفیسر :- دیکھو بابا جی نے شہادت کی انگلی کھڑی کی ہے یا سر ہلا رہے ہیں۔

لڑکا :- شہادت کی انگلی کھڑی کی ہے۔

اس جواب کے ساتھ ہی پروفیسر مُندری زور زور سے دو ایک بار کندھے اُچکاتا اور اس بزرگ سے مخاطب ہو کر کہتا:

"جاؤ بزرگو! بچوں میں مٹھائی بانٹو۔ تمہارا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے تم سے کچھ لیا تو نہیں نا؟ تم نے مجھ کو کچھ دیا تو کچھ نہیں نا؟"

وہ بزرگ خوشی سے نہال ہو کر کہتا،

"نہیں بیٹا!"

پروفیسر مجمع میں چاروں طرف دیکھتا اور کہتا:

"اس بزرگوار کے بچے کی صحت کی خوشی میں سب لوگ زور سے تالی بجاؤ"

سارا مجمع زور زور سے تالیاں بجانے لگتا۔ تالیوں کی آواز سن کر کئی راہگیر یہ دیکھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ جو ایک بار پروفیسر مُندری کے مجمعے میں آکر کھڑا ہو جاتا وہ اُس کی لچھے دار عجز و انکسار سے لبریز باتوں کا سیر

ہو کر رہ جاتا۔ چار چھ حاجتمندوں کے سوالوں کے جوابات دینے کے بعد پروفیسر مُندری اب اُس سلیمانی انگوٹھی کے فوائد گنوانا شروع کر دیتا۔

"مقدمے کا فیصلہ اپنے حق میں کروانا ہو، نئی شادی کرانی ہو۔ محبوبہ کو اپنے قدموں پر جُھکانا ہو۔ کمر میں درد ہو، مرض جو بھی حاجت ہو، جو بھی بیماری ہو یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھنے سے دور ہو جائے گی۔ اب آپ اس کی قیمت پوچھیں گے ؟ اس کی قیمت کچھ نہیں۔ میں ایسے لوگوں میں، مزدور تمندوں میں، حاجت مندوں میں اپنے پیر و مرشد کا نام روشن کرنے کے لیئے مفت بانٹتا ہوں اور سب لوگ جانتے ہیں کہ اس جگہ عرصہ پندرہ برس سے کھڑا یہ انگوٹھیاں مفت بانٹ رہا ہوں، لیکن اپنے پیر و مرشد کے پاس کشمیر کی پہاڑیوں میں جا کر مجھے ان انگوٹھیوں پر دم کروانا پڑتا ہے، تو صرف آنے جانے کے کرائے کے لیئے میں نے اس کا نذرانہ صرف دو آنے، دو آنے، دو آنے رکھا ہے۔"

اب پروفیسر ڈبی میں سے ساری انگوٹھیاں نکال کر اپنی ہتھیلی میں ڈال لیتا اور کندھے اُچکا اُچکا کر کہتا،

"میرے پاس بہت تھوڑی انگوٹھیاں رہ گئی ہیں۔ جن صاحب کو لینی ہو آواز دے کر پکارے۔ جلدی کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ وہ لے گا تو میں لوں گا۔ دو آنے دو آنے۔ اچھا مہربان لایا۔"

"ایک انگوٹھی مجھے بھی دینا۔"

"لایا مہربان۔"

"ایک مجھے بھی دینا۔"

"لایا چاچا جی۔"

"ایک ادھر بھی لائیں۔"

"لایا میاں جی۔"

میں اُن دنوں گورنمنٹ اسکول امرتسر میں پڑھا کرتا تھا۔ کلاس روم سے کھسک کر میں پروفیسر مُندری کے مجمعے میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے بول رہا ہوتا اُس

اس کے ہونٹوں کے کونوں میں جھاگ جمع ہوتا۔ ماتھے پر پسینہ، وہ بار بار گلے میں لٹکے ہوئے پرنے سے چہرہ پونچھتا۔ وہ ہماری گلی میں رہتا تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک روز اُس نے مجھے پکڑ کر میدان میں کھڑا کر دیا۔ میرے انگوٹھے میں انگوٹھی ڈالی اور ہٹ جاؤ بچاؤ والے جھاڑو لاؤ۔ دری والے دس لاؤ کی گردان شروع کر دی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اُس کے محلے کا ہوں مجھ پر اُسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ لیکن میں انتہائی شریر ہوا کرتا تھا۔ اُس نے کہا۔

"ہٹ جاؤ۔"

"ہٹ جاؤ۔"

"کیا نظر آ رہا ہے؟"

"آنکھ۔"

"کس کی آنکھ؟"

"میری آنکھ۔"

پروفیسر مُندری ذرا سٹپٹایا۔ پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"ابھی دماغ روشن ہو جائے گا۔"

اس کے بعد اُس نے اپنی انگلیوں سے میرا ماتھا بڑے زور سے دبانا شروع کر دیا۔

"اب دیکھو۔"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا نظر آ رہا ہے؟"

"آنکھ۔"

"کس کی آنکھ۔"

"میری آنکھ۔"

میں پروفیسر کا مجمع خراب کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ فوراً انگوٹھی میرے ہاتھ سے اتار کر ایک دھول میری گردن پر ماری اور کہا۔

"بھاگ جا خلیفے دے پُتر! آج تو نہا کر اسکول نہیں آیا۔"

میں بھاگ کر مجمعے سے باہر آتا اور کہیں نہ کہیں آدمیوں کے بیچ میں سے گھس کر دوبارہ مجمع میں آ کر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتے دیکھتے پروفیسر کی ساری انگوٹھیاں بک جاتیں۔ ڈبی خالی ہو جاتی اور اس کی جیب سکّوں سے بھر جاتی۔ کئی بار میں نے مجمعے میں پروفیسر کے بھائیوں کو بھی انگوٹھیاں خریدتے دیکھا۔ ایک روز جو میں مجمع میں گھسا تو پروفیسر ایک بوڑھے سے پوچھ رہا تھا:

"بابا جی! آپ میری انگوٹھی خرید کر لے گئے تھے نا؟"

"ہاں بیٹا۔"

"آپ اپنے ایمان سے بتائیں۔ خدا کو جان دینی ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر بتائیں کیا آپ کو فائدہ ہوا؟"

"ہاں جی بڑا فائدہ ہوا۔"

"میں نے آپ سے کچھ لیا تو نہیں؟ آپ نے مجھے کچھ دیا تو نہیں؟"

"جی نہیں۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے — تو صاحبان! ......"

وہ بوڑھا، پروفیسر مُندری کا والد تھا۔

آدھا امرتسر جانتا تھا کہ پروفیسر مُندری جھوٹ کا دھندا کرتا ہے۔ جعلی انگوٹھیاں بیچتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مجمع میں کھڑے لوگوں کو میں نے اُس پر ہنستے دیکھا ہے پھر بھی لوگ اُس سے انگوٹھیاں خریدتے تھے اور اس کے کاروبار میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ مجمع میں جب کوئی شخص اس پر آوازہ کستا تو پروفیسر کا آدمی اُس کی گردن پیچھے ہی سے دبوچ کر اُسے نکال باہر لے جاتا۔ اگر کوئی اکڑ جاتا اور لڑائی مار کٹائی پر آمادہ ہو جاتا تو پروفیسر مُندری لپک کر اُس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر انکسار سے کہتا:

"یار جادو ناں! کیوں میری روزی میں لات مار رہے ہو؟"

ہندوؤں کے محلے میں مجمع لگاتے وقت ماتھے پر تلک لگا، سر پر گول ہندوانہ ٹوپی پہن

کر جاتا۔ سکھوں کے علاقے میں وہ سر پر پگڑی باندھ کر جاتا اور گورو بابا نانک کے نام پر بار بار ہاتھ آنکھوں پر لگا کر چومتا۔ اپنے محلے میں لوگ اُسے فرڈ سمجھتے تھے۔ ہر شخص اُس سے مذاق کرتا۔ اُس کی کسی بات کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اُسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی جاتی۔ جب وہ انگوٹھیوں والی ڈبی ہاتھ میں لئے گول ہندوانہ ٹوپی پہنے پرنا گلے میں ڈالے گلی میں سے گزرتا تو محلے کے لڑکے اُس پر آوازیں کستے۔ دُکاندار بھی اُس پر ایک آدھ فقرہ چست کرنا کبھی نہ بھولتے۔ پروفیسر اُن سب کا جواب ایک بے ضرر سی، عاجزانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ دیتا اور کندھے اُچکاتا، گردن داہنے کندھے کی طرف جھکائے گلی میں سے گزر جاتا۔

وہ کشمیری ہاتووں کی طرح لحیم شحیم تھا۔ دانت چھوٹے چھوٹے تھے، جیسے کسی نے ریتی سے گھسا دیئے ہوں۔ ہمیشہ پُرانی سی پتلون اور چپّل پہنتا۔ قمیض پتلون سے باہر رہتی۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ عمر یہی کوئی چالیس کے قریب ہو گی۔ مگر صحت مند تھا۔ ایک زمانے میں اُس نے ریل گاڑیوں میں گھوم پھر کر زنبور سے لوگوں کے دانت نکالنے کا بھی دھندا کیا، مگر یہ دھندا چل نہ سکا۔ انہی دنوں محلے کے پنواڑی چاند خان کی ڈاڑھ میں شدید درد اُٹھا تو پروفیسر نے اُس کی ڈاڑھ نکالنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ چاند خان مان گیا۔ پروفیسر فوراً گھر سے اپنا زنگ آلود زنبور لے آیا اور چاند خاں سے بولا:

"منہ کھولو چاند خاں۔"

بوڑھے اور ہڈیوں کے ڈھانچ مرادآبادی پنواڑی نے منہ کھول دیا۔

"اور کھولو۔"

چاند خان نے اور منہ کھول دیا۔

"اور کھولو۔"

چاند خان منہ کھولے ہی کھولے [illegible] سبب یہ تھا کہ وہ [illegible] سے زیادہ منہ نہیں کھول سکتا۔ پروفیسر نے کہا:

"خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے دشمن نظر آ گیا ہے۔"

چنانچہ پروفیسر مُندری زنبور والا ہاتھ لے کر چاند خاں کے کھُلے منہ میں گھُس گیا اور ایک زبردست دھچکے سے داڑھ اکھاڑ پھینکی۔ چاند خاں بلبلا اٹھا۔ [illegible]

پروفیسر نے کہا۔

"دشمن مارا گیا۔ منہ بند کرو چاند خان۔"

مگر چاند خان کا منہ دوبارہ بند نہ ہو سکا۔ جانے جبڑے کی کونسی ہڈی کس ڈھب پر چڑھ گئی تھی کہ اس کا منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ پروفیسر وہاں سے بھاگ گیا اور چاند خان کو محلے والے تلنگے میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ پروفیسر ایک لاری میں بیٹھ کر جالندھر کی طرف نکل گیا اور کئی روز محلے سے غائب رہا۔ ایک روز میں شہر کی ہندو آبادی میں اپنے ایک دوست شانتی سروپ سے ملنے گیا تو میں نے پروفیسر کو ایک مندر کے باہر مجمع لگائے دیکھا۔ ماتھے پر تلک تھا۔ سر پر ہندوانہ ٹوپی تھی اور وہ بار بار شری رام شری رام کرشن جی مہاراج کا نام لے رہا تھا اور ہر بار اُن کے نام پر ہاتھ چوم چوم کر آنکھوں کو لگا رہا تھا۔ میں اس کے مجمع میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے جھاگ اُڑ رہا تھا، ماتھا اور گنجا سر پسینے میں شرابور تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ فوراً میرے قریب آیا اور سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"گوپال پتر! جاؤ تمہاری ماتا جی یاد کر رہی ہیں۔"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں کہنے ہی لگا تھا میں گوپال نہیں حمید ہوں کہ پروفیسر نے مجھے آنکھ ماری اور دوبارہ ہندوؤں کو اپنی لچھے دار باتیں سنانی شروع کر دیں۔ میں وہاں سے چل دیا۔

چاند خان ہسپتال سے ٹھیک ہو کر یعنی اپنا منہ بند کرا کر آیا تو پروفیسر اس کی دُکان پر خود گیا اور ہاتھ جوڑ کر اُس سے معافی مانگ لی۔ چاند خان بڑی تنک مزاجی سے اس پر برستا رہا۔ پروفیسر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور عاجزانہ انداز میں یہی کہتا رہا۔

"معاف بزرگو! معافی۔"

یہ عجز، یہ انکسار پروفیسر مندری کے کردار کا جزوِ اعظم تھا۔ ایک عاجزانہ سی کھسیانی

سی ہنسی ہر وقت اُس کے چہرے پر رہتی۔ آج میں پروفیسر کا چہرہ اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اُس کی عاجزی میں بے چارگی نہیں تھی، بلکہ ایک قسم کی بے نیازی اور سکون سا تھا۔ ایک جوگی، ایک سنیاسی کا سکون جو مٹی کو سونا کے بھید سے واقف ہو گیا ہو اور جس کے نزدیک اب سونا مٹی بن کر رہ گیا ہو۔ محلے والے اُسے بے وقوف بناتے اور وہ فوراً بے وقوف بن جاتا، بلکہ اپنی کچی اور کھسیانی باتوں سے دوسروں کو شہ دیتا کہ اُسے احمق بنایا جائے۔ کوئی بڑا بوڑھا اُسے اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ کسی بھی گھریلو یا معاشرتی مسئلے پر اُس کی رائے لی جائے۔ گلی کا کوئی درزی، عطار، حلوائی یا لڑکا پروفیسر پر پھبتی کستا تو جواب میں پروفیسر ہنس دیتا۔ اگر کچھ کہتا تو بس اتنا،

"خوش رہو یار تُوں۔"

اس کی زبان پر اپنے اور غیروں کے لیئے ہمیشہ کلمہ خیر ہوتا۔ میں نے اُسے کبھی کسی کو گالی دیتے یا بددعا دیتے نہیں سُنا۔ میں نے کبھی اُسے کسی پر ناراض ہوتے یا غصے میں آگ بگولا ہوتے نہیں دیکھا، حالانکہ اُس کا دھندا ایسا تھا کہ اُسے لوگوں کی پھبتیاں اور آوازے دن میں کئی بار سننے پڑتے۔ کبھی کبھی میں اسکول جا رہا ہوتا یا اسکول سے واپس آ رہا ہوتا تو پروفیسر سر پر ہندووانہ ٹوپی رکھے، ہاتھ میں ٹین کی ڈبیا لیے مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیتا میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ مسکرا کر کہتا:

"یار حمیدے۔ خوب پڑھائی ہو رہی ہے پھر؟"

نماز پڑھنے وہ کبھی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ گلی میں وہ ہمیشہ سر جھکائے داخل ہوتا اور سر جھکائے نکل جاتا۔ ایک برس لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا عُرس ہوا تو پروفیسر میلے میں مجمع لگانے کے خیال سے ریل میں بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھے راستے میں اٹاری کے سٹیشن پر پکوڑے خریدنے پلیٹ فارم پر اُتر رہا تھا کہ انگوٹھا ڈبے کے دروازے میں آ کر آدھا کٹ گیا۔ فوراً عرس مبارک پر جا کر مجمع لگانے کا خیال ترک کیا اور بس میں بیٹھ کر واپس امرتسر آ گیا۔ میرے والد نے وجہ پوچھی تو کندھا اُچکا کر بولا۔

"خلیفہ! سوچا جائے تو میں لوگوں کو دھوکا دینے عُرس مبارک پر جا رہا تھا۔ قدرت

نے مجھے وہیں روک دیا۔"

اس حادثے کے بعد پروفیسر نے زندگی بھر کبھی داتا صاحب کے عرس پر مجمع نہ لگایا۔

ایک دفعہ ہماری گلی میں محلے کے ایک مالدار شخص کے بیٹے نے کسی بات پر خفا ہو کر ایک جولاہے کے لڑکے کو اس زور کا مکا مارا کہ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور خون جاری ہو گیا۔ پروفیسر گلی میں سے گزر رہا تھا۔ اس سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ جھٹ آگے بڑھا اور زخمی غریب لڑکے کو پیار کرنے اور اپنا پرنا گیلا کر کے اس کا خون صاف کرنے لگا۔ امیر لڑکے سے صرف اتنا کہا:

"یار لڑائی جھگڑا نہ کیا کرو۔"

امیر زادہ تنک کر بولا:

"تم کون ہوتے ہو ٹوکنے پروفیسر؟"

پروفیسر عاجزی سے بولا:

"یار مجھے چاہے جو کچھ کہہ لو اس لڑکے کو کچھ نہ کہو۔ یہ تو بے چارہ غریب ماں باپ کا بیٹا ہے۔"

امیر لڑکے کا مالدار باپ بھی اپنے دیوان خانے کی کھڑکی میں بیٹھا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ غصہ کھا کر باہر آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑا دھڑ پروفیسر کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کر دیئے۔ پروفیسر کے دانتوں میں سے خون بہنے لگا۔ وہ گیلے پرنے سے خون پونچھتا جاتا تھا اور کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہے جاتا تھا۔

"معاف کر دیو بزرگو! معاف کر دیو۔۔۔"

فسادات کے قیامت خیز دنوں میں اسی مالدار شخص کے بڑے بیٹے کو گولی لگی تو محلے میں سے کوئی بھی اسے برستی گولیوں میں ہسپتال لے جانے کو تیار نہ ہوا۔ پروفیسر نے شدید زخمی نوجوان کو تانگے میں ڈالا اور اپنی جان پر کھیل کر اسے ہسپتال لے گیا۔

اس کے چھوٹے بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ گھر میں اپنے ماں باپ کا بڑا ادب کرتا تھا۔ کبھی ان کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتا تھا۔ اسے کوئی نشہ بھی نہیں لگ تھا۔

نہ پان تمباکو نہ جوا نہ شراب۔ دن میں ایک مرتبہ دوپہر کو روکھی سوکھی کھا لیتا۔ جو کچھ کما کر لاتا اپنی ماں کے قدموں میں لا کر ڈال دیتا۔ باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ پروفیسر نے لوگوں کی پھبتیاں سنیں، طعنے سہے، آوازے سنے، مگر بہن بھائیوں کی پرورش کی۔ بہنوں کی اچھی جگہ شادیاں کیں، اور اب وہ اپنے اپنے گھر خوش و خرم ہیں۔ دو بھائی اور ایک بہن لندن میں ہے۔ پروفیسر منڈی نے خود زندگی بھر شادی نہ کی۔

پاکستان بن جانے کے بعد وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ لاہور آ گیا۔ لاہور میں وہ جب کبھی مجھے بھاٹی یا نسبت روڈ یا میکلوڈ روڈ پر ملتا، سب گھر والوں کی خیر و عافیت دریافت کرتا۔ محلے والوں کی بابت پوچھتا۔

"یار ہماری گلی کے سب لوگ آ گئے تھے نا؟"

اسے اپنے محلے کے سب لوگوں کی فکر تھی۔ ان لوگوں کی بھی جو اس پر آوازے کستے تھے۔ ان لوگوں کی بھی جو اسے احمق بنایا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی بھی جو بیچ بازار میں اس کی بے عزتی کر دیا کرتے تھے۔ اسے کسی کی نفرت یاد نہ تھی۔ وہ سب سے محبت کرتا تھا اور سب کی خیر کا طالب تھا۔

لاہور آ کر اس نے ابتدا میں مجمع لگایا، انگوٹھیاں بیچتا رہا۔ اس کے بعد مجمع لگانا چھوڑ دیا۔ اب اس کے چھوٹے بھائی جوان ہو گئے تھے اور کمانے لگے تھے۔ بہنیں اپنے اپنے گھر آباد ہو گئی تھیں۔

ایک روز میں سرما کی چمکیلی دھوپ میں باغ جناح میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھوم رہا تھا کہ میں نے پروفیسر کو ایک پلاٹ میں بیٹھے دیکھا۔ وہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے بھورے کر کے چڑیوں کو ڈال رہا تھا۔ چڑیاں ہری ہری گھاس پر خوشی سے چہک چہک کر بھورے چگ رہی تھیں۔ پروفیسر چڑیوں کو دیکھ دیکھ کر بڑا خوش ہو رہا تھا۔ کبھی کوئی چڑیا اس کے ذرا قریب آ کر اپنی چونچ اٹھا کر اسے تکنے لگتی تو وہ اس کی طرف گردن جھکا کر پچکارتے ہوئے باتیں کرنے لگتا۔ مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر اس کی جھکی ہوئی گردن، مسکراتا ہوا چہرہ اور ہلتے ہوئے ہونٹ صاف نظر آ رہے

تھے۔ مجھے یقین ہے وہ چڑیوں سے یہی پوچھ رہا ہوگا۔

"کیوں بھئی ننھی مُنی چڑیو! کیا حال چال ہے؟"

آخری بار میں نے پروفیسر کو انارکلی سے گزرتے دیکھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ انارکلی پر بڑا رش تھا۔ پروفیسر لوہاری دروازے سے نیلے گنبد کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کی گردن ذرا کندھے پر ذرا جھکی ہوئی تھی۔ چہرے پر وہی بھولی بھالی پُرسکون سی مسکراہٹ تھی اور وُہ لوگوں کے شور و غل اور ہجوم سے بے نیاز یوں چلا جا رہا تھا جیسے باغِ جناح کی کسی سایہ دار سنسان رَوش پر سے گزر رہا ہو۔ پروفیسر لاغر اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا اور اپنی دنیا میں مگن میرے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا دیا۔ وہ مجھے بڑا اچھا لگا ——— وہ مجھے ہمیشہ بڑا اچھا لگا تھا۔ وہ نقلی پروفیسر تھا اس کے پاس کسی سکول، کسی کالج، کسی یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ نہیں تھے۔ وہ اَن پڑھ تھا اُس نے کبھی کسی کالج کے کلاس روم میں لیکچر نہیں دیا تھا۔ اُس نے کالجوں اور سکولوں کے باہر مجمع ضرور لگایا تھا۔ میرے خیال میں اُس نے اپنے مجمعوں میں جو لیکچر دیئے وہ آج کے پروفیسر کے لیکچروں کے مقابلے میں زندگی سے زیادہ قریب تھے۔ اس لیئے کہ آج کے پروفیسر کو لائبریری نے جنم دیا ہے اور وہ پروفیسر بھوک، افلاس، معاشرتی ناانصافی اور مردم آزاری کی دلدلوں میں پیدا ہوا۔ آج کے پروفیسر کے اصلی سرٹیفکیٹ جھوٹے ہیں اور کل کے پروفیسر کے جھوٹے تمغے سچے تھے۔ اُس نے اپنے لیکچروں سے کسی طالب علم کی تربیت نہیں کی۔ وہ خود ہی مرتب ہو گیا۔ وہ ایک ایسا عجیب و غریب پارس پتھر بن گیا جو اپنی اَجزائی کمی بیشی کے باعث کسی کو سونا تو نہ بنا سکا، لیکن خود سونا ہو گیا۔

آج سے چند برس پہلے مجھے کسی نے بتایا کہ پروفیسر مر گیا۔ جانے کیوں یہ خبر سنتے ہی میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہی مسکراہٹ جو ایک دوپہر پروفیسر کو انارکلی میں سے گزرتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر آئی تھی۔ اور اور

پھر میں نے ایک منظر دیکھا۔ سنہری دُھوپ میں زمرد کی طرح دمکتا، سرخ گلابوں سے بھرا ہوا خوشبودار باغ۔ اور اس باغ کے شفاف پانیوں والی نہر کے کنارے پروفیسر

گھاس پر بیٹھا نیلی آنکھوں والی سبز چڑیوں کو دانہ ڈال رہا ہے۔ ایک بھولی بھالی چڑیا اپنی سرخ چونچ اٹھا کر پروفیسر کو دیکھتی ہے اور پروفیسر اُسے پچکارتے ہوئے ذرا سا مسکرا کر پوچھتا ہے۔

"کیوں بھئی ننھی منی چڑیو! کیا حال چال ہے؟"

امرتسر کے جن اور بھوت

ویسے تو امرتسر کا ہر مسلمان اپنی جگہ پر جن تھا پھر بھی شہروں کے اپنے بھوت پریت ہوتے ہیں ان کی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہر کہانی کو سچا واقعہ کہہ کر سنایا جاتا ہے۔ سنانے والا اپنی بساط کے مطابق اس کے گرد آسیب اور دہشت کے ہالے بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ آسیبی کہانیاں سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی خاص شہر کی معاشرتی زندگی کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔

امرتسر کی ایک چڑیل میاں پترو کی کہانی میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ آج آپ کو کچھ اور بھوت پریت کے واقعات سناؤں گا۔ یہ سارے جن بھوت پاکستان بننے کے بعد امرتسر میں ہی رہ گئے اور اگر پاکستان چلے آئے ہیں تو ان سے پھر کبھی یہاں ملاقات نہیں ہوئی۔

دادا جان سنایا کرتے تھے کہ جب پہلی بار ریل گاڑی چلی تو امرتسر کے چاروں طرف پھلدار باغ اور ٹالیاں ہی ٹالیاں ہوا کرتی تھیں اور وہاں دن میں جاتے ہوئے بھی آدمی گھبراتا تھا۔ باغوں کے راکھے بلند آواز میں چڑیاں طوطے اڑا کر اپنے دل کا خوف کسی حد تک دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں ایک درخت آسیب زدہ تھا۔ دادا جان کہتے ہیں کہ اس درخت پر کبھی کبھی راتوں کو آگ کی چنگاریاں اڑا کرتی تھیں ایک بار ایسا ہوا کہ رات کو باغ کے راکھے کی آنکھ کھل گئی۔ پھلوں کا موسم تھا۔ سارا باغ گول گول سفید امرودوں سے لدا ہوا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی امرود توڑنے باغ میں گھس آیا ہے۔

وہ اپنی جھونپڑی سے نکل کر باہر آیا تو اسے ستاروں کی دھیمی روشنی میں آسیبی درخت کے نیچے ایک آدمی دکھائی دیا جو ٹوکری امرود بھر رہا تھا۔ راکھا وہیں سے للکار کر اس کی طرف بڑھا اور سوٹیا گھما کر اس کی ٹانگوں پر مارنا چاہتا تھا کہ وہ آدمی غائب ہو گیا۔ راکھے کا سوٹا اوپر کا اوپر ہی رہ گیا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ درخت کی شاخوں سے کوئی شے دھپ سے زمین پر گری اور لڑھکتی ہوئی

راکھے کے پاؤں کے ساتھ آکر لگ گئی راکھے نے جھک کر دیکھا۔ وہ کسی انسان کا تازہ کٹا ہوا سر تھا۔ اگلے روز راکھے کی لاش اسی درخت کے ساتھ لٹکتی پائی گئی۔ اس کے بعد کوئی اس طرف نہیں جاتا تھا جس شخص نے امرودوں کا ٹھیکہ لیا تھا اس کے مزدور بھاگ گئے۔ میں نے امرتسر میں ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ گھروں میں ایک طاق ضرور ہوتا جہاں جمعرات کی جمعرات دیا جلایا جاتا۔ ہمارے گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں بھی ایک طاق تھا میری نانی یہاں پر جمعرات کی شام کو دیا جلایا کرتی۔ دبلی پتلی سفید سی بوڑھی عورت تھی، گھارونئی سے بنائی گئی ہے۔ کشمیری زبان بڑی روانی سے بول لیتی تھی۔ ایک روز میرے پوچھنے پر نانی نے بتایا کہ طاق میں بابا جی رہتے ہیں میں اس کوٹھڑی میں جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ایک روز نانی دیا جلا کر گئی تو میں نے کیواڑ کی درز سے آنکھ لگا کر دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ کا چہرہ دیئے کی لو کے ساتھ لگا مسکرا رہا ہے میں چیخ مار کر بھاگا اور جا کر نانی سے لپٹ گیا اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"بابا جی! تم سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ ارے تو ان کی دعاؤں سے تو اس دنیا میں آیا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ یہ میرا وہم تھا۔ لیکن اس عہد کے لوگ ان باتوں پر بڑا پکا یقین رکھتے تھے۔

میری آپو جی نے مجھے ایک کہانی سنائی کہ ایک جن تھا جو سمرقند سے امرتسر کی ایک مسجد میں موذن بن کر آگیا۔ وہ دبلا اور لمبا تھا۔ جب اذان دیتا تو اتنا لمبا ہو جاتا کہ گردن نیچی کر کے سارے امرتسر شہر کا نظارہ کر لیتا ہماری گلی میں ایک لمبا تڑنگ آدمی تھا کاکے قاندرونیف نان بائی کی دکان پر رات کو خمیر گوندھا کرتا تھا اس کی گردن اونٹ کی طرح لمبی تھی اور جھک کر چلا کرتا۔ رات کو کاکے کی دکان میں خمیر گوندھتا اور دن شہر سے باہر کسی تالاب پر مچھلیاں پکڑنے میں گزار دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی وہ سمرقند کا جن ہے جس کی کہانی آپو جی نے سنائی تھی۔ وہ جب مچھلیاں پکڑنے والی لمبی چھڑی کندھے پر رکھے، بغل میں تھیلا لٹکائے گلی میں سے گزرتا تو میں بھاگ کر مکان کی سیڑھیوں میں چھپ جاتا۔

کاکے نانبائی کی دکان میں ایک کرتا بھورا آدمی تھا جو پیچھے گھر آتا تھا وہ سارے کا سارا بھورا تھا۔ پلکیں بھی بھوری تھیں اور آنکھیں میچ کر دیکھا کرتا۔ بالکل ان پڑھ تھا اس کے سر پر جن کا سایہ تھا۔ جب کبھی اسے دورہ پڑتا تو اس کی آواز بھاری ہو جاتی۔ وہ پوری آنکھیں کھول لیتا اور فر فر فارسی بولنی شروع کر دیتا۔ اور روز گار آدمی سے زیادہ مثنوی مولانا روم یاد تھی۔ اس نے ایک بار جن کی فارسی کا امتحان لیا۔ ان نے بھورے سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟ بھورے نے کہا۔

"میرا نام سلیمان جن ہے اور میں ایران سے آتا ہوں"

"کیا تم ہمیں مولانا روم کی مثنوی کے شعر سنا سکتے ہو؟"

سلیمان جن نے ترنم سے مثنوی رومی سنانی شروع کر دی۔ دکان پر محلے والوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ مولوی سلام بابا پر تو رقت طاری ہو گئی۔ احمد رفوگر بھی سر جھکائے جھوم رہا تھا۔ سلیمان جن نے کہا:

"اب بتاؤ کون سا پھل کھاؤ گے؟"

احمد رفوگر نے کہا۔

"کوئی بے موسمی پھل کھانا چاہیے"

بھورے نے اپنے جسم کو سمیٹ کر ہاتھ واسکٹ کے اندر ڈالا اور ایک سرخ قندھاری انار نکال کر تخت پوش پر رکھ دیا حالانکہ وہ موسم اناروں کا نہیں تھا۔ لوگوں نے فرطِ عقیدت سے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سلیمان جن نے کہا:

"اچھا اب ہم جاتے ہیں، پھر ملیں گے۔"

یہ ساری گفتگو وہ فارسی زبان میں کر رہا تھا جس کا ترجمہ ساتھ ہی ساتھ احمد رفوگر لوگوں کو سنائے جاتا تھا جن چلا گیا تو بھورا نیم جان سا ہو کر تخت پوش پر لیٹ گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ ویسے کا ویسا ان پڑھ تھا اور وہ فارسی کی الف ب سے بھی ناواقف تھا۔ ضعیف الاعتقاد عورتیں اور مردوں نے بھورے کو اپنا پیر بنا لیا اور منتیں ماننے کے بعد پھر کبھی اس کی شکل نہ دیکھی۔

ہماری ساتھ والی گلی میں ایک سکھ پر بھی جن آتا تھا۔ ظاہر ہے اس کا جن بھی کوئی سکھ ہی ہو گا یا اگر سکھ نہیں تھا تو دو تین بار اس سکھ پر آنے کے بعد خود بھی سکھ ہو گیا ہو گا ویسے بھی اس جن کے سکھ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جو ایک سکھ پر آ جائے۔ میرا خیال ہے جن لوگوں نے امرتسر کے سکھ دیکھے ہیں انہیں جن دیکھنے کی حاجت نہیں ہو گی۔ یہ سکھ جو ہماری ساتھ والی گلی میں رہتا تھا۔ ایک ترکھان تھا اور نہایت شریف آدمی تھا۔ وہ لوگ جن کو مسان کہتے تھے۔

جس وقت سکھ کو دورہ پڑتا تو وہ اپنے سر کو اس زور سے جھٹکا دیتا کہ پگڑی اچھل کر دور جا پڑتی اور کیس کھل جاتے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بالوں کا موٹ کیس کھل جاتا۔ اس کے سر کے بال مونچھوں کے بال داڑھی کے بالوں میں الجھ جاتے اور وہ ایک ٹانگ پر رقص کرنا شروع کر دیتا۔ اس سے پہلے

میں نے اتنا زیادہ کھلا سکھ کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے گھر والے مسان نکالنے والی ٹولی کو بلا لیتے جو سارا سارا دن اور ساری ساری رات ڈھول کا کھڑکا اور چمٹے بجا بجا کر محلے والوں کا ناک میں دم کر دیتے تھے۔ سکھ بے چارے کو ہرمل کی دھونی دیتے مگر جن اس بے چارے سکھ کو نچائے چلا جاتا۔ بھلا جو جن سکھ کو برداشت کر سکتا تھا۔ ہرمل کی دھونی اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتی تھی۔

مسان عام طور پر ہندو سکھوں کے گھروں میں آتے تھے اور جن مسلمانوں پر سوار ہوتے تھے۔ چڑیلیں اجاڑ باغوں، اور ویران، پرانی حویلیوں میں ڈیرہ لگاتی تھیں۔ چلیڈے درختوں میں بسیرا کرتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی شکل میں آدھی رات کے وقت مسافروں کو ملتے۔ ان کا راستہ روکتے، قہقہے لگاتے اور پھر انہیں بے ہوش کر کے غائب ہو جاتے۔ ان کے رنگ کالے ہوتے اور منڈے ہوئے سروں پر لمبی لمبی بودیاں ہوتی تھیں۔ ہماری گلی میں پوربیئے کا لڑکا کالا تھا اور اس کی لمبی بودی تھی ہم اسے چلیڈا کہہ کر روڑے مارا کرتے تھے۔

ہمارے محلے میں ہی ایک دائی رہتی تھی جس کا نام مجھے معلوم نہیں کیا تھا لیکن محلے میں وہ آپی ڈب ڈبی کے نام سے مشہور تھی۔ محلے کی ایک پوری نسل کی دایہ گری اسی نے کی تھی۔ سرخ و سفید بھاری بھرکم بڑی رعب داب والی کشمیری عورت تھی۔ اس کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی مشہور تھی۔

کہتے ہیں کہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ امرتسر شہر سنسان پڑا تھا۔ آپی ڈب ڈبی گھری لیے لحاف میں گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک کسی نے دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ آپی ڈب ڈبی کی آنکھ کھل گئی۔ کلمہ پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا۔ نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا کھڑکی کھول کر چق اٹھا کر گلی میں جھانکا۔

"کون ہے؟"

سمجھ گئی کہ کوئی ارجنٹ کیس آیا ہے۔ نیچے سے کسی مرد نے آواز دی۔

"بہن جی! جلدی چلیے۔ زچہ کی حالت بہت خراب ہے"

آپا ڈب ڈبی نے اپنے جوان بیٹے کو جگایا۔ نیچے آئی۔ دیکھا کہ ایک نورانی چہرے والا بوڑھا کمبل لپیٹے کھڑا ہے۔

"بہن جی! میری بہو کے بچہ ہونے والا ہے میرے ساتھ چلئے۔"

آدھی رات، سخت سردی، ایک اجنبی آدمی۔ آپی ڈب ڈبی نے کہا:

"بھائی جان آپ کو میں نے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔ آپ کس محلے سے آئے ہیں؟"

اس آدمی نے کہا:

"بہن! ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے سوچا تھا۔ بہو کو بچہ ہونے والا ہوگا تو آپ ہی کو بلائیں گے۔ آج خدا وہ دن لے آیا ہے۔ سو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، برائے مہربانی جلدی چلئے۔ آپ جتنی رقم کہیں گی میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

آپی ڈب ڈبی نے کہا۔

"جانا کہاں ہوگا؟"

وہ آدمی بولا۔

"زیادہ دور نہیں۔ بس یہی کوئی دو محلے چھوڑ کر ہی اپنا گھر ہے۔ خدارا دیر نہ کریں۔ میری بہو کو اس وقت آپ کی سخت ضرورت ہے۔"

آپی ڈب ڈبی نے کہا:

"میں سو روپے لوں گی۔"

اس نورانی چہرے والے آدمی نے کہا:

"میں آپ کو دو سو روپے دوں گا۔ آپ میرے ساتھ چلے چلیں۔"

دو سو روپے آج سے پچاس برس پہلے پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی قیمت رکھتے تھے۔ آپی ڈب ڈبی لالچی عورت تھی فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے گرم شال جسے ہم امرتسری کشمیری فرد کہا کرتے تھے اوڑھی کانگڑی میں سے کوئلے ڈال کر ساتھ لیا اور گھر سے باہر آگئی۔ بازار سنسان تھا۔ سخت سردی تھی ایک تانگہ کھڑا تھا۔ بڑا خوبصورت تانگہ تھا۔ سفید گھوڑا جتا تھا جس کا ساز چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ کوچوان خاموش بیٹھا تھا۔ آپی ڈب ڈبی تانگے میں سوار ہو گئی۔ وہ نورانی صورت والا آدمی بھی آگے بیٹھ گیا اور تانگہ ہوا سے باتیں کرنے لگا بازار ختم ہو گیا۔ تانگہ گوال گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اور ٹھٹھرتی رات کی خاموشی میں ایک ویران سڑک پر دوڑنے لگا۔ آپی ڈب ڈبی نے پوچھا کہ بھائی صاحب آپ کہاں جا رہے

ہیں؟

اس آدمی نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"بہن! ہمارا مکان ذرا شہر سے باہر ہے آپ گھبرائیں نہیں۔ ہمارا آدمی آپ کو واپس گھر چھوڑ کر آئے گا۔"

تانگہ اب جرنیلی سڑک پر آگیا تھا اور بڑی برق رفتاری سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ آپی ڈب ڈبی کو اپنی کانگڑی سنبھالنی مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ اسے تیز ہوا میں بھی نہیں لگ رہی۔ جب تانگے نے بجلی والی نہر کا پل عبور کیا تو وہ گھبرا گئی اس نے کہا:

"تانگہ روک دیں میں آگے نہیں جاؤں گی۔"

اس آدمی نے کہا۔

"بہن پریشان نہ ہوں۔ ہم غریب لوگ ہیں بڑے شریف ہیں۔ بہو بیٹیوں والے ہیں بس مکان آنے ہی والا ہے۔"

اور پھر بجلی والی نہر سے کوئی آدھ میل آگے جا کر تانگہ دائیں جانب کھیتوں میں گھوم گیا اور تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

"تشریف لائیے۔"

آپا ڈب ڈبی نے دیکھا سامنے ایک جھونپڑا تھا وہ آدمی اسے ساتھ لے کر جھونپڑے میں آگیا۔ وہاں ایک چراغ جل رہا تھا جس کی مدھم روشنی میں ایک عورت چارپائی پر لیٹی دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ آپی ڈب ڈبی فوراً اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جھونپڑے میں ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ لڑکا پیدا ہوا تھا۔ نورانی صورت والے بزرگ نے آپی ڈب ڈبی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کونے میں سے کچھ کچے کوئلے اٹھا کر اس کی کانگڑی میں ڈالے اور کہا۔

"ہماری طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول کرو بہن۔"

آپی ڈب ڈبی کو سخت غصہ آیا کہ یہ لوگ آدھی رات کو اسے اٹھا کر لائے اور اب اسے کوئلے انعام میں دے رہے ہیں۔ ویسے وہ کچھ ڈر بھی گئی تھی اور وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ان لوگوں کا ایک آدمی اسے تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑ گیا۔ آپی ڈب ڈبی نے غصے میں ان کے دیئے ہوئے کوئلے راستے

میں پھینک دیئے۔ رات تین بجے وہ گھر پہنچی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچا کر آئی۔ صبح اٹھ کر گٹھڑی کو دیکھا تو وہاں رات کے بچے ہوئے جو دو ایک کوئلے رہ گئے تھے وہ سونے کی ڈلیوں میں تبدیل ہو چکے تھے آپی ذب ڈبی سر پیٹ کر رہ گئی۔ اصل میں وہ لوگ جن تھے اور انہوں نے اسے کوئلے کی شکل میں سونے کی ڈلیاں انعام کے طور پر دی تھیں۔ صبح آپی ذب ڈبی اپنے لڑکے کو لے کر رات والی جگہ کی طرف گئی مگر وہاں اب نہ وہ جھونپڑی تھی اور نہ وہ لوگ۔

چھہرٹہ کی طرف جاتے ہوئے خالصہ کالج کے عقب میں رام تیرتھ روڈ تھی۔ اس سڑک پر ایک پرانا مندر تھا جہاں ایک زمین دوز کنڈ تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ اس کنڈ کے بارے میں مشہور تھا کہ بن باس کے دنوں میں سیتا اپنے کپڑے یہاں دھویا کرتی تھی۔ اس کنڈ کے اوپر کیکر کا درخت تھا جس میں ایک چڑیل کا بسیرا تھا۔ لوگ اس طرف نہیں جاتے تھے۔ شریف پورے کا ایک درزی چھہرٹہ کو ونگ فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر واپس آ رہا تھا کہ رام تیرتھ روڈ پر مندر کے پاس آندھی شروع ہو گئی۔ آسمان ہلدی کے رنگ کا سا ہو گیا۔ ہوا کا اتنا زور تھا کہ درخت دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ درزی ایک درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس تیز آندھی میں مندر کی طرف سے ایک کھلے بالوں والی عورت ہاتھ پر چراغ رکھے اس کی طرف چلی آ رہی ہے۔ اس قدر برق رفتار ہوا میں بھی چراغ کی لَو بالکل سیدھی تھی۔ درزی کو ایک دم رام تیرتھ کی چڑیل کا خیال آ گیا۔ عورت اب قریب آ گئی تھی اور اس کے باہر نکلتے ہوئے دو لمبے دانت درزی کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ ایک دم اٹھا اور شریف پورے کی طرف دوڑا گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے گھبراہٹ میں زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"دروازہ کھولو ماں! دروازہ کھولو۔"

"کھولتی ہوں۔"

اندر سے ماں کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھل گیا اور درزی ایک بھیانک چیخ مار کر سیڑھیوں میں بے ہوش ہو گیا کیونکہ دروازہ رام تیرتھ کی چڑیل ہی نے کھولا تھا۔

ہمارے خالو جان فرصت کے اوقات میں بچوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ ایک بار وہ اپنی کوٹھڑی میں اپنے ایک شاگرد سے پاؤں دبوا رہے تھے انہوں نے کہا۔

"عبدالرحمان! اپنا چراغ کی لَو اونچی کر دو۔"

کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے پر طاق میں دیا جل رہا تھا۔ عبدالرحمان نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر پندرہ فٹ لمبا کیا اور دیئے کی لَو اونچی کر دی۔ خالو جان نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"سچ سچ بتا تو کون ہے؟"

لڑکے نے ادب سے کہا۔

"پیر جی! میں عبدالرحمان جن ہوں اور کابل سے آپ سے قرآن شریف پڑھنے آیا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ مجھے معاف کر دیں اور قرآن شریف ضرور پڑھائیں۔"

خالو جان نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"بیٹے عبدالرحمٰن! ہم تمہیں پورا قرآن پڑھائیں گے لیکن ذرا دو چار قندھاری انار تو کابل سے لاؤ۔"

عبدالرحمٰن جن نے ہاتھ جیب میں ڈال کر چار قندھاری انار باری باری نکالے اور خالو جان کو پیش کئے۔

"سبحان اللہ! بس میاں ہمیں دو چار قندھاری انار روز لا کر کھلا دیا کرو۔"

خالو جان نے کہیں ایک محفل میں یہ کہہ دیا کہ کابل کا عبدالرحمٰن نامی مسلمان جن ان سے قرآن شریف پڑھتا ہے ایک آدمی نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ وہ کسی جن بھوت کو نہیں مانتا۔ یہ سب باتیں جھوٹ ہوتی ہیں۔ دوسرے روز صبح صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ آدمی مسجد کے کنوئیں میں رسے کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا ہے۔ وہ دہائی دے رہا تھا کہ مجھے عبدالرحمٰن سے بچاؤ۔ میں اب کبھی مذاق نہیں اڑاؤں گا۔

خالو جان نے عبدالرحمان سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ کام اسی نے کیا ہے اس کے بعد عبدالرحمٰن جن صرف رات کے وقت خالو جان سے قرآن پڑھنے آتا تھا۔ جب پورا قرآن ختم ہو گیا تو وہ غائب ہو گیا۔ خالو جان کہا کرتے تھے کہ عبدالرحمان جن جاتے وقت انہیں سونا بنانے کا نسخہ بتا گیا تھا لیکن ہم نے کبھی خالو جان کے ہاتھوں سونا بنتے نہیں دیکھا۔

تیز دھوپ اور گرم لو میں سکھی باغ سنسان تھا ایک نوجوان مائی جیواں کی خانقاہ کی طرف چلا جا رہا تھا اس نے دیکھا سرو کے ایک درخت کے پاس سبز ریشمی کپڑوں میں ملبوس ایک نہایت حسین عورت جو بت بنے کھڑی ہے اتنی حسین عورت اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جب وہ اس کے

قریب سے گزرا تو عورت نے پوچھا۔

"بڑی نہر کو کون سی سڑک جاتی ہے؟"

نوجوان نے دیکھا کہ عورت کی آنکھوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور اس کا جسم گویا شیشے کا تھا اور نظر جسم سے آر پار جا رہی تھی۔ وہ ڈر گیا اس نے سن رکھا تھا کہ دوپہروں میں باغ میں چڑیلیں شہزادیوں کا روپ دھار کر ملتی ہیں۔ وہ بھاگنے لگا تو اس کے پاؤں گویا پتھر بن گئے۔ حسین عورت نے اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس حسینہ چڑیل نے نوجوان کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لے کر بڑی نہر والے پل کی طرف روانہ ہو گئی اس کے چلنے سے چھن چھن کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ نوجوان دکھائی نہیں دیا۔ کتنی رومانٹک تھیں امرتسر کی چڑیلیں بھی! اب تو نہ سرو کے درخت ہیں اور نہ بڑی نہر کو جانے والی سڑکیں ہیں اور نہ وہ رومانٹک چڑیلیں ہیں جو حسین شہزادیوں کا روپ دھار کر ملتی تھیں اور ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ لے جا کر گم کر دیا کرتی تھیں۔ اب تو ہر سڑک کسی دفتر یا کسی کارخانے کو جاتی ہے اور ایک کارخانے سے نکل کر دوسرے کارخانے کی طرف چل پڑتی ہے۔ سرو کے درخت کارخانوں کے کیمیکلز کے نسواری دھوئیں سے مرجھا گئے ہیں اور نہر دل میں کارخانوں کا تیل مل گیا ہے۔ قرآن شریف پڑھنے والے جن شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور چڑیلیں ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں سو رہی ہیں۔

جی میں آتا ہے کہ کسی جھلستی لو والی گرم دوپہر میں املتاس کے زرد پھول لے کر چڑیل کی تلاش میں نکلوں اور جب وہ کسی سرو کے درخت تلے حسین شہزادیوں کے ریشمی سبز لباس میں کھڑی مجھ سے بڑی نہر کا راستہ پوچھے تو میں اس کی طرف بڑھوں، اس کا ہاتھ تھاموں اور اسے ساتھ لے کر ایسا جاؤں کہ پھر کبھی واپس نہ آؤں۔

نُور کبھی ہائی جیک نہیں ہوتا

مولوی حسن اپنے چیل منڈی والے مکان کی بیٹھک میں انگیٹھی پر نیلی کیتلی سے چائے ابال رہا تھا کہ بم کا دھماکہ ہوا۔ برج بھولا سنگھ کے اکالی سکھوں نے دروازہ مہاں سنگھ پر حملہ کر دیا تھا۔ مولوی حسن ہاکی لے کر دروازے کی طرف بھاگا۔ رزاق رفوگر چارپائی کی پٹی لے کر اٹھ دوڑا چوٹی بدمعاش کے ہاتھ میں سریا تھا۔ رفیق گاڈی خالی ہاتھ اکالیوں کی کرپانوں اور رائفلوں کا مقابلہ کرنے جا رہا تھا میں اس زمانے کی ینگر جنریشن تھا۔ میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میرے اور ان لوگوں کے درمیان کوئی جنریشن گیپ نہیں تھا۔ جہاں مولوی حسن کے قدم اٹھتے تھے وہاں میرے قدم پڑتے تھے۔ جنریشن گیپ وہاں نمودار ہوتا ہے جہاں نہ پرانی نسل کا ہو اور نہ نئی نسل کا ہو۔ لیکن مارچ ۱۹۴۷ء کی اس دوپہر کو ہمارے سامنے زندگی کا مقصد موجود تھا۔ پرانی نسل کے سامنے بھی اور نئی نسل کے سامنے بھی۔ اور یہ مقصد تھا پاکستان — ایک ایسی جنت جہاں ہمیں ہندو زمین پر بٹھا کر جانوروں کی طرح پانی نہیں پلائے گا۔ جہاں وہ ہولی کے تہوار پر نیم عریاں ہو کر فحش گیت گاتا، رقص کرتا، ہمارے گلی محلوں سے نہیں گزرے گا اور ہمارے تعزیوں پر گندگی نہیں پھینکے گا اور خود روپوں سے بھری ہوئی تجوریوں کے لگے گاؤ تکیوں پر بیٹھ کر مسلمان نوکروں سے چلمیں نہیں بھروائے گا اور جہاں ہماری مسجدوں کی اذانیں ہندو سکھوں کی براتوں کے بینڈ کے شور میں گم نہیں ہوں گی اور جہاں کوئی شدھی اور سنگٹھن کی تحریک نہیں چلائی جا سکے گی اور جہاں ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک قرآن کو ماننے والے اپنے دینی تقاضوں کے مطابق آزادی عزت و نفس اور امن و سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔ یہ ہمارا مقصد حیات تھا یہ ہماری منزل تھی اور یہ ہمارے سفر نور کا آغاز تھا جنریشن گیپ کا لفظ ہمارے لئے لغت عزیب تھا۔

اور پھر کیا ہوا؟ مولوی حسن شہید ہو گیا۔ رفیق گاڈی کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ رزاق رفوگر

آنکھوں میں بندوق کے چھرّے کھا کر گر پڑا۔ چوٹی بدمعاش لے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے لگاتا برج جھولا سنگھ کی دیوار پھلانگ کر اکالی سکھوں کے اوپر جا گرا اور پھر واپس نہ آیا۔ مولوی حسن رفیق گاڈی، رزاق روگر اور چھٹی بدمعاش مشرقی پنجاب کے ہر شہر ہر گاؤں ہر گلی میں تھے۔ وہ زخمی ہوئے شہید ہوئے لیکن نور کا سفر جاری رہا۔ جالندھر سے قافلے چلے، ہوشیار پور، گورداسپور، روہتک، پانی پت، سونی پت انبالہ، لدھیانہ اور پٹھانکوٹ سے نور کے مسافروں کے قافلے چلے اور ایک سنگِ میل سے دوسرے سنگِ میل تک اپنے جگر کے ٹکڑوں کی لاشیں ڈالتے آگے بڑھتے رہے۔ دلی سے مہاجرین کی بھری ہوئی ٹرینیں چلیں جالندھر فیروزپور سے ریلیں روانہ ہوئیں اور لاہور ریلوے سٹیشن پر ان خون سے بھری ہوئی ریلوں سے نور کے مسافروں کی کٹی ہوئی لاشیں باہر نکالی گئیں۔ لاکھوں زندہ لاشیں اغوا کر لی گئیں۔ ان لاشوں کے بھائی ان لاشوں کے خاوند اور ان لاشوں کے باپ مہاجرین کیمپوں اور بازیافتہ خواتین کے کیمپوں کی خاک اڑاتے مر گئے۔ ایک نور کے مسافر نے واہگہ باڈر پر پاکستان کا لہراتا جھنڈا دیکھ کر کلمہ پڑھا اور جان پاک سرزمین پر نچھاور کر دی۔ دوسرے نے لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اپنے آدھے کٹے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر پاکستان کے نیلے چمکیلے نورانی آسمان کو دیکھا اور شہید ہو گیا۔ کوئی راستے میں گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ کوئی منزل نور پر آکر دم توڑ گیا۔ نہ ماں نہ بہن نہ بھائی نہ گھر نہ بار نہ آسمان۔ سب کچھ خون کی لال آندھی میں گم ہو گیا شعلوں میں جل کر راکھ ہو گیا۔ مگر نور کی پہلی سیڑھی مل گئی۔

اندلس میں ڈوبا ہوا آفتاب پاکستان کے افق سے طلوع ہو گیا۔ بادِ سحر میں اذان کی آواز گونج اٹھی مسجدوں اور گھروں کی فضائیں درود و سلام اور تلاوت کلام پاک سے معمور ہو گئیں۔ معرکہ بدر کے بعد حق اور باطل کے درمیان لکیر کھنچ گئی۔ رات بھی بہت اندھیری تھی۔ دن بھی بہت روشن نکل آیا۔ جتنی عظیم قربانی تھی۔ اتنا ہی عظیم انعام ملا۔ شرف ملا۔ عزت نفس ملی۔ اپنے دین کی راہ پر چلنے کا حق حاصل ہوا۔ بحر ظلمات سے نکل کر نور کی منزل کا سفر شروع ہوا۔ اس سفر میں خود غرضی، حسد، منافقت اور خویش پروری کی آندھیاں بھی چلیں مگر نور کا چراغ روشن رہا۔ نور کا سفر جاری رہا۔ اس لئے کہ نور کے چراغ میں شہیدوں کے خون کا روغن تھا۔ یہ صدقہ جاریہ تھا اور اس نور مبین کا سرچشمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مکمل تھا اور خدا کا نور ”علیٰ نور“ تھا۔ اس نشاۃ الثانیہ کے نورانی سفر کی تیس منزلیں گزر گئیں۔ ایک نئی نسل جوان ہو کر سامنے آگئی۔ ہم ہر منزل پر اپنے جسموں پر سونے چاندی کے خول چڑھانے لگے رہے

اور نئی نسل رینگلر کی جینز پہن کر ڈونا سمر اور اینڈی گب کے پاپ میوزک کی تیز لے پر تھرکتی ہمارے سامنے آگئی۔ ہمارا مسئلہ یہ رہا کہ کوٹھی کار بینک بیلنس کہاں سے آئے۔ اور نئی نسل کا مسئلہ یہ تھا کہ ساٹھ میل کی رفتار پر سکوٹر لے کر لبرٹی میں کس لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر سو روپے کا چائنیز لنچ کھایا جائے ہم نئی نسل سے نفرت کرنے لگے۔ نئی نسل ہم سے نفرت کرنے لگی۔ ہم نے انہیں یہ سکھایا کہ انسان کی عزت کار، کوٹھی عہدے اور دولت سے ہوتی ہے۔ اقبال کی خودی کو ہم نے سونے کی ڈوری سے باندھ کر اپنی مرسیڈیز کار کے پچھلے شیشے پر لٹکا دیا۔ نئی نسل سوالیہ نشان بن کر کبھی کبھی ہماری طرف دیکھتی ہے اور پوچھتی ہے کہ ہم نے انہیں کیا دیا؟ پاکستان کیوں بنا تھا؟ لوگ شہید کیوں ہوئے تھے؟ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی کٹی ہوئی ریل گاڑیاں کیوں آتی تھیں؟ اور ہم نئی نسل کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ رکھ کر اسے لبرٹی کی طرف کڑاہی گوشت کھانے بھیج دیتے ہیں۔ ہم نے انہیں کبھی یہ نہیں کہا کہ واہگہ باڈر پر بی آر بی نہر کے کنارے بھی ایک لبرٹی ہے۔ فریڈم ہے آزادی وطن کے پُر نور مینار ہیں جہاں عزیز بھٹی شہید اور سوار محمد حسین شہید ہماری نشاۃ الثانیہ کی منزل کی تاریکیوں کو اپنے خون رنگ اجالوں سے منور کر رہے ہیں۔ ہماری یہ کوتاہی یہ چشم پوشی یہ تن آسانی ہمیں ہلاک کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن ہمارے اجداد کی قربانیاں اتنی عظیم ہیں کہ ہماری کشتی ہر طوفان سے صحیح و سلامت نکل آتی ہے۔ زہر اگر ہلاکت خیز ہے تو تریاق اس سے زیادہ زندگی بخش ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری نئی نسل بے راہ نہیں۔ بے ذوق نہیں وہ جاننا چاہتی ہے۔ سمجھنا چاہتی ہے۔ ہمارے قدم سے قدم ملا کر منزل نور کی طرف بڑھنا چاہتی ہے۔ وہ ہم سے سوال کرتی ہے کہ سر سید احمد خاں نے کتاب اسباب بغاوت ہند کیوں لکھی تھی۔ اور علامہ اقبال نے الہ آباد میں ایک الگ اسلامی مملکت کا تصور کیوں پیش کیا تھا۔ اور قائد اعظمؒ نے کیوں کہا تھا کہ ہم ایک علیحدہ اسلامی ملک چاہتے ہیں؟ ہم ان سوالوں کا جواب دینے کی بجائے نئی نسل کو اینڈی گب کے پاپ میوزک کی نئی کیسٹ دے کر لبرٹی کی طرف سکوٹر پر روانہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اب ہمیں ایسا نہیں کرنا ہوگا۔ ہمیں چمکیلی کاروں کے ریس کورس سے باہر نکل کر نئی نسل کا ہاتھ تھام کر اسے بتانا ہوگا کہ سر سید کون تھا۔ چودھری رحمت علی کون تھا۔ سید احمد شہید کیوں شہید ہوئے۔ گاندھی جی اور پٹیل نے کیوں کہا تھا کہ قائد اعظمؒ خریدے نہیں جا سکتے۔ علامہ اقبال کے الہ آباد والے خطبے کا متن کیا تھا۔ اور عزیز بھٹی شہید بی آر بی کے کنارے تیرہ دن بغیر کچھ کھائے پیئے کیوں اپنے مورچے

میں ڈٹا رہا اور سوار محمد حسین شہید وہ مشن کا عکس لئے برستی گولیوں میں کیوں نکل پڑا تھا اور مینار پاکستان چاندنی راتوں میں فضائے بسیط کی رفعتوں میں کن روشن ستاروں سے باتیں کرتا ہے! ہمیں انہیں بتانا ہوگا کہ لاہور شہر کے سبھی راستے میوزک کی دکانوں سپر مارکیٹوں اور پلازوں کی طرف نہیں جاتے۔ ایک راستہ علامہ اقبال کے مزار کو اور ۶۵ کی جنگ کے شہیدوں کی یادگاروں اور مینار پاکستان کو بھی جاتا ہے۔ یہ نئی نسل کا ہم پر قرض ہے۔ جو ہمیں ادا کرنا ہے۔ اگر ہم نے یہ قرض، یہ فرض، ادا نہ کیا تو پاکستان تو سلامت رہے گا، لیکن آنے والی نسلیں ہمارے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

میں پھولوں درختوں گرتے پتوں اور وطن پاک کی زرخیز صبحوں اور سنہری چائے کی خوشبوؤں کا فسانہ نگار ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے سارے پھول، سارے درخت اور درختوں سے گرتے پتے اور طلوع ہوتی صبحوں کے اجالے اور سنہری چائے کی خوشبوئیں پاکستان کی مٹی سے پیوستہ ہیں میرے باغوں میں پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ میں پاکستان میں ہوں۔ سنہری چائے میں مہک اس لئے ہے کہ اس میں وطن پاک کی بہادری کی خوشبو شامل ہے۔ میں فقیر ہو کر بھی یہاں بادشاہ ہوں۔ کیونکہ یہاں میری عزت نفس اور میری آنے والی نسل کا مستقبل محفوظ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس سرزمین کی ہواؤں میں مولوی حسن ایسے تحریک پاکستان کے لاکھوں شہیدوں کی مہک رچی ہے اور لاکھوں ماؤں بہنوں کی ناقابل فراموش قربانیوں کے سورج اس سرزمین کے ذرے ذرے میں جگمگا رہے ہیں۔ یہ ملک اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لیے شہیدوں کے خون رنگ شفق سے لازوال سورجوں کی روشنیاں لے کر طلوع ہوا ہے۔ یہ زندہ رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ ہمیں اپنے کردار دین کے بتائے ہوئے اصولوں کے سانچے میں ڈھال کر نئی نسل کے لئے ایک مثالی بننا ہوگا۔ اسی میں ہماری نئی نسل اور آنے والی نسل کی بقا ہے۔ پاکستان ایک طرز فکر ہے۔ ایک رویہ ہے ایک سفر ہے روحانی ارتقا کا دین مبین کے نور کا۔ اور نور کبھی ہائی جیک نہیں ہوا کرتا۔

الوداع مسجد کے منارو

گلی کے دروازے پر بم پھٹا تو ایک کہرام مچ گیا۔ کوئی دروازہ میاں سنگھ کی طرف، کوئی لال حویلی کی طرف اور کوئی انہی گوجروالی گلی کی طرف۔ جدھر جس کا منہ اٹھا دوڑ پڑا۔ لوگوں نے اپنا اپنا سامان باندھ کر رکھا تھا کہ مسلم لیگ کے ٹرک آئیں گے تو اس میں لاد کر شریف پورہ کیمپ پہنچ جائیں گے۔ ٹرک آنے سے پہلے ہندو فوج آگئی۔ اور انہوں نے بم مار کر گلی کا آہنی دروازہ اڑا دیا۔ ہماری گلی میں دوسرے محلوں کے مسلمانوں نے بھی آکر پناہ لے رکھی تھی۔ ان میں عورتیں بچے بوڑھے جوان تھے۔ بم کا دھماکہ ہوا تو ہر کوئی سامان وہیں چھوڑ کر دوسری طرف کو بھاگا۔ گلی کی دوسری طرف سے دو تین راستے باہر جی ٹی روڈ کی طرف جاتے تھے جی ٹی روڈ سے آگے ہاکی گراؤنڈ تھی اور سامنے شریف پورہ تھا۔ شریف پورے کے باہر بلوچ رجمنٹ کے جوان کیمپ کے مسلمانوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ گلی میں بھگدڑ مچی تو مسلمان بھاگ کر جی ٹی روڈ پر آگئے۔ ایک طرف سے سکھ اور دوسری طرف سے ہندو فوج فائرنگ کر رہی تھی۔ کئی عورتیں، بچے اور جوان شہید ہو کر گرے۔ کوئی خانقاہ کی لائبریری کے باہر اور کوئی بڑ درد میں اور کوئی تاروں والے باغ میں۔ امرتسر کے مسلمان شریف پورے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ شاید کسی نے بھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ ایک دن ایسا بھی آ سکتا ہے کہ وہ آگے آگے ہوں گے اور پیچھے ہندو سکھ ان پر گولیاں برسا رہے ہوں گے۔ شاید ہندو سکھوں نے ایسا سوچ رکھا تھا۔ کاش مسلمان بھی کچھ سوچتے، کچھ فکر کرتے، کچھ آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھنے کی کوشش کرتے۔

جب یہ پریشان حال عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے شریف پورے کے قریب پہنچے تو بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے انہیں مشین گنوں کا تحفظ دیا۔ یہاں تک جو مسلمان اپنی جانیں بچا کر

آ گئے تھے وہ شریف پورے پہنچ گئے۔ شریف پورہ میں امرتسر شہر کے مشرقی حصے کے ہزاروں مسلمان جمع تھے۔ دکانداروں نے سارا مال باہر لاکر رکھ دیا تھا اور اونے پونے بیچ رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اب وہ وہاں سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنے والے ہیں۔ پتہ نہیں زندگی میں انسان کیوں ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔ بلیک مارکیٹ کرتا ہے۔ چیزوں کو مہنگے سے مہنگے داموں میں فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ ایک دن یہاں سے بھی اسے کوچ کر جانا ہے۔ زندگی کا شریف پورہ بھی اسے کوچ کر جاتا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔!

پیچھے ہماری گلی کے مکانوں کو لوٹ کر ہندو سکھوں نے آگ لگا دی۔ دیکھتے دیکھتے جی ٹی روڈ پار کے ہماری گلی کے مکانوں سے دھواں اٹھنے لگا۔ دھواں، آگ اور لاشیں۔ یہ ان دنوں کے معمولات میں تھا ایک عجیب نامانوس سی جلی ہوئی بو تھی جس نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا نہ مکانوں سے اٹھتے شعلے دیکھ کر کسی کو حیرت ہوتی تھی اور نہ سڑک پر پڑی ہوئی لاش دیکھ کر کوئی رکتا تھا۔ شہر کے درختوں پر سے چڑیاں، بلبلیں اور فاختائیں غائب ہو گئی تھیں۔ سارا سارا دن گدھیں منڈلایا کرتی تھیں اب امرتسر سارے کا سارا خالی ہو چکا تھا۔ شریف پورے کی دوسری جانب ریلوے لائن گزرتی تھی۔ اس لائن پر مال گاڑی کے چند ایک خالی ڈبے آ کر لگتے اور مسلمان مہاجرین سے دیکھتے دیکھتے بھر جاتے بلکہ ابل پڑتے اور پھر ہولے ہولے رینگتے ہوئے امرتسر ریلوے سٹیشن سے نکل کر لاہور کی جانب روانہ ہو جاتے ابھی پاکستان پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ راستے میں امرتسر اسٹیشن تھا جہاں سکھ تلواریں لئے گھوم رہے تھے۔ آگے چھہرٹہ کا سٹیشن تھا جہاں سکھوں کا بہت بڑا گوردوارہ تھا اور جہاں کے نہنگ اور اکالی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ گاڑیاں کٹ بھی رہی تھیں۔ لاشیں ریلوے لائنوں پر بکھر بھی رہی تھیں اور پاکستان کی منزل کا سفر بھی جاری تھا۔

شریف پورے کے جنوب میں تحصیل پورے کی آبادی تھی۔ یہاں سے ایک کچا راستہ لوکاٹ کے باغ میں سے ہو کر اوپر ریلوے لائن پر چلا جاتا تھا۔ میں نے اس کچے راستے کا ذکر اپنے امرتسر کے بارے میں لکھے گئے افسانوں میں خاص طور پر کیا ہے اس راستے پر کھٹے کے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا اور مارچ اپریل میں جب ان درختوں پر سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ خوشبو کی سرنگ بن جاتا تھا۔ منہ اندھیرے سیر کو جاتے ہوئے میں خوشبو کی اس سرنگ میں سے بہت آہستہ آہستہ

گزرا کرتا۔ یہاں کھٹے کے پھولوں کی اس قدر خوشبو ہوتی کہ سانس اندر کھینچنے کے بعد باہر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سانس کے ساتھ جسم کے رگ و پے میں خوشبو کا ایک چکر بند ہو جاتا تھا۔ سانس اور خوشبو کا فرق مٹ جاتا۔ کچھ پتہ نہ چلتا کہ سانس کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور خوشبو کہاں ختم ہو رہی ہے۔ ان دنوں میں سوچا کرتا تھا کہ جنت کو جانے والا راستہ بھی شاید اسی طرح کا ہو گا۔ منہ اندھیرے کے نور میں درختوں کی شاخوں پر سفید پھول نسیم صبح کے جھونکوں کے ساتھ گرا کرتے اور جب میں سیر سے واپس آتا تو یہ کچا راستہ سفید پھولوں سے بھرا ہوتا جیسے درختوں نے عبادت کرنے کے لئے سفید پاکیزہ چادر بچھا رکھی ہو۔ مجھے یاد ہے اس راستے پر پاؤں لے کر نہیں جاتا تھا اور باغ میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ آج یہ راستہ ویران تھا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کھٹے کے درختوں پر کوئی پھول نہیں تھا خوشبو کی سرنگ میں سوختہ مکانوں اور جلی ہوئی لاشوں کی بو تھی۔

شریف پورہ خالی ہو رہا تھا مسلمان ٹرینوں میں بھر بھر کر پاکستان کی طرف کوچ کر رہے تھے راستے میں ان پر حملے بھی ہو رہے تھے مگر پاکستان کی طرف مہاجرین کا سفر جاری تھا۔ شریف پورے کے سامنے لائن پار امرودوں کے بڑے وسیع اور ہرے بھرے باغ تھے۔ بڑے میٹھے اور گورے امرود لگا کرتے تھے ان درختوں پر اور بڑے ظالم رکھے ان درختوں کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ اب یہ باغ بھی ویران تھے۔ امرود پک پک کر درختوں سے گر رہے تھے جگہ جگہ امرودوں کے ڈھیر لگے تھے کوئی رکھا نہیں تھا، کوئی مالک نہیں تھا کوئی نوکر نہیں تھا۔ امرودوں کے ڈھیر تھے جو گل سڑ رہے تھے مگر پھر بھی ان میں سے ہلکی ہلکی خوشبو نکل رہی تھی۔ پھل مر کر بھی خوشبو دیتا ہے اور انسان زندگی میں بھی کوئی خوشبو دیتا ہے انسان کے اندر کا امرود شاید مر گیا ہے۔

آخر ہم بھی ایک مال گاڑی میں بیٹھ کر شریف پورے سے، امرتسر سے، کمپنی باغ اور مسجد خیرالدین کے امرتسر سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ امرتسر ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر چار پر آ کر گاڑی رک گئی ایک دہشت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان سٹیشن کی چھت پر لیٹے سیتلا مندر کی طرف سے آنے والی ہندوؤں کی فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ جب تک گاڑی امرتسر کے سٹیشن پر کھڑی رہی لوگوں کا دم خشک رہا۔ خدا خدا کر کے ٹرین نے ہولے ہولے کھسکنا شروع کیا۔ ریلوے یارڈ گزرا، اکو برج گزر گیا۔ امرتسر شہر پر نگاہ ڈالی۔ ایک غبار سا دکھائی دیا۔

خاک آلود، ویران ویران، جس میں آگ اور موت کی دہشت تھی۔ جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ چہ ہرٹہ ریلوے سٹیشن پر پھر گاڑی کھڑی ہو گئی۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان ڈبوں سے اتر کر پہرہ دینے لگے۔ سکھ دور کھڑے نعرے لگا رہے تھے اور تلواریں لہرا رہے تھے مگر کسی کو آگے آنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑی آگے روانہ ہوئی۔ خاصہ سٹیشن بھی گزر گیا پھر گوسہ ستلانی بھی گزر گیا۔ ارد گرد مسلمانوں کے بڑے گاؤں ہوا کرتے تھے۔ یہ ویران پڑے تھے۔ اور مسجدوں کے سفید مینار خاموش تھے سنسان تھے۔ دل گرفتہ تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب ان میناروں سے کبھی اذان کی صدا بلند نہ ہو گی، پھر اٹاری بھی گزر گیا اور گاڑی واہگہ پہنچ گئی:

یہاں پہلی بار ایک درخت کے ساتھ لہراتا ہوا پاکستانی سبز پرچم دیکھ کر چہرے کھل گئے۔ مسلمانوں نے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ منزل پہ پہنچ کر راستے کی ساری مصیبتیں، تکلیفیں اور اذیتیں بھول گئیں۔ ٹرین اب پاکستان کی آزاد اور خوبصورت فضاؤں میں سفر کر رہی تھی دور مغلپورہ ورکشاپ کی بلند چمنی نظر آئی۔ مغلپورہ پر ٹرین رکی تو مسلمان روٹیاں، پانی اور اچار لے کر ٹرین کی طرف دوڑے۔ زخمیوں کو اتار کر ان کی مرہم پٹی کی گئی۔

لاہور ریلوے سٹیشن پر ہر طرف ہجوم ہی ہجوم تھا۔ ٹرین رکی تو مسلم لیگ کے رضاکار پانی، روٹیاں اور اچار لے کر تقسیم کرنے لگے۔ وہ ہر ایک سے پوچھ رہے تھے کہ کون والٹن کیمپ جائیں گے اور کون لاہور اپنے رشتہ داروں کے ہاں جانا پسند کریں گے۔ سٹیشن سے باہر چھ سات مہاجر کیمپ لگے تھے جہاں سے مہاجرین کو بسوں اور ٹرکوں میں بٹھا کر والٹن یا ان کے رشتہ دار کے ہاں پہنچایا جا رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن کی عمارت میں بار بار پاکستان زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے فیروز پور سے مسلمانوں کی کٹی ہوئی گاڑیاں بھی آ رہی تھیں لیکن ہر مہاجر کے سینے میں ایک نئے عزم ایک نئے ولولے کی شمع بھی روشن تھی، نیا وطن اور در و دیوار سامنے تھے اس نئے وطن کے آنگن کو پھولوں سے سجانا تھا۔ ہر گھر میں نئی آرزوؤں کی نئی شمع روشن کرنی تھی جسم گرد آلود تھے، پاؤں میں آبلے تھے، زخموں سے خون بہہ رہا تھا مگر دل میں ایک ولولہ تازہ تھا، تعمیر وطن تھا، اک احساسِ عظیم تھا تحفظ عزت و آبرو کا۔

امرتسر کی آخری جھلک

امرتسر میں ایک دروازہ مہان سنگھ تھا۔ اسی دروازے سے ایک چھوٹی سڑک تحصیل پورے کو جاتی تھی اس سڑک پر ٹاہلیوں کی گھنی چھاؤں تھی اس کی ایک جانب آرٹ سکول تھا جہاں میں دوسری سے چوتھی جماعت تک پڑھا تھا۔ دوسری جانب متعدی امراض کا چھوٹا سا ڈسپنسری ٹائپ کا میونسپل ہسپتال تھا ٹاہلیوں میں گھری ہوئی یہ چھوٹی سی پکی سڑک آگے جی ٹی روڈ کو کراس کرتی ہوئی تحصیل پورے کے مختصر سے میدان میں اتر جاتی تھی اس میدان میں ایک جانب کچا کوٹھا تھا جس کی چار دیواری کے اندر نسواری رنگ کے بڑے بیروں والا ایک گھنا درخت تھا ہم اس درخت پر پتھر مار کر بیر جھاڑتے تو اندر سے ایک بوڑھی عورت سوٹا لے کر ہمیں مارنے نکلا کرتی تھی اس کے بالمقابل تحصیل کا دفتر تھا جو کسی پرانے قلعے کی یاد دلاتا تھا۔ یہاں سے آگے تحصیل پورے کی آبادی کا جنوبی کنارہ شروع ہو جاتا تحصیل پورہ اصل میں شریف پورے کا ایک حصہ تھا۔ یہ ساری آبادی امرتسری مسلمانوں پر مشتمل تھا مگر تحصیل پورے کا ایک حصہ تھا۔ یہ ساری آبادی امرتسری مسلمانوں پر مشتمل تھی مگر تحصیل پورے کی جنوبی پٹی میں کچھ ہندو اور سکھ آباد تھے۔ ان کی دو تین گلیاں ہی تھیں۔ ایک چھتا ہوا کنواں بھی تھا میں صبح صبح چالیس کھوہ اور ریلوے لائین کی طرف سیر کرنے کو جاتا تو اس کنوئیں پر ہندو اور سکھ نہا رہے ہوتے تھے۔ دوسری طرف ہندو سکھ عورتیں کانسی کے گھڑوں میں پانی بھر رہی ہوتیں جہاں تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتی وہاں سے لوکاٹ اور آلوچے کے باغ شروع ہو جاتے۔ ان باغوں کے درمیان سے ایک کچی پگ ڈنڈی ریلوے لائین تک جاتی تھی۔ اس پگ ڈنڈی کی دونوں جانب گھنے درخت تھے جو اوپر جا کر آپس میں مل گئے تھے بہار کے دنوں میں ان پر سفید کلیاں کھلتیں تو سارا راستہ خوشبو سے مہک جاتا تھا۔ اسی تحصیل پورے میں میرا ایک دوست رہتا تھا اس کا نام

دراز قد آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک پیچھے کو گرے ہوئے سیدھے بال ہم دونوں کبھی کبھی کمپنی باغ سیر کرنے جاتے تو وہ مجھے اپنی اردو کی نظمیں سنایا کرتا تھا میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اس کی نظموں میں عربی فارسی کے بے شمار لفظ ہوتے تھے وہ مجھے ان الفاظ کے معنی بھی سمجھایا کرتا اس نے عربی فارسی کلچر کے حوالے سے اسلامی رنگ غالب تھا۔ مسلمانوں کے کھانے شوق سے کھاتا اور لباس بھی ہندوانہ نہیں پہنتا تھا۔ پتلون قمیض اور شلوار قمیض اسے بہت پسند تھی اب مجھے اس کی باتیں یاد آ رہی ہیں وہ سگریٹ بہت پیتا تھا مجھے یاد ہے ایک روز شام کے وقت ہم کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والے پلاٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ ویدک عہد پر باتیں کر رہا تھا کہنے لگا۔

"آریہ ہندو نہیں تھے۔ یہ ہندو تو ہری دور کے بعد کی پیداوار ہیں میں بھی ہندو ہوں کیونکہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں مگر مجھ میں وہ تنگ نظری اور تعصب نہیں۔ جو تم ہر ہندو میں پاؤ گے۔ ہندو دہریہ بھی ہو جائے تب بھی ہندو ہی رہے گا میرے پتا جی کہتے ہیں رام مورتی! مسلمانوں کے ساتھ مت بیٹھا کرو مگر میں کہتا ہوں کہ ہندوؤں میں میرا دم گھٹتا ہے تم مسلمان ہو تمہارا کلچر ہندوؤں سے اتنا مختلف ہے کہ تم لوگ ان کے ساتھ ایک جگہ دو دن بھی نہیں گزار سکتے اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو میں تمہیں ایک نظم سناتا ہوں۔"

جب امرتسر میں تحریک پاکستان کا آغاز ہوا اور جلوس نکلنے لگے تو ایک روز رام مورتی طائر نے کہا۔

"یہ ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا تم دیکھتے نہیں ہمارے امرتسر میں کتنے پاکستان بنے ہوئے ہیں۔ شریف پورہ بھی ایک پاکستان ہے جہاں کے امرتسری مسلمان اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں چوک فرید بھی ایک پاکستان ہے اسی طرح کڑہ کرم سنگھ کا ایک حصہ بھی ایک پاکستان ہے۔ یہ حصہ ہندوؤں اور سکھوں سے الگ تھلگ ہے پاکستان اس ملک کے سیاسی اور تہذیبی ارتقاء کا ایک قدرتی نتیجہ ہے تم دیکھ لینا پاکستان بن جائے گا۔"

پھر امرتسر میں تحریک پاکستان کا عمل تیزی سے تیز تر ہوتا گیا قائد اعظمؒ کی مخلصانہ اور بے لوث قیادت میں مسلمان اپنی جدوجہد آزادی میں کامیاب ہو گئے اور قیام پاکستان کا اعلان کر دیا گیا مجھے یاد ہے جس رات آل انڈیا ریڈیو سے قائد اعظم نے تشکیل پاکستان کے اعلان کے بارے میں تقریر کی میں پٹھان کوٹ

میں تھا۔ وہاں میں اصفہانی چائے کمپنی میں سیلزمین کی حیثیت سے ملازم تھا ایک چائے خانے کے ریڈیو پر میں نے قائد اعظم کی تقریر سنی۔ پٹھان کوٹ کے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا پاکستان زندہ باد قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے جلوس گزرتے مجھے پٹھان کوٹ کی سڑکوں کے نام یاد نہیں رہے میں زیادہ دیر وہاں رہا ہی نہیں۔ ایک نشیبی آبادی تھی جہاں مکانوں کے آنگن تھے اور ان میں سفیدے اور چیڑ کے درخت ہوا میں جھوما کرتے تھے۔ پیچھے دور ڈلہوزی کی پہاڑیوں کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی تھی مجھے سیاسی شعور بھی نہیں تھا۔ اسی لئے میں جلسے جلوسوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا تھا رام مورتی طائر کہتا تھا کہ پاکستان بن کر رہے گا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام پیر جی بھی یہی کہتے تھے کہ پاکستان مذہب بنے گا جہاں مسلمان دینی آزادی کے اسلامی ماحول میں زندگی بسر کریں گے۔ مجھے یاد ہے ایک بار رام مورتی طائر نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا تم کبھی جھنگ اور پنجاب کے دیہاتوں میں گئے ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں تو وہ بولا۔ "پھر تمہیں کیا پتہ کہ جب پاکستان بن جائے گا تو ہندو ساہوکار کی زنجیریں کسی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔" پھر وہ سگریٹ کا کش لگا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی مارچ ۱۹۴۷ء کی دوسری یا تیسری تاریخ تھی کہ امرتسر شہر میں پہلا کرفیو لگا دیا گیا امرتسر ہمارا اپنا شہر تھا کرفیو کے دوران تو ہم گلی میں بند رہتے۔ جونہی کرفیو کھلتا ہم ہندو سکھوں کے محلوں میں بھی آوارہ گردی کرنے نکل جاتے ایک روز میں تحصیل پورے کی طرف گیا تو دیکھا کہ اس آبادی میں جو چند ایک سکھوں کے گھر تھے وہ خالی ہو چکے تھے رام مورتی طائر کا مکان بھی لٹ لٹا کر خالی پڑا تھا۔ فسادات کی آگ تشدد اختیار کرتی چلی گئی ہمارے اپنے محلے میں جو چند ایک ہندو سکھوں کے مکان تھے وہ بھی خالی ہو گئے ہندو سکھ شہر کے اندر غیر مسلم محلوں میں چلے گئے کبھی کبھی کرفیو کھلتا تو کوئی نہ کوئی ہندو یا سکھ پولیس کی معیت میں اپنا مکان دیکھنے یا وہاں سے کوئی شے اٹھانے ضرور آتا مگر رام مورتی طائر نہ آیا۔

اسی طرح وقت گزرتا چلا گیا امرتسر میں چاروں طرف آگ لگی تھی شہر ہندو اور مسلم آبادی میں بٹ کر رہ گیا تھا دیہات اور پنجاب کے دوسرے شہر سے مسلم مہاجرین کے قافلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ ایک الگ انتہائی درد و داستان ہے بہر حال اتفاق سے گیارہ اگست کو میں ہوڑہ ایکسپریس میں بیٹھ کر امرتسر

سے لاہور گیا امرتسر کے درمیان ریل گاڑیاں ابھی تک چل رہی تھیں کشیدگی اگرچہ بہت زیادہ تھی مگر امرتسر کی مسلمانوں کی جرأت دلیری اور جانبازی ہندوؤں کو ان کے محلوں کی طرف ایک انچ بھی بڑھنے نہیں دے رہی تھی۔ یہ اسی بے خوفی کا ثبوت تھا کہ میں گیارہ اگست کو ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

چھہرٹا سٹیشن پر ہندو سکھ ہر بنگلے کے باہر کھڑے تلواریں لہرا لہرا کر پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ لاہور پہنچا تو یہاں جو ہمارے رشتے دار تھے وہ مجھ پر برس پڑے کہ تم کیا سوچ کر امرتسر میں بیٹھے ہوئے ہو؟ کیا تم سب کا وہاں مرنے کا ارادہ ہے؟ فوراً واپس جاؤ اور ان سب کو لے کر لاہور آ جاؤ۔ میں نے دوسرے دن صبح آٹھ بج کر چالیس منٹ والی گاڑی پکڑی اور واپس امرتسر پہنچ گیا ریلوے سٹیشن پر مسلمان عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم دیکھا جو پلیٹ فارموں پر پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ شہر میں ساڑھے دس بجے سے کرفیو لگنے والا ہے اس وقت دس بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے مجھے ریلوے سٹیشن پر شیخ قیوم مل گیا اس کا مکان ہال بازار کے پہلو میں ایک گلی میں واقع تھا اس نے کہا ابھی کرفیو لگنے میں پانچ منٹ ہیں چلو نکل چلتے ہیں ہمارے محلے کے پوری نے کہا خبردار سٹیشن سے باہر نکلو گے تو ہندو جاٹ رجمنٹ کے فوجی پھر رہے ہیں وہ دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ مگر نوجوانی کا خون تھا۔ ہم نے کوئی پروا نہ کی اور ریلوے یارڈ کی گول باغ والی دیوار پھاند کر سڑک پر آ گئے پانچ منٹ پہلے ہی بازار سنسان ہو گئے تھے ایک جگہ ہندو فوجی گشت کرتے نظر آئے ہم نے کوئی پروا نہ کی اور سکندری گیٹ کی طرف چلنے لگے ایک مکان کی کھڑکی میں سے ایک شخص نے سر باہر نکال کر اوپر سے کہا۔

"اوئے منڈیو! مرنا ہے؟ کرفیو لگن والا اے اندر آ جاؤ"

ہم نے دوڑنا شروع کر دیا شیخ قیوم کا مکان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا ہم دوڑتے دوڑتے اس کی گلی میں داخل ہو گئے اس کے ساتھ ہی کرفیو کا بھونپو چیخ اٹھا۔ شیخ قیوم کا مکان تین منزلہ تھا اور کافی کشادہ تھا وہاں جا کر دیکھا کہ عورتوں بچوں اور مردوں سے بھرا پڑا ہے پیچھے جو ہندو آبادی تھی وہاں سے مسلمان اپنی جانیں بچا کر اس مکان میں آ گئے تھے ان میں نورانی چہرے والے ایک سرخ و سپید آدمی بھی تھے جن کے سر پر ترکی ٹوپی تھی وہ سخت خوف زدہ تھے اور بار بار شیخ قیوم سے کہتے۔

"قیوم پتر مجھے کسی طرح سٹیشن پر پہنچا دے"

کرفیو کے لگتے ہی پیچھے جو ہندوؤں کے محلے تھے ادھر سے فائرنگ شروع ہو گئی شام تک یہ فائرنگ ہوتی رہی ہمارا محلہ وہاں سے قریب ہی تھا۔ میں اور قیوم چھوٹی سی شہ نشین میں دری پر بیٹھ گئے دوپہر کو دال روٹی کھائی رات کے نو بجے ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے کہ ایک دم بجلی چلی گئی مکان میں عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کر دیا مرد انہیں حوصلہ دینے لگے ہم نے کوٹھے پر جا کر دیکھا سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں ہمارے محلے کی جانب کسی مکان میں آگ لگی ہوئی تھی جس کے شعلے اوپر اٹھ رہے تھے۔ شیخ قیوم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"حمید! میرا خیال ہے گلی انگریزاں کا کوئی مکان جل رہا ہے۔ باغ رامانند کے ہندوؤں نے یہاں آگ لگائی ہو گی"

مجھے اپنے گھر والوں کی فکر پڑ گئی۔ مگر وہاں تو ہر کوئی پریشان تھا خدا کر کے رات گزری گلی باغ اور بازار کیروتاں کے سارے مسلمان گھرانے گھر بار چھوڑ کر تھوڑا بہت سامان سروں پر اٹھا ہماری گلی میں آ گئے تھے گلی میں گزرنے کو جگہ نہیں تھی میں لوگوں کے ٹرنکوں اور بستروں کے اوپر سے گزرتا اپنے گھر پہنچا انہیں کہا کہ جس طرح ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔ کوئی بھی امرتسر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ صرف والدہ لڑکیوں کو لے کر چلنے پر تیار ہو گئیں ایک بھائی انہیں لے کر ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا ہم باقی بھائی والد صاحب اور دوسرے رشتے داروں کے ساتھ مکان پر ہی رہے ان سب کا ابھی تک یہی خیال تھا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں گلی میں اپنے محلے کے دوستوں کے پاس آ گیا ابھی تک ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں مردی لاٹھیاں بلمیں لئے پھر رہے تھے گلی کے دروازے پر لوہے کا جنگلا چڑھا ہوا تھا جو اندر سے بند تھا وہاں محلے کا جاناں بدمعاش بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا کرفیو کھلے بمشکل ایک گھنٹہ ہوا ہو گا کہ شہر میں مار دھاڑ شروع ہو گئی اس کے فوراً بعد دوبارہ کرفیو لگا دیا گیا ساتھ والے محلوں سے چھتوں پر کچھ مسلمانوں کی لاشیں گلی میں آئیں تو وہاں کہرام مچ گیا۔ گلی انگریزاں اور بازار کیروتاں کے مسلمانی علاقے میں باغ رامانند کے ہندوؤں کا قبضہ ہو چکا تھا انہوں نے مکان کو لوٹ کر آگ لگا دی

تھی۔ گلی انگریزوں کی مسجد میں کئی مسلمان شہید ہو گئے۔

امرتسر کی وہ رات بڑی خوفناک رات تھی ساری رات تھری ناٹ تھری کی گولیوں کے دھماکے ہوتے رہے ان میں بم پھٹنے کے دھماکے بھی شامل تھے اسی رات ہماری مسجد کے پیر جی کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے روز ۲ اگست کا دن تھا صبح ہوئی کرفیو نہ کھلا مگر ہندو سکھوں نے ہندو سکھ فوج کو ساتھ لے کر ہماری گلی پر بازار والے دروازے کی طرف سے حملہ کر دیا۔ گلی میں بھگدڑ مچ گئی فوج کا مقابلہ نیم نہتے مسلمان کہاں کر سکتے تھے لوگ اپنا اسباب وہیں پھینک گلی کی دوسری جانب لال حویلی اور گجروں کے ویڑھے کی طرف بھاگے ہندو فوج نے ہینڈ گرنیڈ مار کر گلی کا دروازہ اڑا دیا اتنی دیر میں مسلمان گلی سے بھاگ کر لال حویلی اور گوجروں کے ویڑھے سے ہوتے ہوئے باہر جی ٹی روڈ کے بدرو پر پہنچ چکے تھے ادھر بھی ہندو فوج گشت لگا رہی تھی اس نے بھاگتے مسلمانوں پر فائرنگ شروع کر دی موسیٰ اپنے شیر خوار بچے کو گود میں اٹھائے شریف پورے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ گولی لگنے سے وہیں شہید ہو گیا۔ بہت سے مسلمان بچے عورتیں اور مرد شہید ہو کر گرے باقی پاتھی گراؤنڈ والی سڑک پار کر کے شریف پورے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ شریف پورے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ شریف پورے کو مسلم مہاجرین کیمپ قرار دیدیا گیا تھا۔ وہاں بلوچ رجمنٹ مسلمان مہاجرین کی حفاظت پر مامور تھی بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے فائرنگ کا کور دیا اور سینکڑوں مسلمان عورتیں اور مرد ہندو فائرنگ سے بچ گئے بلوچ رجمنٹ کی فائرنگ سے ہندو فوجی پاتھی گراؤنڈ سے بھاگ گئے تھے۔

شریف پورے نے باقاعدہ مہاجر کیمپ کی شکل اختیار کر لی تھی شریف پورے میں جو مسلمان آباد تھے انہوں نے اپنے مسلمان مہاجر بھائیوں کے لیئے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے تھے لاہور سے مسلم لیگ کے ٹرک آنا شروع ہو گئے جی ٹی روڈ کی جانب سے مسلم لیگ کے ٹرکوں کے ذریعے اور ریلوے لائین کی طرف سے خالی مال گاڑیوں کے ذریعے شریف پورے سے مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہو گئی۔ کیمپ کو سیکٹروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور بلوچ رجمنٹ کے جوان اپنی نگرانی میں یہی بلوچ رجمنٹ کے مسلح جوان موجود ہوتے تھے ہماری باری تین چار روز کے بعد آنے والی تھی ایک روز میں پھرتے پھراتے تحصیل پورے والی آبادی کی طرف نکل گیا

وہاں سے لوگ ایک مکان کے باہر جمع تھے میں بھی تماشہ دیکھنے وہاں پہنچ گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے دو جوان موجود تھے۔ دو سکھ فوجی بھی تھے ایک تانگہ گلی کے باہر تحصیل کی عمارت کے پاس کھڑا تھا یہ لوگ رام موہن طائر کے مکان کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے رام موہن طائر کے پتا کو دیکھا کہ سکھ فوجی اور پولیس والوں کے ساتھ اپنے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ اچانک تانگے کے پائیدان کے پاس مجھے رام موہن طائر نظر آ گیا۔ وہ تحصیل کی قلعہ نما عمارت کی طرف منہ کیئے سگریٹ پی رہا تھا میری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے دیکھا وہ کچھ دبلا ہو گیا تھا۔ ایک سیکنڈ میری طرف ساکت کھڑا دیکھتا رہا پھر مسکرایا اور مجھے گلے لگا لیا میں نے پوچھا کہ وہ اپنے خالی مکان پر کیا کرنے آیا ہے؟ اس نے ہنس کر کہا۔

"میرے پتا جی مکان کی پر چھتی میں رکھی ہوئی کرشن کی مورتی نکالنے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہ ابھی تک مکان میں ہی ہو گی؟"

رام موہن طائر نے سگریٹ کا کش لگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"مسلمان بت شکن ہے اسے مورتی سے کیا سروکار؟ ظاہر ہے مکان میں ہی کسی جگہ پڑی ہو گی۔"

پھر رام موہن طائر کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور کہنے لگا۔ "میرے پتا جی کٹر ہندو ہیں تم ہندوؤں کو پوری طرح نہیں جانتے میں جانتا ہوں وہ جو مورتی لینے آئے ہیں اس کے اندر لالہ جی یعنی میرے پتا جی کے قیمتی جواہرات بھرے ہوئے ہیں میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم یہ راز بلوچ رجمنٹ کو بتا دو مگر اس سے کیا فرق پڑے گا ہندو تو لاہور کے مکانوں سے کروڑوں روپے کے خزانے ساتھ ہی لے کر یہاں آ گئے تھے تم لوگوں کو تو لاہور میں جلی ہوئی شاہ عالمی ملے گی۔"

پھر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"لیکن پاکستان کی زمین خزانوں سے بھری ہوئی ہے جسے اب ہندو لالہ کبھی نہیں لوٹ سکے گا۔ دیکھو میں ہندو ہو کر تمہیں ایسی باتیں بتا رہا ہوں مگر میں ہندو نہیں ہوں تم کو پاکستان مبارک ہو میری ایک بات یاد رکھنا پاکستان کی حفاظت کرنا یک جان اور متحد ہو کر رہنا نہیں تو ہندو بنئے کی سیاست تمہیں ہڑپ کر جائے وہ ڈسنے لگا۔"

"یار...... تم ہندو کو نہیں جانتے یہ برہمن ہے اگر یہ نہیں ہے دو سگریٹ پیو۔"

رام مورتی طائر کا باپ مکان سے مورتی نکال کر لایا تو مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مورتی کو توڑا جائے لوگوں کو شک پڑ گیا تھا صورتحال ایسی ہو گئی کہ مورتی کو تھوڑی سے توڑنا پڑا اندر مرجان اور زمرد ہی زمرد بھرے ہوئے تھے ان جواہرات کو بلوچ رجمنٹ نے اپنی تحویل میں لے لیا اور بعد میں مسلم لیگ کے حوالے کر دیا۔

آخر ایک روز ہماری بھی باری آگئی ہم تمام گھر والے ایک ٹرک میں سوار ہو گئے دوپہر کا وقت تھا آسمان پر دھواں سا پھیلا ہوا تھا مسلم لیگ کے ٹرک آہستہ آہستہ جی ٹی روڈ پر لاہور کی طرف سرکنے لگے میں ٹرک میں جھٹکے کے ساتھ لگ کر کھڑا باہر تک رہا تھا امرتسر مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا تھا مسلم ہائی سکول گزر گیا اور بھائیوں والی نہر کا ریلوے پھاٹک نظر آیا اس نہر میں ہم چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ ٹرک ریل کے پل کی چڑھائی پر مڑ رہے تھے پل کے اوپر جا کر سٹیشن کی طرف مڑنے تو مجھے روز کمپنی باغ کا کرسٹل ہوٹل والا دروازہ نظر آتا درخت جیسے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہے تھے یہ درخت میرے بڑے پرانے دوست تھے کمپنی باغ بھی گزر گیا ٹرک چتی گھر کے قریب سے نکل گئے چھ ہرٹہ بھی گزر گیا کھیتوں میں ویرانی برس رہی تھی کئی جگہوں پر جھاڑیوں میں انسانی لاشیں اوندھی پڑی تھیں پھر یہ سب کچھ گزر گیا امرتسر گزر گیا اور دور باڈر پر ایک درخت میں پاکستان کا پرچم لہراتا نظر آیا پژمردہ چہروں پر زندگی کا تروتازہ خون دوڑنے لگا فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی ہم پاکستان کی پیاری اور اپنی سرزمین میں داخل ہو گئے اس وقت مجھے رام مورتی طائر کا فقرہ یاد آگیا۔

"پاکستان کی زمین خزانوں سے بھری ہوئی ہے جیسے اب ہندو لالہ کبھی نہیں لوٹ سکے گا پاکستان کی حفاظت کرنا یک جان اور متحد رہنا۔

اس واقعے کو کتنا عرصہ گزر گیا ہو گا؟ آپ سب جانتے ہیں اور اس وقت میں اپنے ماضی کو یاد کر کے کیا سوچ رہا ہوں؟ یہ بھی آپ سب جانتے ہوں گے۔ خدارا پاکستان کی حفاظت کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔ اختلافات ختم کر دیں کیونکہ ہمارا سب کچھ پاکستان ہی ہے۔

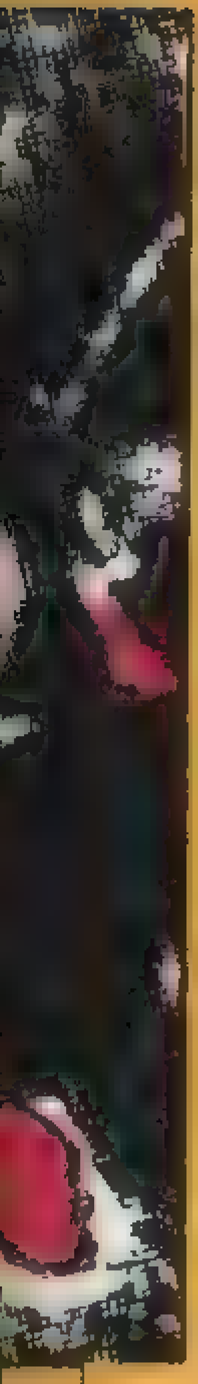

"اُمرتسر کی مسجدوں پر پیارا مضمون لکھنے والے، اے حمید کو میرا سلام پہنچے۔ کیتنی
پیاری تصویر کھینچی ہے، آپ نے اُمرتسر کی معاشرت کی کس قدر آباد کھیں،
قرطبہ کی بیٹیاں کتنے اچھے تھے اِمام صاحب اور ان کے بیٹے ـــــ قرطبہ
کے حوالے سے تاریخ کے دریچے کھول دیئے، جن سے اس ملک کے مستقبل
پر دُھندلی دُھندلی روشنی ـــــ ذرّے کچھ چمکتے، کچھ بُجھتے نظر آتے۔
اشاریت نے چودہ طبق روشن کر دیے ـــــ پرانا اے حمید پھر جاگ اُٹھا ہے
کاش ایسی شاہکار تحریریں دو تین اور لکھ ڈالے۔"

(ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے ایک خط سے)

اے حمید۔ پھولوں، تتلیوں اور خوشبوؤں کے تعاقب میں ہم سے دور جاتا مصنف

راشد اشرف۔ ۹ اپریل ۲۰۱۱

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان جب کسی اسپتال کے آئی سی یو میں وینٹیلیٹر کے سہارے سانس لے رہا ہوتا ہے تو بے ہوشی کے عالم میں وہ کیسے کیسے منظر دیکھتا ہوگا۔۔۔ اور بیہوشی کی سرحدوں سے ہوش میں آنے کے مختصر درمیانی عرصے میں وہ کن کن باتوں کو یاد کرتا ہوگا۔۔۔ یقیناً وہ تمام باتیں اسے یاد آتی ہوں گی جو اس کی زندگی سے جڑی تھیں!

اپنی تحریروں میں تواتر کے ساتھ جنگل، خوشبو، بارش، ناریل، درخت اور چائے کا ذکر کرنے والا پاکستان کا درویش صفت، ایماندار اور ہردلعزیز مصنف پچھلے ایک ماہ سے بھی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ جناب عبدالحمید جو اے حمید کے نام سے جانے جاتے ہیں، لاہور کے ایک نجی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔۔ ایک ایسی جنگ جس میں زندگی کے غالب آجانے کا امکان روز بروز کم سے کم ہوتا چلا جارہا ہے۔ مجھ جیسے ان کے ان گنت چاہنے والوں کے یہ ایک اذیت ناک صورتحال ہے۔ یہ تو خدا سلامت رکھے جناب عطاء الحق قاسمی کو کہ جن کی تگ و دو کی وجہ سے اے حمید کے علاج کا تمام خرچہ حکومت پنجاب برداشت کررہی ہے ورنہ ان کے اہل خانہ میں اس کی سکت نہ تھی۔ اس ملک میں ہر کوئی ان جیسا خوش قسمت کہاں جس کو اس کڑے وقت میں کوئی عطاء الحق قاسمی نصیب ہوجائے۔۔۔ کتنے ہی ادیب و شاعر کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ گئے۔ شاعر و ادیب کیا، یہاں تو اساتذہ کا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ ۷ دسمبر ۲۰۰۳ کو ملیر، کراچی میں واقع ایک تاریخی درسگاہ میں علم کی روشنی پھیلانے

والے پروفیسر غازی خان جاکھرانی اور ان کی اہلیہ کی پندرہ روز پرانی لاشوں کا ملنا تو آج بھی کچھ لوگوں کو یاد ہوگا جو بھوک سے دم توڑ گئے تھے۔ عدالت میں دائر کیس کے تفصیلات اور اس میں موت لوگوں کے نام و دیگر تفصیل یہاں پڑھی جاسکتی ہے:

http://archives.dawn.com/2006/05/16/local4.htm

کل شام مجھے اے حمید کے بیٹے مسعود حمید اپنے والد کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی عطاء الحق قاسمی صاحب کی کوششوں کے بارے میں آگاہ کر چکے تھے۔۔۔ آج صبح جب مجھ سے رہا نہ گیا تو لاہور میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو فون کر ڈالا۔۔۔۔ وہ مجھے حمید صاحب کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں اور ان کے مثبت نتائج کے بارے میں بتاتے رہے۔ لیکن ہر آن پر اُمید باتیں کرنے والے عطاء صاحب، اے حمید کی صحتیابی کے بارے میں تذبذب کا شکار نظر آئے۔ جو شخص چند دن وینٹیلیٹر پر گزار لے، اس کی صحت کے بارے میں ڈاکٹر بھی زیادہ پر امید نہیں رہتے اور ادھر اے حمید تو پورے ایک ماہ سے وینٹیلیٹر (ventilator) پر ہیں۔۔۔۔ لیکن بقول عطاء صاحب، ہمیں خدا کی ذات سے امید نہیں چھوڑنی چاہیے!

مارچ ۲۰۰۸ کی ایک شام میں لاہور میں واقع اے حمید صاحب سے ملاقات کی غرض سے سمن آباد لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر گیا تھا۔ وہ ایک گھنٹہ پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، وہ کتابوں سے گھرے چھوٹے سے کمرے میں اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بے صبری سے اس شیفتگی کا ذکر کر رہا تھا جو ایک زمانے سے مجھے ان سے ان کی تحریروں کے تعلق سے ہے۔ وہ میری باتیں سن کر انکساری سے مسکرا رہے تھے۔ میں ان کو شہاب نامہ میں قدرت اللہ شہاب کی ان کے بارے میں رائے

یاد دلاتا ہوں کہ کس طرح شہاب صاحب جو اس زمانے میں پنجاب ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کے عہدے پر فائز تھے اور حمید صاحب کو پوور لومز کا پرمٹ دے چکے تھے (ان دنوں پاور لومز کا کاروبار انتہائی منفعت بخش کہلاتا تھا اور قدرت اللہ شہاب کے پاس دن بھر اسی سلسلے میں سفارشوں کا بیزار کن تانتا بندھا رہتا تھا) اور کچھ عرصے بعد حمید صاحب، جوان پرمٹس کو بآسانی بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے ایک بڑی رقم بنا سکتے تھے، شہاب صاحب کو وہ پرمٹس واپس کرنے آئے تھے۔

میں اس کاروبار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں ہے" ۔۔وہ قدرت اللہ شہاب سے کہہ رہے تھے

یہ شہاب صاحب کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔۔۔اور پھر انہوں نے قلم اٹھایا اور شہاب نامہ میں حمید صاحب کے لیے یہ جملہ لکھا:

اس کی دلنشیں تحریروں کی طرح اس صاحب طرز ادیب کا کردار بھی اتنا ہی صاف اور بے داغ تھا کہ اس نے اپنے پرمٹ کو بلیک مارکیٹ میں بیچنا بھی گوارا نہ کیا" ۔۔۔شہاب اس محکمے میں اپنی تقرری کے تمام عرصے کے احوال کے اختتام پر لکھتے ہیں: پنجاب کے ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے اے حمید، آٹا پیسنے کی چکی والا محمد دین، آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی کے ساتھ میری ملاقاتیں اس زمانے کی خوشگوار یادیں ہیں۔ باقی متروکہ صنعتوں کی الاٹمنٹوں کا سارا کام ایک متعفن دلدل کی ناگوار سڑانڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔"

اے حمید۔ پاک ٹی ہاؤس کے باہر

شہاب نامہ میں درج اس واقعے کے ذکر پر حمید صاحب ہنسنے لگے اور کہا:

"یار! جب کبھی میری بیوی مجھ پر ناراض ہوتی ہے تو میں اسے شہاب نامہ دکھا کر کہتا ہوں کہ دیکھو قدرت اللہ شہاب جیسے انسان نے میرا ذکر کتنے اچھے انداز میں کیا ہے"

پھر میں اے حمید کو ان کے لکھے ناول ڈربے کے اقتباسات سنانے لگتا ہوں جو میرا پسندیدہ ترین ناول ہے۔ میں ان سے اس ناول کے کرداروں کے بارے میں دریافت کرتا ہوں اور انہیں یہ بات بتاتا ہوں کہ کالج کے زمانے میں کس طرح ایک لائبریری سے ۱۹۶۰ کا شائع ہوا یہ ناول مجھے ملا تھا جسے میں نے منہ مانگی قیمت (تیرہ روپے) دے کر اس کے مالک سے خرید لیا تھا اور پھر ایک روز اس ناول کو میرے والد

مرحوم نے پڑھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کو محفوظ کرنے کی خاطر اس پر گرد پوش لگا دیا۔ حمید صاحب میرے ہاتھ سے اس ناول کو لے کر بغور دیکھتے ہیں، میری درخواست پر ناول پر اپنے آٹو گراف ثبت کرتے ہیں

اور اس کے تازہ نسخے کے حصول کے لیے مقبول اکیڈمی کے مالک کے نام مجھے ایک رقعہ لکھ دیتے ہیں۔
میں نے اس رقعے کو تبرک سمجھ کر حفاظت سے رکھا اور ایک جگہ محفوظ کر دیا، ملاحظہ ہو:

http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/5109237158/

اس ملاقات کی تصویر اور ایک مختصر سی ویڈیو (انٹرنیٹ پر موجود واحد ویڈیو ریکارڈ) بھی یہاں دیکھی جا سکتی ہے:

http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/4371908038/in/photostream/

حمید صاحب کو اپنی یادداشتیں لکھنے کی درخواست کے ساتھ ان سے ملاقات کی خوشگوار یادیں لے کر میں وہاں سے لوٹا تھا!

اے حمید (دائیں جانب) اور احمد راہی

اس دن کے بعد سے حمید صاحب سے مستقل فون پر رابطہ رہنے لگا اور گاہے گاہے کراچی سے ان کو لاہور کتابیں ارسال کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اپنی بیماری سے چند ماہ پیشتر انہوں نے مجھ سے ابن انشاء پر اپنی لکھی کتاب کی فرمائش کی جو لاہور میں نایاب ہے اور حمید صاحب کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ یاد رہے کہ اے حمید ابن انشاء کے گہرے دوست رہے ہیں اور ابن انشاء کے خطوط پر مبنی کتاب "خط انشاء جی کے" میں اے حمید کے کئی بے تکلفانہ خطوط موجود ہیں۔ ایسے ہی ایک خط میں (اقتباس) انشاء جی رقم طراز ہیں:

"ارے حمید، میری جان! تمہارے یادوں کے گلاب سب کے سب میں نے پڑھے ہیں بلکہ سونگھے ہیں اور پرانے دنوں کی یاد پر دل کو کچھ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔ تم ڈنڈی مار جاتے ہو۔ عشق و عاشقی اور لڑکیوں کے تذکرے میں بھی تم ڈنڈی بلکہ ڈنڈا مار جاتے ہو۔ لڑکیاں تمہاری بھولی بھالی صورت رومانٹک تحریر کے چکر میں آجاتی ہیں۔ خیر میاں ہم تو تمہارے عاشق ہیں۔ فی زمانہ اور کوئی ہمیں اپنے اوپر عاشق ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔"

حمید صاحب کی لکھی ایک کتاب "امرتسر کی یادیں" میں عرصہ پندرہ برس سے تلاش کر رہا تھا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ حمید صاحب کے پاس بھی اس کتاب کا ایک ہی نسخہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔۔ کچھ عرصہ پیشتر کراچی سے ایک شناسا لاہور جا رہے تھے، میں نے ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ حمید صاحب سے وہ نسخہ لے کر اس کی فوٹو کاپی بنوا کر لے آئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام سرانجام پایا اور

اے حمید۔ پچیس برس قبل کی ایک تصویر

میں نے حمید صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

حمید صاحب کا سن پیدائش ۱۹۲۸ ہے، اس حساب سے وہ ۸۳ برس کے ہوئے۔ امرتسر میں پیدا ہونے والے اے حمید نے ۱۹۴۸ میں اپنا پہلا افسانہ منزل منزل لکھا جسے راتوں رات مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہت جلد ان کے افسانے لاہور سے شائع ہونے والے معیاری جریدوں کی زینت بننے لگے۔ وہ ایک کثیر التحریر مصنف ہیں، انہوں نے کم و بیش ۲۰۰ ناولز لکھے جبکہ بچوں کے لیے ان کی لکھی مشہور زمانہ سیریز امبر ناگ اور ماریہ کے ۱۰۰ ناولز منظر عام پر آئے۔ ان کی چند دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں:

منزل منزل

لاہور کی یادیں

داستان گو

امریکانو

چاند چہرے

گلستان ادب کی سنہری یادیں

دیکھو شہر لاہور

جنوبی ہند کے جنگلوں میں

اردو شعر کی داستان

اردو نثر کی داستان

مرزا غالب لاہور میں

اے حمید نے ریڈیو پاکستان میں عرصہ دراز تک ملازمت کی، بعد ازاں وہ وائس آف امریکہ سے وابستہ ہو کر واشنگٹن چلے گئے جہاں سے واپسی پر انہوں نے وائس آف امریکہ کی دلچسپ یادوں کی قلم بند کیا جو پہلے کراچی کے ایک جریدے نیا رخ میں قسط وار شائع ہوئی اور بعد ازاں اسے کتابی صورت میں امریکانو کے عنوان سے سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا۔ انہوں نے ٹیلی وژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے، خاص کر بچوں کے لیے لکھا گیا سیریل عینک والا جن بہت مقبول ہوا۔ وہ پچھلے کئی برس سے لاہور کے روزنامے نوائے وقت میں اتوار کے روز کالم لکھ رہے تھے۔۔۔ ۲۰۰۳ میں ابو الحسن نغمی کی خودنوشت یہ لاہور ہے منظر عام پر آئی جس میں نغمی صاحب نے اے حمید کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح دسمبر ۲۰۱۰ میں لاہور

سے ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ رہے ناصر قریشی صاحب کی خودنوشت ادبیات نشریات شائع ہوئی جس میں قریشی صاحب نے حمید صاحب کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔

مارچ ۲۰۰۸۔ اپنی رہائش گاہ پر۔ راقم نے محفوظ کی

اے حمید ان لوگوں میں سے ہیں جن کی شخصیت کا مکمل عکس پڑھنے والے کو ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے اور یوں مزید معلومات کے حصول کے لیے کسی خارجی سہارے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ کڑکی کے زمانے میں بھی حمید صاحب اچھا لباس پہنتے تھے اور احباب کی محفل میں الگ ہی نظر آتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمیشہ بہترین لباس پہنو، بہترین خوشبو استعمال کرو اور بہترین لڑکی سے محبت کرو۔

ان کی تحریروں میں ایک عجب دلکشی ہے، پڑھنے والا کچھ دیر تمام غموں سے نجات پا کر گھنے جنگلوں، درختوں، پرندوں، خوشبوؤں کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ نکلنا نہیں چاہتا لیکن کیا کیجیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتاب ختم ہو جاتی ہے اور اسے دنیوی بکھیڑوں میں لوٹنا پڑتا ہے۔

وہ لاہور شہر کی روایت کے امین ہیں۔ لاہور کی محفلوں، کھانوں، ناشتوں، پہلوانوں، تکیوں، اکھاڑوں، لائبریریوں اور تھیٹر کمپنیوں کا جس انداز سے اے حمید نے اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے وہ کسی

اور کو کہاں نصیب۔۔۔۔اسی طرح امرتسر شہر کے ذکر میں بھی یہی موضوعات ان کی تحریر کا خاصہ رہے ہیں (دیکھیے: امرتسر کی یادیں۔ سن اشاعت: ۱۹۹۱)۔ ممتاز مفتی جب ہندوستان کا سفرنامہ لکھ رہے تو اے حمید کے ذکر کے بغیر آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ پاک ٹی ہاوس کی محفلوں کا تذکرہ جس طرح اے حمید نے کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آخری دنوں کا احوال ہر حساس پڑھنے والے کو افسردہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس افسوسناک احوال کی منظر کشی یا تو اے حمید نے کی ہے یا پھر معروف مزاح نگار محمد خالد اختر کے مضمون منٹو کے آخری دن سے اس کا پتہ ملتا ہے۔

اے حمید کی خاکہ نگاری کا ڈھنگ بھی دوسروں سے جدا نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب چاند چہرے میں انہوں نے فیض احمد فیض، سیف الدین سیف، پروفیسر وقار عظیم، اخلاق احمد دہلوی، ابن انشاء، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، عبدالمجید عدم، احمد راہی، ابراہیم جلیس، راجہ مہدی علی، چراغ حسن حسرت، مرزا سلطان بیگ وغیرہ پر خاکے لکھے ہیں اور ان خاکوں میں ایسے ایسے واقعت تحریر کیے ہیں جو کہیں اور پڑھنے میں نہیں آتے۔ اسی طرح ان کی کتاب " گلستان ادب کی سنہری یادیں " بھی حقیقتاً سنہری یادوں اور باتوں کا ایک ایسا مرقع ہے جو ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اے حمید اوائل عمری ہی میں گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے

اور انہوں نے یہ عرصہ بمبئی میں گزارا تھا۔ اسی طرح جنوب مشرقی ایشیاء کے بھی کئی ممالک بھی انھوں اچھی طرح دیکھ رکھے تھے۔ آگے چل کر اس آوارہ گردی کے تجربات ان کی تحریروں کو جلا بخشنے میں خوب کام آئے اور ان ممالک کے تجربات، رہن سہن، بول چال اور ثقافت کو انہوں نے اپنی تحریروں میں گاہے بگاہے استعمال کیا اور ان کی تحریروں کا یہی وصف ان کے قارئین کے دل میں گھر کر گیا!

اب دیکھئے کہ بھلا اس انداز تحریر کو کون پسند نہ کرے گا:

"میں کبھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے ٹولنٹن مارکیٹ کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس کی وجہ ٹولنٹن مارکیٹ کی وہ مخلوط ٹھنڈی خوشبو تھی جو وہاں فضا میں ہر طرف بسی ہوئی ہوتی تھی۔ میں جنوب مشرقی ایشیاء کے ملکوں سے نیا نیا جدا ہوا تھا۔ ان ملکوں کی بارشوں کی آواز اور استوائی پھولوں کی گرم خوشبوئیں میرے ساتھ سانس لیتی تھیں۔ جب میں ٹولنٹن مارکیٹ میں داخل ہوتا تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میں رنگون کی اسکاٹ مارکیٹ اور کولمبو کے ساحل سمندر پر بارش میں بھیگتے ناریل کے درختوں میں آگیا ہوں۔"

لاہور کی سڑکوں کا احوال بیان کرتے ہوئے انداز تحریر ملاحظہ ہو:

سردیوں کے موسم میں جب مطلع صاف ہوتا تھا تو ڈیوس روڈ سنہری دھوپ میں ایک ایسی روشن سڑک لگتی جو مستقبل کے حسین سبزہ زاروں کی طرف جا رہی ہو۔ رات کو یہ سڑک کسی گمنام جزیرے کا خواب انگیز راستہ معلوم ہوتا تھا۔ جب ساون کی جھڑیاں لگتی تھیں تو بارش میں اس پرسکون خالی سڑک پر ایک ایسی جنگلی عورت کا گمان ہوتا تھا سنسان جنگل میں اکیلی بارش میں نکل آئی ہو۔

جوں جوں لوگوں کے دل تنگ ہوتے گئے، ڈیوس روڈ کشادہ ہوتی گئی۔ درختوں پر کلہاڑے چلتے گئے۔ اور پھر وہ وقت آیا کہ اصل سڑک کی جگہ ایک ایسی سڑک نمودار ہوگئی جس کا اصل سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی یہ سڑک فطرت کی آغوش میں سانس لینے والی ایک آزاد جنگلی لڑکی تھی جو جنگل کی بارش میں بے فکری سے نہایا کرتی تھی اور آج یہ سڑک مجھے ایک ایسی بھکاری عورت کی طرح دکھائی دیتی ہے جس

کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، جس کے بالوں میں گرد جمی ہے اور جو خوفزدہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" (یادوں کے گلاب)

اپنے مخصوص انداز میں ماضی کے کسی دلچسپ واقعے کا ذکر کرنا تو اے حمید سے سیکھئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

غفور بٹ ہفت روزہ اسکرین لائٹ کا مالک اور ایڈیٹر تھا۔ دوسری منزل پر اس کا دفتر تھا جہاں ہم شاعر ادیب تقریباً روزانہ شام کو مل بیٹھتے تھے۔ ہم سب فاقہ مست ادیب تھے۔ کبھی کبھی اشفاق احمد بھی میرے اصرار پر یہاں آجاتا تھا۔ مبارک سینما کے مالک ملک مبارک صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غفور بٹ سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتا ہوا آیا اور اپنے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا:
تجمل! ملک مبارک کی وفات پر معذرت کا چوکھٹا لگانا نہ بھولنا
تجمل نے جان بوجھ کر کہا" معذرت کا چوکھٹا ؟
غفور بٹ بولا:" ہاں یار! وہی کہ ملک مبارک کے انتقال پر ادارہ اسکرین لائٹ ان کے لواحقین سے معذرت خواہ ہے۔ (داستان گو)

اے حمید ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ریگل سنیما میں فلم مادام بواری لگی۔ میں نے اور احمد راہی نے فلم دیکھنے اور اس کے بعد شیزان میں بیٹھ کر چائے اور کریون اے کے سگرٹ پینے کا پروگرام بنایا۔ اتفاق سے اس روز ہماری جیبیں بالکل خالی تھیں۔ ہم فوراً ادب لطیف کے دفتر پہنچے۔ ان دنوں ادب لطیف کو میرزا ادیب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔

ہم نے جاتے ہی مرزا ادیب سے کہا:

میرزا صاحب! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال کے بہترین ادب کا انتخاب ہم کریں گے"

میرزا ادیب بڑے شریف آدمی ہیں، بہت خوش ہوئے، بولے:

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ احمد راہی صاحب حصہ نظم مرتب کرلیں گے اور آپ افسانوی ادب کا انتخاب کرلیں۔"

ہم نے کہا:" تو ایسا کریں کہ ہمیں پچھلے سال کے جس قدر انڈیا اور پاکستان کے ادبی رسالے دفتر میں موجود ہیں، دے دیجیے تاکہ ہم انہیں پڑھنا شروع کردیں"

میرزا صاحب خوش ہو کر بولے:" ضرور۔۔ضرور"

اس کے آدھے گھنٹے بعد جب ہم ادب لطیف کے دفتر سے باہر نکلے تو ہم نے ادبی رسالوں کے دو بھاری بھرکم پلندے اٹھا رکھے تھے۔ آپ یقین کریں کہ ہم وہاں سے نکل کر سیدھا موری دروازے کے باہر گندے نالے کے پاس ردی خریدنے والے ایک دکاندار کے پاس گئے اور سارے ادبی رسالے سات یا آٹھ روپوں میں فروخت کردئے۔ اس شام میں نے اور احمد راہی نے بڑی عیاشی کی۔ یعنی مادام بواری فلم بھی دیکھی اور شیزان میں بیٹھ کر کیک پیسٹری بھی اڑاتے اور کریون اے کے سگرٹ بھی پیتے رہے۔

اس کے بعد تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز میرزا ادیب ہم سے پوچھ لیتے:

بھئی انتخاب کا مسودہ کہاں ہے"

ہم ہمیشہ یہی جواب دیتے:" بس دو ایک دن میں تیار ہو جائے گا۔ ہم دراصل بڑی ذمے داری سے کام کر رہے ہیں۔" (یادوں کے گلاب)

ہمارے ممدوح کو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اداس کرنے کا فن بھی آتا ہے۔ سعادت حسن منٹو

سے اپنی آخری ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میو اسپتال کی دوسری منزل کے میڈیکل وارڈ میں دروازے کے ساتھ ہی ان کا بستر لگا تھا۔ منٹو صاحب بستر پر نیم دراز تھے اور ان کی بڑی ہمشیرہ ان کو چمچ کے ساتھ سوپ پلانے کو کوشش کر رہی تھیں۔ میں خاموشی سے بستر کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گیا۔ منٹو صاحب بے حد نحیف ہو گئے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ منٹو صاحب نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا:

اب کیسی طبیعت ہے منٹو صاحب ؟

اس عظیم افسانہ نگار کے کمزور چہرے پر ایک خفیف سا اداس تبسم ابھرا اور صرف اتنا کہا:

دیکھ لو خواجہ!

اور اس کے کچھ ہی روز بعد سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ (یادوں کے گلاب)

اے حمید لکھتے ہیں کہ نریش کمار شاد جب دہلی سے لاہور آیا تو سعادت حسن منٹو کی قبر پر جا کر بہت رویا اور پھر کہا: "خدا مسلمانوں کو خوش رکھے۔ ہمارے پیاروں کا نشان (قبر) تو بنا دیتے ہیں۔"

اپنی ایک تحریر میں اے حمید نے یہ بات لکھی تھی کہ میں اپنے فلاں بیمار دوست کو بستر مرگ پر دیکھنے نہیں گیا اس لیے کہ میں جن سے محبت کرتا ہوں ان کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔

حمید صاحب! ہم آپ کو اس حالت میں دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں ؟

ے حمید

لام طلبی

بٹے

چاہے

ڈ

دھو

جالنے

اے حمید اور اسعد سلیم
(پاک ٹی ہاؤس کے باہر)

اے حمید کی دوسری برسی

راشد اشرف۔ ۷ مئی ۲۰۱۳۔ کراچی

ناول آپ نے پڑھا۔ یہ تحریر اس مصنف کی ہے جس نے تمام عمر سوائے لکھنے کے، اور کوئی کام نہ کیا۔ جناب اے حمید نے ریڈیو کی ملازمت تو 'روٹی تو کما کھائے مچھندر' کے مصداق اختیار کی تھی۔ ان کی اصل دلچسپی تو صرف اور صرف لکھنے ہی میں رہی تھی۔ لاکھوں معصوم ذہنوں کی تربیت کرنے والے اس درویش صفت مصنف کی دوسری برسی بھی ۲۹ اپریل ۲۰۱۳ کو خاموشی سے گزر گئی، گویا برسی نہ ہوئی، بے حسی ہو گئی۔ حمید صاحب کے پرستار کسی ٹی وی چینل پر، کسی اخبار میں ایک کالمی خبر کے منتظر ہی رہ گئے۔ شاید ان میں سے کئی ایسے رہے ہوں جنہوں نے اس شخص کی تحریروں کو پڑھ کر ہی زندگی میں کوئی مقام پایا ہو، چار لوگوں میں بات کرنے کا سلیقہ اپنایا ہو۔

شہرت بخاری نے اپنی خودنوشت کھوئے ہوؤں کی جستجو میں لکھا تھا کہ یہ موت مجھے کہیں مجسم حالت میں مل جائے تو میں اس کا منہ نوچ لوں، کلیجہ چبا لوں۔ یہ ڈائن بار بار ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر دیتی ہے۔

موت لے جائے گی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مر جائیں گے

لیکن صاحبو! موت تو برحق ہے۔۔۔ اپنا وار کرتی رہے گی۔ علم تصوف میں بتایا جاتا ہے کہ زمانے میں ہمہ وقت ''حشر نشر'' کا سلسلہ جاری ہے۔۔۔۔۔ ایک سمت سے ہر لحظہ مخلوقات کو دنیا میں نشر کیا (پھیلایا)

جارہا ہے اور دوسری جانب انہیں حشر (جمع ہونے/سمیٹے جانے) کا سامنا ہے۔ یوں زمانے کی گود میں ازل سے ترتیب و ابتری حرکت میں ہیں، اور روئے زمین پر اسی طور ابد تک محبت اور موت کی نبرد آزمائی جاری رہے گی۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے (ترجمہ): " یہی ہے ازل سے تیرے رب کا طریقہ اور تو ابد تک اس میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔

فیض لدھیانوی (وفات: ۶ جنوری ۱۹۹۵ لاہور) کا کیا خوب اور منفرد شعر ہے:

میں ہوں ناواقف مگر ہر سال آتی ہے ضرور
فیض جس کو کل کہیں گے میری تاریخ وفات

اے حمید صاحب نے اپنے ایک یادگار ناول ڈربے (مطبوعہ ۱۹۶۰) میں ایک گورکن کی زبانی موت کے فلسفے پر سادہ و دلنشین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
اس گورکن کی ہر نصیحت کسی نہ کسی مقولے پر ختم ہوا کرتی۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہ تھا مگر اس کی باتیں دور دور کی خبر لایا کرتیں۔ موت کے فلسفے پر وہ اس قدر آسانی سے روشنی ڈالا کرتا کہ ہر لفظ جگنو کی مانند چمک چمک کر اپنا مفہوم بتا دیتا تھا:

"لوگ موت سے خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ سچ پوچھو تو زندگی کے لیے یہ بڑی ضروری شے ہے۔ ہمیں پھول کیوں اچھے لگتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کھلتے ہیں۔ اور پھر مرنے سے ہمیں نقصان ہی کیا ہوتا ہے۔ یہی نا کہ ہم اس دنیا میں باقی نہیں رہتے، تو اس میں حرج کی بات کیا ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو لوگ پہاڑوں سے کودتے، پتھر باندھ کر دریاؤں میں چھلانگ لگاتے،

انجن تلے سر دیتے۔ پھر سوچو زندگی کتنی گھناؤنی ہوتی۔ بھئی میں تو ہنسی خوشی جان دوں گا۔ موت کا استقبال تہوار کی صورت ہونا چاہیے۔ برخوردار یہ سب دکھوں کا آخری علاج ہے۔"

کہتے ہیں اگلے وقتوں میں روح قبض کرنے پر مامور فرشتے کو آتا دیکھ کر لوگ دشنام طرازی کیا کرتے تھے۔ طے پایا کہ اس سے بچنے کے لیے موت کے مختلف ذرائع مقرر کر دیے جائیں۔ لہذا ہم نے دیکھا کہ اے حمید صاحب نمونیہ کے شدید حملے کا شکار ہوئے اور تقریباً دو ماہ تک اسپتال میں داخل رہنے کے بعد ۲۹ اپریل ۲۰۱۱ کی رات دو بجے انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا علیہ راجعون

وہ تمام عمر سکرات کے اس عالم سے محفوظ رہے جس سے خاص کر ہمارے معاشرے کا کم و بیش ہر ادیب و شاعر گزرتا ہے یعنی زندگی میں قدر نہ ہونے کا احساس۔ اے حمید صاحب کو ان کے چاہنے والوں سے بے اندازہ محبت ملی!

ان کی اہلیہ اسپتال میں پچھلے دو ماہ سے مقیم تھیں جہاں پنجاب حکومت نے ان کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا تھا۔ ان کو اسپتال انتظامیہ نے رات دو بجے اطلاع دی کہ حمید صاحب کی حالت نازک ہے۔ جب وہ کمرے میں پہنچیں تو حمید صاحب جا چکے تھے!۔۔۔۔ اچانک ان کے جسم میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا اور دو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھ سے گفتگو کرتے وقت حمید صاحب کی اہلیہ کا لہجہ پرسکون تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں:

حمید صاحب کے چہرے پر بڑا سکون تھا اور اس کئی لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ انتقال کے بعد ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

میں نے دریافت کیا کہ اس وقت ان کا جسدِ خاکی کہاں ہے تو ان کی اہلیہ نے بتایا کہ ابھی ابھی ان کو اسی کمرے میں لایا گیا ہے جہاں میں (راقم) ۲۰۰۸ میں ان سے ملاقات کی غرض سے دیر گئے تک بیٹھا رہا تھا۔

چشمِ تصور سے میں نے وہ منظر دیکھا اور بوجھل دل کے ساتھ روایتی تعزیتی جملے کا سہارا لیا:
اللہ آپ کو وقت کے ساتھ صبر دے!
بیٹا! وقت تو میرے لیے رک گیا ہے، ختم ہو گیا ہے، تو یہ صبر کیسے آئے گا؟
حمید صاحب کی اہلیہ کے اس جواب سے میری آواز میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

اے حمید صاحب اپنی خودنوشت تحریر کر رہے تھے اور میں اکثر ان سے اس بارے میں فون پر دریافت کر لیا کرتا تھا۔
بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی خودنوشت کا نام ''چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں'' تجویز کیا تھا۔

فارغ بخاری کی خودنوشت ''مسافتیں'' کا آخری باب ان کے بیٹے قمر عباس نے تحریر کیا تھا جو خود بھی ایک مصنف تھے اور بعد ازاں ۷ مئی ۲۰۰۷ کے روز پشاور میں قتل کر دئے گئے تھے۔

حمید صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی عنایتوں کے سائے تلے ہمیشہ رکھے۔۔۔ لیکن آپ کی خودنوشت کا آخری باب کون تحریر کرے گا؟